گوپالپور
ادراک

@Stranger

مدیر اعزازی
ڈاکٹر سید حسن عباس

مشورت ادراک و ہشیاری دہد عقلہا را عقلہا یاری دہد (مولانا روم)

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء

اِدراک گوپال پور

۴

زر سالانہ	۱۰۰ روپئے
لائبریریوں سے	۲۰۰ روپے
اس شمارے کی قیمت	۵۰ روپے
بیرون ممالک فی شمارہ	۵ ڈالر
سالانہ	۱۲ ڈالر

ترسیل زر کا پتا

ڈاکٹر نذر عباس
گوپال پور، باقر گنج، سیوان
بہار - ۸۴۱۲۸۶ (ھند)
فون نمبر۔ ۰۶۱۵۴-۲۷۲۳۳۱

زیر اہتمام: مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان۔ بہار (ھند)

کمپوزنگ: کمپیوٹر گیلکسی، بھیتان نو پر مارکیٹ کے سامنے، بڑا امند ررود، پٹنہ۔۶، موبائل نمبر 0612-3337368

پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر سید حسن عباس نے [illegible] چھپوا کر دفتر ادراک گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان (بہار) سے شائع کیا۔

فہرست

پیش نامہ

ادراک 'کتاب چہارم' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سنہ دو ہزار چار میں یہ ہماری پہلی پیشکش ہے جبکہ پچھلے سلسلے کے اعتبار سے یہ چوتھی کڑی ہے۔ 'ادارہ ادراک' اپنے تمام قارئین اور معاونین سے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔

چوں کہ ادراک کا مزاج علمی اور تحقیقی ہے اس لیے اسی موضوع پر کچھ کہنا چاہوں گا:

''شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات''۔ میرے مخاطب وہی ہیں جن کو تحقیق سے سروکار ہے خاص کر ہماری نسل کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرز۔

یہ اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی زبان کے ادبی سرمایے کو غنی بنانے کے لیے تحقیق کا عمل ناگزیر ہے۔ جب تک نئی چیزیں سامنے نہیں آئیں گی اس وقت تک تنقید کا عمل بھی رُکا ہوا سمجھا جائے گا۔ تحقیق کے لغوی معنی- 'اصلیت معلوم کرنا'، 'دریافت کرنا' اور 'جانچ پڑتال' وغیرہ ہیں۔ اس کی جمع 'تحقیقات' ہے۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی کیونکہ یہ وہ پیہم اور مسلسل عمل ہے جس کے نتائج سابقہ تحقیقات میں کسی نہ کسی جہت سے اضافے کا باعث ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کی سمت صحیح ہو۔ تحقیق کی قسمیں بھی ہوتی ہیں لیکن اس گفتگو میں 'ادبی تحقیق' ہی مدنظر ہے۔

یہ وہ عمل ہے جو محنت، لگن اور دلچسپی کا متقاضی ہے۔ وسعت مطالعہ کے ساتھ اس کے لیے جہاں اور چیزیں ضروری ہیں وہاں ماہرین نے اعلا ظرف اور اعلا اخلاق کی ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ دوسروں کی تحقیقات کے نتائج کا حوالہ دے کر اپنی بات کہنا یا اگر کسی نے کسی غلطی یا فروگزاشت کی طرف متوجہ کیا ہو اور وہ درست بھی ہو تو اسے قبول کر لینا اعلا ظرفی اور اعلا اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہمارے پیش رووں نے اور ہم عصروں نے بھی اردو فارسی میں تحقیق کا معیار اونچا اور بہتر کرنے کے لیے زبردست محنت اور سچی لگن کا سہارا لیا جبکہ ہمارے پیش رووں اور بزرگوں کو وہ سہولیات حاصل نہیں تھیں جو آج ہمیں حاصل ہیں۔ پھر بھی ماضی کے محققین کے تحقیقی نتائج آج بھی صائب اور معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، فصیح الدین بلخی، پروفیسر سید حسن عسکری، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر نذیر احمد، شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، کالیداس گپتا رضا، رشید حسن خاں، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ضیاء احمد بدایونی، ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر نیر مسعود، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، پروفیسر نور،

الحسن ہاشمی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر محمد علی اثر، ڈاکٹر کاظم علی خاں وغیرہ یہ چند نام بلا ترتیب اور بغیر کاوش کے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے اور ہیں جنھوں نے تحقیق کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں شب و روز تصور سے زیادہ محنت کی۔ ادب کے اِن خدمت گاروں نے اپنا خون جگر صَرف کر کے جو علمی خدمات انجام دی ہیں آج ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھتے۔ لوگوں میں تحقیق کا ذوق کم پایا جاتا ہے۔ جن میں یہ ذوق ہے ان کی تحقیقات کو شائع کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر خوبیٔ قسمت سے کوئی شائع کردے تو خریدار نہیں۔ اوپر سے ''گورکن'' اور ''گڑے مُردے اُکھاڑنے'' کی پھبتی الگ۔ یہ وہ مسائل ہیں جن سے محقق کو آج ہی نہیں ہر زمانے میں روبرو ہونا پڑا ہے۔ لیکن انھیں اِن باتوں سے کوئی لینا دینا نہ تھا اور وہ ہر چیز سے بے پروا اپنے کاموں میں لگے رہے۔

تحقیق میں فیلڈ ورک کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اچھی اور معیاری تحقیق کے لیے وسعت مطالعہ، جس میں کلاسیکی اور جدید شعر و ادب اور علوم و فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی شامل ہے، کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں سے واقفیت، تدوین کے مسائل کی سمجھ بوجھ، قدیم متون جن میں مخطوطات شامل ہیں، کی قرأت، نقل نویسی وغیرہ کی صلاحیت — وہ ضروری امور ہیں جن پر ہمیں توجہ دینی چاہیے۔

اردو میں اب بھی مخطوطات و مطبوعات کی فہرستیں اور رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کے اشاریے پورے طور پر شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ اگر کچھ ہوئے ہیں تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اگر یہ فہرستیں اور اشاریے باضابطگی سے شائع ہوتے رہیں تو ریسرچ اسکالروں کو ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے بڑے اداروں کو آگے آنا چاہیے جو اردو، فارسی اور عربی سے وابستہ ہیں۔ مختلف ریاستوں کی اردو اکاڈمیاں اور قومی کونسل نیز بڑے کتابخانے آپسی تعاون سے یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔

جامعات میں ہونے والے تحقیقی کاموں کو اب تک کسی نے تشفی بخش نہیں کہا ہے۔ اور یہ تشفی بخش ہو بھی نہیں سکتے۔ البتہ بعض محنتی ریسرچ اسکالروں نے قابل تعریف کام بھی ضرور کیے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر مختلف جامعات میں ہونے والے تحقیقی کاموں کے سلسلے میں بھی یہ عرض کرنا ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کے شعبوں کی طرف سے باضابطہ ایک ایسا بلیٹن شائع ہونا چاہیے جن کے ذریعے وہاں ہونے والے کاموں سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس کے فقدان کے باعث ہی تکراری موضوعات کے رجسٹریشن ہو رہے ہیں۔ ایک موضوع پر بہ یک وقت کئی دانشگاہوں میں کام ہو سکتا ہے مگر 'حیات اور کارنامے' کی حد تک ایک ہی موضوع پر کئی کام کیسے ہو سکتے ہیں، یہ قابل غور بات ہے۔

اردو بک ریویو (دہلی) نے رسائل کے مضامین اور مختلف جامعات میں ہونے والے کاموں کی فہرست شائع کرنے کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے جس کا مطالعہ اسکالروں اور اساتذہ دونوں ہی کے لیے بے حد مفید ہے۔

عہد حاضر کے نوجوان محققین میں کئی اچھے اور محنتی لوگ تحقیق کی سنگلاخ وادی میں اپنی ہمت اور حوصلے کا

خوب خوب مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کی ہر حال میں تشویق کی جانی چاہئے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے تحقیق کے عمل کو محنت اور اخلاق سے جوڑ کر یہ نتیجہ برآمد کیا کہ :

''کسی ملک کے باشندوں کا معیار اخلاق پست ہو اور وہ کام سے جی چراتے ہوں تو وہاں بالعموم تحقیق کا درجہ پست ہوگا''۔

اور مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۶ء میں جو بات کہی تھی وہ آج سو سال گزرنے پر بھی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانے میں تمام علوم وفنون کو نہایت ترقی دی تھی اور ہر فن میں اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلم بند کئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات وتصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد اور جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی''۔ (مقالات شبلی ۵۲/۸)

اس موضوع پر گفتگو کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

○

'ادراک کی کتاب چہارم' میں مشاہیر کے خطوط، تاریخ ہند، شخصیت شناسی، مخطوطہ اور کتاب شناسی اور اردو اور فارسی ادبیات سے متعلق کئی مفید مضامین شامل اشاعت ہیں۔ کئی مقالے مستند اور معتبر قلم کاروں کے ہیں تو کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جن کے لکھنے والے نوجوان ہیں۔ ہر مقالے میں آپ کسی نہ کسی نہج سے کام کی باتیں ضرور پائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ 'ادراک' نے علمی اور تحقیقی مضامین کی پیش کش میں اس کتاب چہارم کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اسے بھی پسندیدگی کی نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس میں 'بازیافت' کے تحت داغ دہلوی کے شاگرد اور دبستان عظیم آباد کے شاعر ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی حیات اور شاعری پر ابوالخیر رحمانی کا ایک مختصر سا رسالہ بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح مکتوبات میں بزرگ محقق قاضی عبدالودود کے پانچ خطوط قیوم خضر (مدیر اشارہ پٹنہ) کے نام شامل ہیں جو جناب اظہار خضر صاحب نے عنایت کئے ہیں۔ ادارہ ان کا بے حد ممنون ہے۔ 'منظومات' میں علامہ جمیل مظہری مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ شامل اشاعت ہے جو پروفیسر ثریا جمال مظہری کی عنایت سے دستیاب ہوا ہے۔ ادارہ ان کا بھی احسان مند ہے۔ ''یادرفتگاں'' کے تحت کوثر سیوانی مرحوم پر احمد جمال پاشا کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ڈاکٹر ظفر کمالی کے تعاون سے شامل کی جا رہی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا مفصل مقالہ بھی اس شمارے کی زینت ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ دریافت کے عنوان سے مرزا دبیر اور اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جو ہمارے بزرگ کرم فرما جناب عابد امام زیدی نے مرحمت فرمائے ہیں۔ ادارے کے ساتھ ان تمام محترم حضرات کے عملی اور مخلصانہ تعاون کے لئے ممنون ہوں۔ باقی چیزیں حسب سابق ہیں۔

سید حسن عباس

قاضی عبدالودود کے خطوط قیوم خضر کے نام

(۱)

بھنور پوکھر، پٹنہ۔۴

۳۰/اگست ۱۹۵۰ء

شفیق مکرم !

آپ کا خط ملا۔ شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری ہدایت کے مطابق مصرع کی تصحیح کردی۔ آپ سے جو وعدہ میں نے کیا ہے وہ وفا ہوگا، اطمینان رکھیں۔ اس بار تو اقیش (۱) صاحب کو زیادہ زحمت نہ ہوگی، مگر اس کے بعد زحمت کچھ بڑھ جائے گی۔ آپ کے تیسرے شمارے کے لئے دو چیزیں آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ مثنوی ہولی (۲) از جعفر خاں راغب مقیم عظیم آباد اور غیر مطبوعہ کلام راسخ (۳)۔ دونوں ملا کر زیادہ سے زیادہ آٹھ صفحے لیں گے۔ ہاں یہ یاد رہے کہ فن کار، Artist کا اردو مرادف ہے، ہر مضمون نگار فن کار نہیں ہوسکتا۔ کم از کم میں تو ہرگز فن کار ہونے کا مدّعی نہیں۔ اس لئے براہ کرم میرا نام فن کاروں کی فہرست میں نہ رہے۔ اگر آپ اس لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھیں جس پر یہ اعتراض وارد نہ ہوسکتا ہو تو مضائقہ نہیں۔ ایک مضمون ''میزان العلوم'' (۴) کے نام سے شاہ جعفر حسین صاحب نے لکھا تھا اور وہ اس وقت تک نہ چھپ سکا تھا۔ اس میں منطق کی ایک کتاب سے بحث ہے جو زمانہ ہوا اس فیملی کے ایک شخص نے اردو میں لکھی تھی اور غالباً اس سے پہلے اس علم پر کوئی مستقل کتاب اردو میں تصنیف نہیں ہوئی۔

آپ چاہیں تو یہ مضمون میں آپ کو اشاعت کے لئے دے سکتا ہوں۔ آپ پٹنہ آرہے ہوں تو مثنوی وغیرہ ڈاک سے نہ بھیجوں اور آنے میں دیر ہو اور آپ کو جلدی ہو تو ابھی بھیج دوں۔

قاضی عبدالودود

حواشی: ــــــــــــــــ

۱۔ ان کا تعلق حکومت بہار کی سول سروس سے تھا۔ بعد میں حکومت ہند کی سول سروس (I.A.S) کے کیڈر میں ترقی پاکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ پٹنہ سائنس کالج کے نزدیک لال باغ کے موڑ پر ڈاکٹر تمو صاحب ہومیو پیتھ کا مطب آج بھی ہے۔ یہاں اقیش صاحب، قیوم قادر صاحب (استاد، سماجیات، اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی) اور دیگر عمائدین شہر کے ساتھ مکتوب الیہ کا اٹھنا بیٹھنا ہوا کرتا تھا۔ محمد اقیش صاحب کا ایک مضمون زیر عنوان ''غالب کی گرفتاری'' نومبر۔دسمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس خط کا جواب ا/ستمبر ۱۹۵۰ء کو دیا گیا۔

۲۔ یہ مثنوی قاضی صاحب کے نوٹ کے ساتھ ماہنامہ ''اشارہ'' کے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

۳۔ راسخ کی یہ غیر مطبوعہ مثنوی ''اشارہ'' کے ستمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

۴۔ پتا نہیں یہ مضمون قاضی صاحب نے بھیجا یا نہیں۔ ''اشارہ'' میں اس کی اشاعت کا سراغ نہیں لگتا۔ تحقیق طلب ہے۔

(۲)

بھنور پوکھر، پٹنہ۔۴

۴ر اکتوبر ۵۰ء

شفیق مکرم

طنز مونث ہے۔ صاحب نور اللغات نے جانؔ صاحب کا شعر سند میں پیش کیا ہے۔ جلیل مانک پوری نے جو ایک کتاب تذکیر و تانیث پر لکھی ہے اس میں بھی مونث ہے۔ شعرا کے یہاں یہ لفظ اس طرح بہت کم نظم ہوا ہے کہ اس کی جنس کا پتا چل سکے۔

''دستور الفصاحت (۱)'' (۱۴ صفحہ) جاتا ہے۔ ص ۴ کا حاشیہ ص ۴ پر بھی ہے اور ص 4a اور ص 4b پر بھی۔ ص 4b، ص 4a کی پشت پر ہے۔

ایک مضمون آپ کے لئے اور تیار ہو رہا ہے۔ ''نادر خطوط غالب''۔ میں نے ''معاصر'' میں اس نام کی کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں رسا مرحوم (۲) نے ''ندیم'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جواب الجواب جو میں نے لکھا تھا، حسن امام صاحب نے مدیر (۳) حال کو سپرد کر دیا تھا۔ مگر انھوں نے اب تک اسے شائع نہیں کیا۔ اب کے جو مضمون میں نے لکھا ہے، میرا تبصرہ اور رسا مرحوم کے مضمون کے مطالب پر بھی حاوی ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ معلوم ہو جائے گا کہ کیا اعتراض ہوا تھا، رسا مرحوم نے کیا جواب دیا تھا۔ اور جواب الجواب کیا ہے۔ دو چار دن میں مکمل ہو جائے گا۔ (۴)

آپ پٹنہ آئیں تو میرا مسودہ جواب آپ کے کسی کام کا نہیں، ساتھ لیتے آئیں (راسخؔ اور راغبؔ)۔

(یہ خط بھی جو ۴ر اکتوبر کو لکھا گیا تھا، بھیج دیا جاتا ہے)

قاضی عبدالودود

حواشی:

۱۔ یہ مضمون نومبر - دسمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

۲۔ پروفیسر رسا ہمدانی۔ مشہور و معروف شاعر اور ادیب ماہنامہ ''اشارہ'' میں ان کی نظمیں اور غزلیں اکثر شائع ہوتی رہی ہیں۔ گیا سے تعلق تھا اور مکتوب الیہ کے بزرگ معاصرین میں سے تھے۔ قوم خضر نے اپنی خود نوشت ''محاسب'' میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۳۔ ریاست علی ندوی۔

۴۔ قاضی صاحب نے غالبؔ کے حوالے سے جس مضمون کا تذکرہ کیا ہے وہ ''اشارہ'' کے اجرا کے پہلے دور (اگست ۱۹۵۰ء تا دسمبر ۱۹۵۰ء) کے کسی شمارے میں شائع نہیں ہوا۔ کیوں کہ یہ خط رسالہ مذکورہ کی اشاعت کے پہلے دور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ رسالہ گیا سے نکلتا تھا۔ غالبؔ پر قاضی صاحب کے دو مضامین ''اشارہ'' میں شائع ہوئے (۱) ''جہان غالب'' (جولائی ۱۹۶۳ء) اور (۲) ''اسد اور غالب'' (اگست ۱۹۶۳ء)

نوٹ - اس خط کا جواب ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو دیا گیا۔

(۳)

بھنور پوکھر، پٹنہ۔۴
۱۱/ اکتوبر ۵۰ء

شفیق مکرم

آپ کا کارڈ تھوڑی دیر ہوئی ملا۔ اس سے دو تین دن پہلے جو کارڈ آپ نے بھیجا تھا، وہ اب تک نہیں پہنچا۔ مضمون بہت دن ہوئے تیار ہو گیا تھا، لیکن میں نے روانگی میں ذرا کاہلی سے کام لیا۔

آپ کی یہ بات بھی یاد تھی کہ اوائل اکتوبر میں آ جائے تو نقصان نہیں۔ ۴/ اکتوبر کو میں نے پیکٹ بنا لیا تھا اور ۵/ کو ڈاک گھر بھجوانے والا تھا کہ اقیش صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ ۸/ اکتوبر کو پٹنہ آنے والے ہیں۔ یہ سن کر میں نے نہ پیکٹ روانہ کیا اور نہ وہ خط جو لکھا ہوا رکھا تھا۔ پیکٹ آپ کا کارڈ ملتے ہی ڈاک گھر بھیج چکا ہوں۔ خط دوسرا لکھ رہا ہوں۔

عشق علی شاہ (۱) کا حال میں نے راغبؔ کی مثنوی کے ساتھ نہ لکھا۔ چند سطریں ان سے متعلق بھیجوں گا۔ نومبر کے شمارے میں کسی جگہ پر شائع کر دیں۔ کہیں اور نہیں، تو ایڈیٹوریل ہی میں جگہ نکل جائے گی۔ یہ لکھ دیجئے گا کہ یہ سطریں بعد کو وصول ہوئیں۔

طنز مونث ہے۔ نور اللغات میں جانؔ صاحب کا شعر سند میں پیش کیا ہے۔ جلیل مانک پوری نے بھی مونث لکھا ہے۔ شعرا کے یہاں یہ لفظ اس طرح زیادہ نہیں بندھا کہ اس کی جنس کا پتا چلے۔

آپ کے پٹنہ نہ آنے کا کیا سبب ہوا ؟

مخلص
قاضی عبدالودود

حواشی: ———

۱۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں ''دستور الفصاحت'' پر لکھے گئے مضمون کے اختتام پر عشق علی شاہ عظیم آبادی پر قاضی صاحب کا ایک مختصر سا نوٹ شائع ہوا تھا۔

نوٹ :- اس خط کا جواب بھی ۲۰/ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو ہی دیا گیا۔

(۴)

بھنور پوکھر، پٹنہ۔۴
۳۰/ اکتوبر ۱۹۵۰ء

شفیق مکرم !

آپ کا خط اور دوسری مرسلہ چیزیں ملیں۔ شکریہ! میں نے جو مسودہ منگوایا ہے، وہ واپس کر دوں گا۔ مطمئن رہیں۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ اغلاط طباعت ہیں یا نہیں۔

کاپی آئی تو اس کی تصحیح جلد ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ دسمبر کے شمارے کے لئے ایک مضمون بھیج دوں گا۔ اس کا عنوان ہے ''اردو کا ایک پرانا ناول۔ نقش طاؤس (۱)''۔ یہ ناول پٹنہ میں لکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت کے

کچھ کم ستر برس گزرے ہیں۔

ایک افسانہ شرف عالم آرزو جلیل مرحوم (۲) کا ترجمہ کیا ہوا رکھا ہے۔ اب تک چھپا نہیں ہے۔ اگر مل گیا تو یہ بھی بھیج دوں گا۔

حمیدہ سلطان صاحبہ (۳) نے مضمون نہیں، افسانہ لکھا ہے۔ اور اسے حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس سے غالب کی کچھ بڑائی بھی ثابت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اُن کا مقصد یہی ثابت کرنا ہے۔ اور چیزیں ابھی میں نے پڑھی نہیں ہیں۔ ایک غیر مطبوعہ خطی مضمون شاہ جعفر حسین (۴) صاحب خلف نواب شاہ واجد حسین صاحب کا بھی ہے، ملا تو بھیج دوں گا۔

حواشی:

۱ اس عنوان سے قاضی صاحب کا کوئی مضمون "اشارہ" میں شائع نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ کسی وجہ سے نہ بھیج پائے ہوں۔

۲ چونکہ ماہنامہ "اشارہ" کا اشاریہ اب تک تیار نہ ہو سکا اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آرزو جلیل مرحوم کا ترجمہ شدہ افسانہ کب شائع ہوا۔ یہ امر تحقیق طلب ہے۔

۳ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ رسالہ میں شائع ہونے والی بعض چیزوں پر قاضی صاحب کی رائے لیا کرتا تھا۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کی جس تحریر کا تذکرہ ہے اس کا تعلق بھی اس ضمن میں ہے۔ مصنفہ کا ایک مضمون زیر عنوان "غالب کا ایک شعر"، "اشارہ" کے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شامل اشاعت ہے۔

۴ رئیس اعظم خسرو پور، پٹنہ۔ ان کے دوسرے بھائی شاہ اصغر حسین ایڈووکیٹ، پٹنہ ہائی کورٹ، حال مقیم، بینک روڈ، پٹنہ ہیں۔ مذکورہ مضمون قاضی صاحب نے بھیجا یا نہیں، یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

نوٹ:- یہ خط ۱۸ نومبر ۱۹۵۰ء کو دفتر "اشارہ" آہن کدہ۔ گوتم بدھ روڈ، گیا میں موصول ہوا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو اس کا جواب دیا گیا۔ پوسٹ کارڈ پر یہ تاریخیں مکتوب الیہ نے درج کر رکھی ہیں۔

(۵)

پٹنہ۔۴

۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء

شفیق مکرم!

آپ جب چاہیں آئیں۔ مجھے مسرت ہوگی۔ لیکن ابھی اس خیال سے نہ آئیں کہ میں آپ کی کتاب (۱) کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر سکوں گا۔ میں نے ابھی تک اس کی ایک سطر بھی نہیں پڑھی ہے۔ اور نہ جانے کب اسے پڑھوں گا۔ یہ اس کی ناقدری نہیں ہے۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتابیں پڑھنا بھی اس میں شامل ہے۔

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

حواشی:

۱ مکتوب الیہ کی کتاب "اردو اور قومی ایکتا" کی جانب اشارہ ہے، جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

نوٹ:- ان تمام خطوط کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب اپنے مضامین کے علاوہ دوسروں کے غیر مطبوعہ [illegible] مضامین بھی رسالوں کو بغرض اشاعت بھیجا کرتے تھے۔ اس سے علم و ادب کے فروغ کے تئیں ان کے صحت مند ذہنی رجحان کا پتا چلتا ہے۔ مزید یہ کہ محقق کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ غیر مطبوعہ خطی نسخے اگر ہاتھ لگیں تو ان کو منظر عام پر لائے۔ (اظہر خضر)

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے خطوط
پروفیسر نذیر احمد کے نام

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی اس صدی کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے عنوان سے علمی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ کثرت سے خطوط لکھتے اور ملک و بیرون ملک کے محققین و اسکالرز سے علمی استفسارات کرتے یا یہ حضرات ان سے اپنے علمی کاموں کے سلسلے میں رجوع کرتے تھے۔ ڈیسائی صاحب کے نام مشاہیر کے خطوط اور اسی طرح مشاہیر علم و ادب کے پاس ڈیسائی صاحب کے خطوط بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ جن میں کسی نہ کسی خاص موضوع پر اظہار خیال ہوا ہے۔ اس طرح کے خطوط بہت ساری علمی گتھیاں بھی سلجھانے میں معاون ہوتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کی شخصیت بھی محتاج تعارف نہیں ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ''قاضی عبدالودود کے بعد ڈاکٹر ڈیسائی صاحب کے خطوط سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس بنا پر ان کا چھاپنا بڑی علمی خدمت ہوگی''۔ اسی خیال کے تحت یہ خطوط شایع کیے جارہے ہیں۔

ان خطوط کے لئے میں پروفیسر نذیر احمد صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ **مدیر**

(۱)

14, Khurshid Park, P.O. Juhapura,
Ahmadabad - 380055
17 December 1996

مکرم و محترم، سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ کچھ دن ہوئے ارشاد کی تعمیل میں قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کے یادگار نامہ کے لئے 'ہندوستانی عربی فارسی کتبہ شناسی - ایک جائزہ' کے عنوان سے مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے پتہ پر بھیجا تھا۔ امید کہ مل گیا ہوگا۔ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ قابل شمولیت نہ سمجھا جائے تو ''طبقات محمود شاہی'' پر ایک مقالہ لکھ کر بھیجوں۔ جواب کا انتظار ہے۔

ایک گزارش ہے مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کے آفتاب کلیکشن میں 'روضات شاہی حصہ چہارم' بعنوان جلیس نفیس و انیس سلیس ہے۔ یہ مصنفہ سید ابو جعفر بدر عالم بن سید جلال صدر الصدور ہے۔ سید خضر نوشاہی کا اس کے پہلے حصے پر تعارفی مضمون آپ کے ملاحظے سے 'معارف' میں گزرا ہوگا۔ جلیس نفیس و انیس سلیس فہرست مخطوطات ذخیرۂ آفتاب

عربیہ 8/21 صفحہ ۸، شمارہ ۲۲، کے تحت درج ہے۔ اس کی مائکروفلم یا زیراکس کاپی درکار ہے۔ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کتابخانے کے لئے۔ اس کی جو قیمت ہوگی وہ وہاں کے کتابخانہ کے قانون کے مطابق ادا کی جائے گی۔ اگر مبلغ پیشگی ادا کرنا ہو تو اطلاع آنے پر ڈرافٹ بھیج دیا جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں اعانت فرمائیں۔

رام پور اساتذۂ فارسی کانفرنس میں شرکت کرنے کو تو جی بہت چاہتا ہے لیکن سردی اور اپنی کمزور صحت کے پیش نظر سفر کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کافی کامیاب ہوگی۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی خدمت میں بھی۔

ضیاء الدین دیسائی

پس تحریر : میں علاحدہ ایک درخواست بنام لائبریرین صاحب آج ہی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ اپنی سفارش کے ساتھ اسے بھجوادیں اور ضرورت ہو تو ان کو فون پر کہہ دیں۔ ضیاء الدین دیسائی

(۲)

احمد آباد

۱۳ مارچ ۹۷ء

محترم المقام، سلام مسنون

۵ مارچ کا عنایت نامہ کل موصول ہوا۔ آپ اپنے انڈو ایرانیکا والے مضمون بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اپنا وہ شمارہ میں نے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کتابخانہ میں دے دیا ہے، وہاں دیکھ لوں گا۔

ڈاکٹر نور الحسن خاں صاحب کا خط آپ کے حوالے سے روضات شاہی کی مائکروفلم کے بارے میں آیا تھا۔ آپ کے مشورہ کے مطابق خواجہ پیری صاحب کے ذریعہ مائکروفلم مل جانے کے امکان کے پیش نظر میں اب ان کو سر دست ضرورت نہ ہونے کا جواب دے دوں گا۔ ویسے اسی کتاب کی ایک جلد کی مائکروفلم خواجہ پیری صاحب خانقاہ چشتیہ کے ذخیرہ سے کرا چکے ہیں۔ اس طرح روضات شاہی کی چوبیس جلدوں میں سے تین چار جلدوں کا پتا چل چکا ہے۔

آپ احمد آباد تشریف ضرور لے آئیں۔ انتظار رہے گا۔ دانش نامہ کے لئے کچھ موضوعات شریف صاحب نے بھیجے تھے۔ یہاں ریفرنس لائبریری کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور اپنی نقل و حرکت پر پابندی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ادھر کتابخانہ پیر محمد شاہ کی فہرست کے لئے بھی وقت دینا پڑتا ہے۔ فہارس کتابخانہ ہائے لندن وغیرہ اور کسی باقاعدہ معاون کی عدم موجودگی کی وجہ سے کام خاطر خواہ نہیں ہو رہا۔

دو تین روز سے میں بھی کچھ ناساز ہوں۔ ۱۸ کا دہلی بیگی صاحب سے ملنے کا پروگرام ملتوی کیا ہے۔ شاید ۲۵ کے لگ بھگ آنا ہو، اگر اللہ نے چاہا۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ نیاز مند

ضیاء الدین دیسائی

مکرر: خانقاہ چشتیہ میں کافی اہم مخطوطات ہیں۔ خواجہ پیری صاحب نے کتابخانہ پیر محمد شاہ کے لئے کچھ ڈپلی کیٹ رول دینے کا وعدہ کیا تھا جو ہنوز محتاج ایفا ہے۔ ان کے آدمی یہاں سے دو روز ہوئے کیمرا وغیرہ علی گڑھ لے گئے ہیں۔ وہاں کے کام کے بعد پھر شاید خانقاہ چشتیہ کے بقیہ مخطوطات کی مائکروفلم تیار کریں گے۔

(۳)

۱۴ خورشید پارک

احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵

۱۹ مئی ۹۷ء

مخدومی، سلام مسنون

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ادھر کچھ مصروفیت رہی۔ پرسوں کچھ فرصت ہو پائی ہے۔ پتا نہیں قاضی عبد الودود صاحب مرحوم کے یادگار نامہ کے لئے وقت کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہو تو میر رضی دانش کے والد مرزا ابوتراب فطرت کے لوح مزار کے کتبے پر مضمون تیار کیا ہے وہ بھیج دوں۔ واپسی ڈاک سے مطلع فرمائیں۔

تاریخ شاہجہاں والا کام پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ پروجکٹ کی میعاد ختم ہو چکی ہے دو سال ہوئے۔ بیگلی صاحب کے بعض خیالات کی وجہ سے کہ یوں ہو یوں نہیں، سے معاملہ کھٹائی میں پڑ رہا ہے۔ وارث والے حصہ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ دیکھا۔ لاہوری کا لفظ بہ لفظ ترجمہ دیکھ رہا ہوں۔ چھٹے سال جلوس والا حصہ ہو گیا۔ باقی تیسرے سال کے حصے دیکھنا باقی ہے جو بیگلی صاحب کے پاس ہیں وہ زبان کے نقطۂ نظر سے — امریکن انگلش اظہار خیال — دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کو ہیلر ہاکسن کے جن کے وہ بہت مداح ہیں، تو زک بابری کے ترجمے کے کئی حصے دکھائے، کچھ اغلاط بھی۔ میرے خیال میں ابھی بھی ترجمہ جس صورت میں ہے ہندوستان کیا امریکن معیار سے بھی صحت اور زبان دونوں کے لحاظ سے کافی اچھا ہے۔ ان کو بروس لارنس یا جان رچارڈ وغیرہ کچھ نہ کچھ سوجھا دیتے ہیں۔ میں نے ان کو کہا کہ اس طرح یہ کام پورا نہ ہوگا۔ میں اس لئے کچھ پریشان ہوں۔

'عمرو عیار کی زنبیل' کے معنی اور اس کے حوالے سے مطلع فرمائیں۔ یہ داستان امیر حمزہ کا ایک کیرکٹر ہے اگر میرا حافظہ جواب نہ دیتا ہو۔

بیگم نذیر صاحب بخیر و عافیت ہوں گی۔ ان کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ کیا علی گڑھ مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات کی مائکروفلم بنانے کا آقای خواجہ پیری نے کام شروع کرا دیا ہے؟

اخلاص کیش

ضیاء الدین دیسائی

(۴)

۱۴ خورشید پارک

پوسٹ جوہاپورہ، احمد آباد- ۳۸۰۰۵۵

۱۸ دسمبر ۹۷ء

مکرم ومحترم بندہ، سلام مسنون

امید ہے کہ آپ اور بیگم نذیر صاحب امریکہ سے بخیر و عافیت واپس تشریف لا چکے ہوں گے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پروفیسر محی الدین بومبے والا اور درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ کے سربراہ صاحبان ڈاکٹر محمد حبیب کاکی والا صاحب اور کچھ چھ ایک دیگر حضرات جن میں دو خواتین (بیگم کاکی والا وغیرہ) شامل ہیں، اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری دیکھنے کے لئے تشریف لے آرہے ہیں۔ ان کے پروگرام کے مطابق وہ لکھنو سے چل کر صبح علی گڑھ ٹرین سے پہونچیں گے اور اسی روز شام دہلی یا آگرہ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ وہ حضرات آپ سے اور ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی ملاقات کے متمنی ہیں۔

ان حضرات کا اصرار تھا کہ میں بھی اس سفر میں — دیوبند، سہارن پور، رام پور وغیرہ — میں ساتھ رہوں لیکن ان دنوں طبیعت سفر کی مشقت برداشت کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے مجبوری ہے اور اس طرح آپ حضرات سے نیاز کا موقع نہ ملنے کا افسوس۔

میں علی گڑھ یونیورسٹی کی حدود میں یا دودھ پور وغیرہ میں ہوٹلوں سے واقف نہیں ہوں اس لئے میں ان کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں۔ ان حضرات کو صرف دو ایک کمرے زیادہ سے زیادہ دن بھر کے لئے تبدیل لباس وغیرہ کے لئے چاہیے۔ اگر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں انتظام ہو سکتا ہو تو وہ نہایت ممنون ہوں گے۔ البتہ جو بھی گیسٹ ہاؤس کے اخراجات ہوں گے وہ ادا کریں گے۔

بومبے والا صاحب آپ کو اپنی آمد کی تاریخ اور ٹرین سے مطلع کریں گے۔ میرزا ابوتراب والا مضمون ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ اس میں ایک اور حوالہ کا اضافہ کرنا رہ گیا تھا۔ چونکہ اب مربوط کتاب کا زیراکس مل گیا ہے اس لئے حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ عنقریب ارسال خدمت کروں گا، انشاء اللہ۔

بیگم نذیر صاحب اور مختار الدین احمد صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

اخلاص کیش

ضیاء الدین دیسائی

(۵)

۱۴ خورشید پارک

جوہاپورہ، احمد آباد- ۳۸۰۰۵۵

۳ اکتوبر ۹۷ء

محترمی ڈاکٹر دام مجدہ، سلام مسنون

تفصیلی خط اور کارڈ مورخہ ۲۷/ستمبر دونوں پرسوں دوپہر ملے۔کل تعطیل تھی اس لئے خط آج بھیج رہا ہوں۔

بومبے والا صاحب ۳۰ کو یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ۲۸ تک میرا خود ساتھ جانے کا طے تھا لیکن اس روز ٹکٹ (ہوائی جہاز کا) بک کرانے کے وقت ہی طبیعت میں کسالت سی پیدا ہوئی اس لئے ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔

بہر حال وہ حضرات ۸ کی رات کو چل کر ۹ کی صبح لکھنو اور ۹ کی شب لکھنو سے چل کر ۱۰ کی صبح علی گڑھ پہنچ رہے ہیں۔ٹرین اور ٹھیک وقت کا مجھے بھی پتا نہیں۔ میں نے آج ان کو دہلی کے پتے پر (قاسمی صاحب کے پتے پر) رجسٹرڈ خط بھیجا ہے جو ان کو ۷ کو ان کی دیو بند وغیرہ کی واپسی پر مل جائے گا۔ میں نے ان کو آپ کے خط کے آنے کی بھی اطلاع کی ہے بلکہ کارڈ کا مضمون بھی نقل کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ آپ سے رابطہ قائم کریں۔

بیگم نذیر صاحب کی نئی تکلیف کا سن کر افسوس ہوا۔خدا کرے افاقہ ہو۔الاپیتھی کے علاوہ یونانی یا آیورویدک دوائی کارگر ہوتی ہو تو دیکھیں۔خدا کرے آپ کے کانفرنس میں آنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو۔

۲۸ والے بہادر شاہ ظفر (سمینار) میں آپ کی شرکت کا پتا نہ چلا۔ میں نے ایک انگریزی مقالہ بھیجنے کا آپ کو خط لکھا تھا جو تاباں صاحب والے مقالہ والے لفافے میں بند کیا تھا۔اگر آپ دہلی تشریف لے گئے ہوں گے تو ملا ہوگا۔اس کے بعد علی گڑھ کے پتے پر بھی ایک خط لکھا ہے جس میں میرزا ابوتراب مشہدی متخلص بہ فطرت والے مضمون کے دو حواشی میں اضافوں کی عبارت نقل کر کے بھیج دی ہے، ملی ہوگی۔ مضمون بھی نظر سے گزرا ہوگا۔اسی خط میں تذکرۂ نصرآبادی کے مطبوعہ نسخہ والی مخدوش عبارت کا ذکر کیا تھا اور حیدر آباد سے حسب دلخواہ جواب نہ آنے کا بھی۔اب ڈاکٹر سید حسن عباس کو رام پور لکھا ہے کہ وہاں کے نسخے میں دیکھ کر دو جملے والی عبارت نقل کر کے بھیجیں۔

میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ بہادر شاہ ظفر اور بیگم زینت محل کے عقد مسنونہ کے نکاح نامے کے وجود کا پتا چلا ہے نیز حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب جو بیگم زینت محل کی طرف سے وکیل تھے،ان کے نکاح نامے کے وجود کا پتا چلا ہے۔ پتا نہیں اس دور پر کام کرنے والوں کو ان چیزوں کا اور بہادر شاہ ظفر کے تاج شاہی کے بارے میں معلومات ہیں یا نہیں۔شاید مختار الدین صاحب کو اس بارے میں کچھ علم ہو۔

'اعجاز خسروی' کے بارے میں مجھ سے جو ہو سکے کرنے کو تیار ہوں اگر بالمشافہ بات ہو جاتی کہ کس طرح کیا جائے، اس بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا۔ ویسے مجھے دہلی آنے کا کہا جا رہا ہے اور دل بھی چاہتا ہے۔اگر طبیعت نے اجازت دی تو اس ماہ کے آخر یا نومبر کی ابتدا میں انشاء اللہ آنے کی سوچ رہا ہوں۔اس ماہ ۲۰ کے لگ بھگ اپنے ڈاکٹر کارڈیولاجسٹ سے Routine checkup بھی کرانا ہے۔

بیگم صاحب کی خدمت میں سلام۔مختار الدین صاحب کو بھی۔ڈاکٹر عارف نوشاہی نے میرے لفافے

میں ایک لفافہ ان کو بھیجنے کے لئے رکھا تھا جسے میں نے اسی روز رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیا تھا۔ امید کہ ان کو مل گیا ہوگا۔
اگر خواجہ پیری کے آدمیوں نے مائکروفلم مطلوبہ کا اپنے لئے بھی بنالیا ہو تو لائبریری والے جن کو وہ سب مخطوطات کی مائکروفلم دینے والے ہیں، اس مخطوطے کی مائکروفلم کے ڈپلی کیٹ میرے لئے قیمتاً تیار کر کے بھیج سکتے ہیں یہ کچھ کم قیمت میں پڑے گی۔

مخلص

ضیاءالدین دیسائی

(۶)

۱۴ خورشید پارک

جوہاپورہ، احمد آباد- ۳۸۰۰۵۵

۲۰ اکتوبر ۹۷ء

محترم ومکرم، سلام مسنون

کل ڈاکٹر ناہید آزرمی دخت سے ملاقات ہوئی۔ آپ کے تشریف نہ لا سکنے کی مجبوری کی اطلاع آپ نے اپنے خط میں دے دی تھی لیکن پروفیسر بوسے والا صاحب سے معلوم کر کے تشویش ہوئی کہ آپ کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ ویسے انھوں نے آپ نے ان حضرات کے قیام کو خوشگوار اور بامعنی بنانے کی جو زحمت کی اس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے کہا ہے کہ آپ کا میں ہم سب کی جانب سے شکریہ ادا کروں۔ وہ حضرات رات رکنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ بہرحال وہ علی گڑھ کی ملاقات سے نہایت خوش ہیں۔

انجمن استادان فارسی کی کانفرنس کا آج دوسرا دن تھا۔ کل ڈاکٹر آزرمی دخت کا خطبۂ صدارت نہایت اچھا اور پرمعنی تھا اور جامع بھی۔ وہ کل رات کافی بیمار ہوگئیں غالباً سفر کی وجہ سے۔ آج الحمدللہ وہ اچھی تھیں۔

امید کہ بیگم نذیر صاحب بخیر ہوں گی۔ میرزا ابوتراب فطرت والا مضمون ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کم از کم اس کے لوح مزار کے کتبے کے بارے میں یہ نئی اطلاع ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ بہادر شاہ ظفر سے می نار میں میرا مقالہ یا اس کا خلاصہ (جو بمشکل دو تین منٹ لیتا) نہ پڑھوایا جا سکا۔ ملکۂ انگلستان کی ہندوستان کی ملاقات کے خاص رایٹ اپ میں جہاں کوہ نور اور دیگر نہایت قیمتی اشیاء پادشاہ نامے کا مصور مخطوطہ وغیرہ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بہادر شاہ کا تاج شاہی کا ذکر نظر نہ آیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے وجود تک کے بارے میں لوگ کم و بیش لاعلم ہیں۔ دیکھتا ہوں اس کا اردو ترجمہ کرا کے کہیں شائع کرایا جا سکتا ہو تو۔

آپ خلف تبریزی پر کچھ لکھنا چاہتے تھے، کیا ہوا۔ بیگم نذیر صاحب اور مختار الدین احمد صاحب کو سلام عرض ہے۔

طالب دعا

ضیاءالدین دیسائی

(۷)

۱۴ خورشید پارک

جوہاپورہ، احمد آباد- ۳۸۰۰۵۵

۲۳ دسمبر ۹۷ء

مکرم ومحترم بندہ، سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۵ دسمبر ۱۳ کو مل گیا۔ خلاف معمول جواب لکھنے میں تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ادھر ڈیڑھ ماہ ہوا بیگم دیسائی، ان کی بمبئی والی ہمشیرہ اور دونوں پوتے پوتی آٹو رکشا میں ان کی دوسری ہمشیرہ کے ہاں جارہے تھے کہ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس سے ٹکر ہونے پر چاروں کو معمولی سے لے کر بہت سخت چوٹیں آئیں۔ بچی کو معمولی چوٹ، بیگم دیسائی کو بائیں ہاتھ کی کلائی اور نیچے کی ہڈی کا فریکچر اور دائیں طرف گلے کی ہڈی کا فریکچر ہوا۔ ان کی ہمشیرہ کو سب سے زیادہ چوٹیں آئیں۔ وہ ابھی تک ہسپتال میں ہیں۔ بیگم دیسائی کی پٹیاں کل کھل گئی ہیں۔ دو تین ہفتے معمول میں آنے کو لگیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اندرا گاندھی سنٹر کی جانب سے ایک امریکن خاتون ڈاکٹر باربرا شمٹز کا مرتبہ تصویروں والے البم اور مصور مخطوطات کی فہرست شائع ہو رہی ہے۔ اس سال کے اوائل میں انھوں نے اس کی کاپی مشورہ کے طور پر بھیجی تھی۔ اس پر میں نے اپنی مختصر رپورٹ بھیجی تھی کہ اس میں کافی زیادہ معمولی سے لے کر فاحش اغلاط ہیں جن کی سر دست مثال کے طور پر پنسل سے نشان لگا کر نشان دہی کی تھی۔ انھوں نے اس کو رپورٹ وغیرہ بھیجی۔ اس نے نظر ثانی کر کے مسودہ دوبارہ ان کو بھیجا جو سنٹر نے مجھے بھیجا کہ چونکہ دسمبر تک ہم پریس میں بھیجنا چاہتے ہیں، میں جلد اس سلسلے میں اپنی رائے دوں۔ ڈاکٹر شمٹز نے مرحوم اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ اور شریف صاحب قاسمی سے مدد لی تھی۔ دسمبر ۷ سے پہلے سنٹر کی جانب سے دہلی جانے کے لئے فون آتے رہے لیکن میرے نہ جاسکنے پر وہ خاتون یہاں آئیں اور اس سلسلے میں باتیں ہوئی اور اپنی کاپی میں نے ۷ دسمبر تک (جن) محل نظر چیزوں کی نشان دہی کی تھی، وہ کاپی ساتھ لے گئیں اور ساتھ ساتھ پانچ مخطوطات کے تصاویر والے صفحوں کے زیراکس دے گئیں کہ ان تصاویر کی نشان دہی کی جائے۔ کل کہیں جا کر اس کام سے فراغت حاصل ہوئی ہے۔ آج مسٹر جوشی ممبر سکریٹری اور سابق ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ (جو میرے دوست ہیں) کو بھیج رہا ہوں، انشاءاللہ۔

آپ نے جس کام کے سلسلے میں لکھا ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن 'اعجاز خسروی' کا نام سن کر ہی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ ویسے آپ کے ارشاد کی تعمیل میرا فرض ہے۔ اگر آپ کی راہنمائی میرے شامل حال رہی تو اپنے طور پر کوشش کروں گا۔ البتہ وقت اور ڈکشنریوں کا سوال رہے گا۔ وقت اس معنی میں کہ بیگلی صاحب تقریباً ایک ماہ ہوئے آئے ہیں۔ ابھی تک مجھ سے رابطہ قائم نہیں ہوا لیکن اگر وہ بادشاہ نامے کے ترجمے سالہائے جلوس ایک سے تیس تک کے ترجمے پر امریکن طرز کی زبان کے نقطۂ نظر سے کام کر چکے ہوں تو پھر شائد مجھے اس کام کے لئے

کچھ وقت دینا پڑے گا۔

بہر حال آپ جو بھی حکم دیں میں حاضر ہوں بشرطیکہ آپ کی رہنمائی ہو۔ خواجہ پیری صاحب نے خانقاہ چشتیہ سے کافی مخطوطات کے مائکروفلم لئے تھے۔ ان کی اس ''کامیابی'' میں درگاہ شریف والوں اور غیر واسطہ طور پر میری مساعی بر سر کار رہی ہیں۔ انھوں نے کچھ مخطوطات کے مائکروفلم۔ لمعات شاہیہ کی تین جلدیں کنوز محمدی وغیرہ نہایت اہم اور نایاب مخطوطات — بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ ستمبر میں بوہے والا صاحب اور کاکی والا صاحب کو وعدہ کیا کہ تیار ہیں اور بھیجی جائیں گی لیکن آج تک وہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ میں بالخصوص کنوز محمدی دیکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ درگاہ شریف والے معاملے کی پیروی نہیں کرتے۔

امید کہ بیگم نذیر صاحب اچھی ہوں گی اور آپ بھی۔ ان کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ مختار الدین احمد صاحب اور اقتدار حسین صدیقی صاحب کو بھی سلام عرض ہے۔ موخر الذکر کو کہیں کہ دو چار سطریں اور اپنا پتا بھیج دیں۔

دعا کی درخواست کے ساتھ۔ اخلاص کیش

ضیاء الدین دیسائی

مکرر: ۱۶ ادسمبر کو سالار جنگ سے می نار تھا۔ سالار جنگ کی مخزونہ اشیا پر مجھے بھی دعوت تھی۔ مقالہ بھی بھیجا لیکن جا نہ سکا۔ مقالہ سالار جنگ کے خطاطی کے نمونوں سے متعلق انگریزی میں ہے۔ اگر اس کا اردو ترجمہ کرا کر معارف میں شائع کرایا جائے تو اس کی کاپی بھیج دوں۔ وہاں کے ایک سو سے زائد (صحیح تعداد معلوم نہیں) البموں میں سے ایک سو البم میں نے وقتاً فوقتاً دیکھے تھے اور ان کی مخالفہ یادداشتیں قلم بند کی تھیں۔ ان پر مبنی یہ مقالہ ہے۔

ضیاء الدین دیسائی

(۸)

۱۴ خورشید پارک

جوہاپورہ، احمد آباد۔ ۳۸۰۰۵۵

۱۶ فروری ۹۸ء

محترم المقام، سلام مسنون

آپ کے دو عنایت ناموں کا جواب قدرے تاخیر سے رمضان میں دیا تھا۔ اس کی رسید سے محروم ہوں۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل کے بارے میں کیا یہ خط نہیں ملا؟ اس میں میں نے نومبر میں بیگم دیسائی، ان کی ہمشیرہ اور میرے دو پوتوں کے نہایت سخت حادثہ سے دو چار ہونے کا ذکر کیا تھا۔ بیگم دیسائی کی ہمشیرہ جو بمبئی سے آئی تھیں، وہ ابھی بھی صاحب فراش ہیں۔ ۱۵ مارچ تک شاید اس حالت میں ہوں کہ بمبئی جا سکیں۔

مجھے پتا نہیں قاضی عبدالودود صاحب والا یادنامہ کس مرحلے میں ہے۔ میرزا ابوتراب رضوی مشہدی متوفی ۱۰۶۰ھ کے حیدرآباد میں واقع لوح مزار کے کتبے پر میں نے مضمون بھیجا تھا۔ پتا نہیں آپ نے اسے قابلِ شمول سمجھا ہے یا نہیں۔ اب مجھے مکمل کتبے کا عکس حاصل ہوگیا ہے۔ اس کی روشنی میں مضمون میں ترمیم واضافہ ضروری ہے جو ملفوف ہے۔ اس میں صفحہ ۸ پر ایک پیراگراف کی جگہ دو پیراگراف اور صفحہ ۱۱ پر فٹ نوٹ ۳۵ میں پانچ سطروں کا اضافہ اور صفحہ ۹ پر کتبے کے چھوٹے ہوئے متن کی نقل کا اضافہ ہے۔ اس سے قبل فٹ نوٹ ۱۷ میں کچھ سطروں کے اضافے کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ نیز تین جگہ سہوِ قلم کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اگر کسی وجہ سے مضمون شائع نہ ہو تو مطلع فرمائیں تا کہ اسے معارف یا دانش میں اشاعت کے لئے بھیج دوں۔

امید کہ آپ اور بیگم نذیر صاحب بخیر و عافیت ہوں گے۔ بومبے والا صاحب سے پتا چلا کہ آپ ان دنوں بمبئی میں غالب سے می نار کے سلسلے میں تشریف فرما ہیں اور اگلے ماہ ہونے والے ایک سے می نار میں یہاں تشریف لے آئیں گے۔ نیاز حاصل کرنے اور مستفید ہونے کے اس موقع کا شدت سے انتظار ہے۔ بیگم نذیر صاحب اور ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب وغیرہم کو سلام۔

کتبے کا زیراکس بھی ملفوف ہے۔

نیازمند

ضیاء الدین دیسائی

احمد آباد

(۹)

۱۲ مارچ ۹۸ء

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ کئی دن ہوئے ملا تھا۔ کمر کی چوٹ کا معلوم کر کے تشویش ہوئی۔ امید (ہے) اب تکلیف رفع ہوگئی ہوگی۔

جیسا کہ پچھلے خطوں میں لکھا تھا پریشان رہا۔ اوپر سے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ سے می نار کے سلسلے میں مصروفیت رہی۔ مجھے یہ خیال رہا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں اس لئے بھی جواب میں تاخیر ہوئی۔ کل سے می نار کے افتتاح پر پتا چلا کہ آپ تشریف نہیں لائے، نہ لانے والے تھے۔

میں کل دن بھر وہاں مصروف رہا۔ شام کچھ طبیعت ناسازی معلوم ہوئی تو پروگرام کے بعد گھر چلا آیا اور آج جا نا سکا نہ کل بھی جا سکوں گا۔ رام پور سے کوئی خط ابھی تک نہیں آیا ہے۔

رام پور کے مصور نسخہ جات اور تصویروں پر امریکن خاتون کی فہرست کے سلسلے میں اندرا گاندھی سنٹر سے

تقاضے پر تقاضے ہو رہے ہیں۔ عرشی زادہ اور شریف صاحب اور ان کی اہلیہ کے تعاون کے باوجود وہ کام ابھی تک نہ ہو پایا۔ میں نے دو ایک ماہ یہاں بیٹھ کر تاشفی بخش زیراکس کی مدد سے اس کو کافی حد تک ٹھیک ٹھاک کیا۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ رام پور اصل مخطوطات دیکھ کر باقی ملاقات (صفحات مقالات) پر نظر ثانی کی جائے۔ میں نے سفر ترک کر دیا ہے لیکن مسز واتسائن اور مسٹر ایم۔سی۔جوشی کا اصرار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس ۵۰ ویں سال آزادی کے دوران یہ شائع ہو جائے اس لئے مجبوراً ۲۳ کو روانہ ہونے کا ان کو کہا ہے۔ خدا کرے طبعیت اس وقت تک بالکل ٹھیک ہو جائے۔

'اعجاز خسروی' والا مواد ابھی تک ملا نہیں۔ بینک کے اکاونٹ کے بارے میں کام شروع ہو جانے (کے) بعد میں عرض کروں گا۔

سے می نار گجرات کی علمی خدمات کے موضوع پر تھا۔ عابدی صاحب، اظہر صاحب، قاسمی صاحب اور شعیب اعظمی صاحب نے گجرات کے ایرانی شعرا (کاروانِ ہند سے) اور گجرات کے فارسی ادب پر مقالے پڑھے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

خواجہ پیری والے مائکرو فلم کی رول وصول نہیں ہوئی نہ غالباً ہوں گی۔ سوچتا ہوں لائبریری میں انھوں نے جو رقم لکھی تھی، بھیج دوں۔ اگر رول ان کے پاس ہے تو ڈپلی کیٹ بنانے میں شاید کم لاگت آئے۔

میں نے ایک مرتبہ کبیر جائسی صاحب والے نسخۂ ناسخہ مثنویات سقیمہ کے مولانا سلیمان کردہ کے کتابت کردہ نسخے کے بارے میں لکھا تھا اور زبانی بھی عرض کیا تھا کہ اگر وہ قیمتاً دینا چاہیں تو درگاہ ٹرسٹ کے لئے خاندان ولی اللہ (جن کی ملکیت میں وہ نسخہ رہ چکا ہے) والے خرید لیں گے بہ صورت دیگر اگر اس کا زیراکس مل جائے تو درگاہ شریف لائبریری کے لئے اچھا اضافہ ہوگا۔ وہیں اسی کتاب کا خود عبد اللطیف عباسی کی تحریر اور مہر والا نسخہ بھی ہے۔ اس لئے اگر یہ نسخہ یا زیراکس کاپی وہاں آجائے تو اچھا ہو۔

امید کہ بیگم نذیر صاحب اچھی ہوں گی۔ ان کی خدمت میں سلام۔ مسز دیسائی کی ہمشیرہ پرسوں بمبئی گئیں۔ ابھی بھی وہ تقریباً صاحب فراش ہیں۔ میرے پوتے کے ایک کان کی شنوائی حادثے کی وجہ سے گئی۔ اللہ کو جو منظور ہوا۔

طالب دعا

ضیاء الدین دیسائی

(۱۰)

احمد آباد

۳۰ اپریل ۹۸ء

مخدومی، سلام مسنون

۱۶ اپریل کا گرامی نامہ اور پارسل ۲۷ کو ملا۔ شریف الحسن قاسمی صاحب (شریف حسین قاسمی) ۲۵ کو یہاں

آئے تھے۔ ان سے دوران گفتگو میں نے کہا تھا کہ رسایل اعجاز کی چوتھی جلد صنائع و بدائع سے متعلق ہے اور اس کا ترجمہ بغیر ان علوم سے واقفیت ایک بڑا مشکل کام ہوگا۔ پھر یہاں فارسی - فارسی اور فارسی - انگریزی لغت سوائے سٹائن گس کے میرے پاس ہے نہیں۔ غیاث اللغات ہے لیکن وہ اتنی مفید نہیں۔ فرہنگ آنندراج اور بہار عجم اور ڈاکٹر معین کی لغات، لغت نامۂ دھخدا وغیرہ سے رجوع کئے بغیر کام نہ بن پڑے (گا)۔ بہر حال میں دو تین روز میں پارسل کھول کر دیکھوں گا ابھی رام پور والے مصور نسخوں اور نقاشی کے البم کے کیٹلاگ کے کام سے فارغ ہو کر امریکہ وغیرہ کے خطوط کا جواب دینے کا کام ہے۔

خدا کرے بیگم نذیر صاحب اور آپ کی تکلیف جلد از جلد رفع ہو۔ یہاں اللہ کے فضل سے نسبتاً خیریت ہے۔ مجھے البتہ بینائی کی کچھ شکایت ہوتی نظر آرہی ہے۔ یوں بھی ایک حادثے کے بعد ایک آنکھ کی بینائی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ تین ماہ پیشتر متخصص کو دکھایا تھا لیکن اس وقت کوئی ایسی بات کا پتا نہ چلا تھا۔ اب پھر دکھاؤں گا۔ ویسے بھی میری بصارت بچپن سے ہی کمزور ہے۔ یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے کہ اس کے باوجود بھی کچھ نوشت و خواند کا کام ہو پایا۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام۔ مختار الدین احمد صاحب کا پٹنہ سے جوابی خط آیا ہے۔ قاسمی صاحب سے ان کی نئی اسامی کا پتا چلا۔ روضات شاہی کی مائکروفلم اگر بنی ہوئی ہے تو اس کی Duplicate لائبریری کی طرف سے رعایتی دام سے مہیا ہو سکتی ہو۔ شریف (قاسمی صاحب) ۱۱ کو وہاں آرہے ہیں، ان کو کہا ہے معلوم کریں۔ طالب دعا

ضیاء الدین دیسائی

(۱۱)

۸ مارچ ۹۹ء

محترم المقام دام مجدہ، سلام مسنون

آج ناگپور سے ٹایپ شدہ کاغذات پہنچے ہیں۔ آپ ہو سکے تو فون پر بتائیں کہ آپ کو کب تک یہ کاغذات پہنچنے چاہئیں۔ نیز جو متن آپ نے بھیجا تھا اور انگریزی ترجمہ وہ بھی بھیجنا ہے؟ انگریزی ترجمہ جو آپ نے بھیجا تھا اسے میں نے ویسے ہی رہنے دیا ہے۔

میں نے ترجمہ پورے کا پورا نئے سرے سے کیا ہے اگر چہ میں پورے طور پر مطمئن نہیں ہوں تاہم کافی حد تک ٹھیک کیا ہوا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ میں نے اپنے پہلے خط میں عرض کیا تھا آپ کی توجہ سے یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ اگر صحیح متن پیش نظر ہوتا تو بہتر تھا۔ کیوں کہ پوری کتاب مراعات نظیر اور تجنیس سے بھری پڑی ہے۔ میرے خیال میں یہ حواشی نکال دیے جائیں سوائے معدودے چند جو ضروری سمجھیں جائیں۔ مقدمے میں اس کا ذکر اور کچھ

مثالیں دینا کافی ہوگا۔

مجھے خیال تھا کہ نسخۂ مطبوعہ کے حواشی سے مدد ملے گی لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ حاشیہ نگار نے پورا زور زیادہ تر مراعات نظیر والے الفاظ کی نشان دہی کرنے پر صَرف کیا ہے (اور تجنیس کے بھی)۔ بہر حال میں نے حواشی میں اپنے نزدیک ضروری چیزوں کی تشریح وغیرہ کی ہے۔ میں نے حواشی میں عربی فارسی الفاظ اور عبارتوں کو رومن رسم الخط میں لکھا ہے۔ ناگپور کے ٹائپسٹ حضرات کی سہولت کے لئے جگہ خالی چھوڑنے پر کچھ گڑبڑ ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے دوسرے رسائل میں جو طریقہ اختیار کیا ہوا سے اس کے مطابق کرالیں یا کہیں تو میں کردوں۔

اس کام کے درمیان بلکہ ابتدا ہی سے مجھے آنکھ کی تکلیف شروع ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ متخصص کو دکھایا ہے دوسرے متخصص کو ہفتے عشرے میں دکھاؤں گا۔ ٹائپ شدہ مواد پر نظر کرنے میں کچھ وقت لگنے کا اندیشہ ہے۔ اس کام (ترجمے) کو ختم کرنے کے بعد لکھنا پڑھنا بہت کم کردیا ہے۔

رام پور سے وقارالحسن صدیقی صاحب کا خط پرسوں سنیچر کو ملا۔ ان کو آج جواب دے رہا ہوں۔ مقالہ لکھنا ظاہر ہے ضروری ہے۔ کوشش کروں گا انشاء اللہ۔

آپ کب رام پور پہنچ رہے ہیں؟ خواجہ پیری صاحب نے علی گڑھ والی مائکروفلم ابھی تک نہیں بھیجی۔ نومبر میں مَیں نے یاددہانی کی تھی۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

جواب کا منتظر

ضیاءالدین دیسائی

(۱۲)

14, Khurshid Park, P.O. Juhapura
Ahmadabad - 380055
30 March 1999

مکرم و محترم بندہ، سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں نے کاغذات بذریعہ رجسٹرڈ پارسل اے ڈی ۱۵ مارچ کو سپرد ڈاک کروایا تھا۔ توقع کے خلاف ۱۴ اتوار کو نہ بھیجا سکا۔ ابھی تک نہ ڈاک والی رسید آئی ہے نہ آپ کی جانب سے کوئی اطلاع۔ امید کہ پارسل مل گیا ہوگا۔ رام پور کی مصروفیت اور واپسی کے بعد کی مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ ملا ہو۔ بہر حال اولین فرصت میں دوسطریں تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔ اس خط کے ملنے تک ڈاکٹر حبیب احمد صاحب آچکے ہوں گے۔

میں الحمد اللہ اچھا ہوں۔ سردی کی شکایت تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن کھانسی کی تکلیف ابھی ہے۔ آج کل یہاں کے سارابھائی فاونڈیشن (کیلیکو ٹکسٹائل میوزیم جس میں مدغم ہے) کے خطاطی کے بیں بائیس نمونوں پر کام کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر بی-این-گوسوانی جو اس ادارے کے وائس چیر مین ہیں، نے ذاتی طور پر فرمائش کی ہے۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں سلام عرض کردیں۔ مخلص

ضیاء الدین ڈیسائی

(۱۳)

احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵

۳ اپریل ۹۹ء

محترم المقام زید مجدکم، سلام مسنون

گرامی نامہ ۲۴ کا پرسوں ملا۔ کاغذات پہنچ گئے یہ جان کر اطمینان ہوا۔ پتا نہیں ترجمہ وغیرہ آپ کو پسند آیا یا نہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کے یادنامے کے لئے کسی کتبے پر مضمون لکھنے کا آپ نے جو تحریر فرمایا ہے اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال سے جو نئے کتبے دریافت ہوئے ہیں، ان کے بارے میں ایک تو پتا نہیں چلتا کیونکہ سالانہ رپورٹ پچھلے دس پندرہ سال کی ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور اگر کسی اہم کتبے کا پتا چلے تو اس کا چربہ وغیرہ حاصل کرنا مشکل ہے۔ غیر شائع شدہ اشیا کے فوٹو تک ادارے کی جانب سے نہیں مہیا کیے جاتے۔

میں نے انگریزی میں ایک مضمون عہد جہانگیر میں ایرانی سفیر کی جانب سے (آج کل جیسے راج گھاٹ وغیرہ پر سفرا اور بیرونی ممالک کے سربراہ جاتے ہیں) رسمی ملاقات/ حاضری دینے کا چشم دید احوال ہمارے عبداللطیف عباسی نے اپنے ایک خط میں درج کیا ہے، مضمون ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن کہتے ہیں ''عنقریب' شائع ہوگا۔ انڈین کاونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے اکبر پر کیے گئے سمی نار کے لئے لکھا تھا۔ ان مقالوں کی پریس کاپی اقتدار عالم خان صاحب نے تیار کر کے دو سال قبل دے دی ہے۔ ایک ماہ قبل دریافت کرنے پر کاونسل والوں نے کہا کہ یہ شائع ہو رہی ہے۔

اگر آپ چاہیں تو اس کو اردو میں لکھ کر ارسال خدمت کروں۔ ویسے کشمیر کے غیر مطبوعہ کچھ کتبے اہم ہیں۔ اگر ہوسکا تو ان کے فوٹو مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اتفاق سے بیجاپور کے کچھ دستاویزات کے عکس بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اگر فرمائیں تو ان میں سے کسی اہم دستاویز پر مضمون لکھوں۔

سردست میں یہاں کے سارا بھائی فاونڈیشن کے میوزیم کے خطاطی کے نمونوں پر کام کر رہا ہوں۔ ہفتہ عشرہ میں اس کا مسودہ تیار ہو جائے گا بعد میں اس کو صاف کروں گا انشاءاللہ۔

آپ نے نومبر میں فرمایا تھا کہ آپ شاید راج کوٹ تشریف لائیں لیکن پروگرام نہیں بنا۔ گزشتہ مرتبہ آپ اچانک تشریف لائے۔ اس وقت بھی آپ کو ایک دو دن قیام کا وقت نہیں تھا۔ امریکہ جانے کا طے ہو تو آپ روانگی کی تاریخ

طے ہونے پر مطلع فرمائیں۔

رام پور سے می نار کے مقالوں کی فہرست کا انتظار ہے۔ ایک دوست نے قومی آواز کا تراشہ بھیجا تھا کہ ڈائرکٹر کی اسامی کا اشتہار دے دیا جائے اور انتخابی کمیٹی کے اراکین کے نام بھی آئے تھے۔ خدا کرے کوئی قابل شخص کا انتخاب ہو۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں ہمارا سلام عرض کریں۔ مختار الدین صاحب پٹنہ سے واپس لوٹے ہوں تو ان کو بھی میرا سلام پہنچائیں۔

دعا کا طالب

ضیاء الدین دیسائی

مکرر: بیگلی صاحب دہرہ دُون میں ہیں۔ ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو پا رہا۔ پتا چلا ہے کہ پریشان ہیں۔ ان کے ایک ہی (بڑے بھائی) کا دو سال قبل انتقال ہوا تھا اور مسز بیگلی بھی کافی بیمار ہیں۔ سینے میں کینسر آخری مرحلے میں ہے۔ ان کی والدہ بھی امریکہ میں بیمار ہیں چنانچہ وہ دسمبر میں امریکہ اپنی والدہ کو ملنے گئے تھے۔ پٹیالہ انڈین ہسٹری کانگریس میں انھوں نے تاج محل پر لکچر دیا تھا۔ نیشنل آرکایوز کے ذاکر حسین نے اطلاع دی ہے۔

(۱۴)

۱۴ خورشید پارک

احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵

۱۳ اپریل ۹۹ء

محترم المقام، سلام مسنون

۸ اپریل کا نوازش نامہ اور ڈرافٹ کل موصول ہوئے۔ ممنون ہوں۔

آپ کا ۲۴/ مارچ کے پارسل کی رسید کا خط مجھے ۱/اپریل کو ملا تھا۔ اس میں جواب طلب کوئی چیز نہ تھی اس لئے میں نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پارسل کی رسید نہ ملنے کا خط آپ کے خط کے ملنے سے پہلے بلکہ اسی روز یعنی ۱/اپریل کی صبح سپرد ڈاک کرایا تھا۔ میرے خیال سے آپ کو پارسل رامپور روانگی تک یعنی ۱۸/ مارچ تک مل جائے گا اس لئے ۱/اپریل تک رسید نہ آنے پر —A.D رسید— تشویش ہوئی۔ بہرحال بخیر گذشت۔

میں نے اپنے ۱ اپریل والے خط میں (جو ۸ تک آپ کو نہیں ملا اور پتا نہیں اب تک ملا بھی ہے یا نہیں) آپ نے قاضی عبدالودود صاحب مرحوم یادنامہ کے لئے کتبے وغیرہ پر مضمون کے بارے میں ایک دو اور موضوعات کا لکھا تھا کہ اگر مناسب سمجھیں تو اس پر مضمون لکھوں۔ ایک موضوع عبداللطیف عباسی نے جہانگیر کے عہد میں سفیر ایران کی (آج کل راج گھاٹ وغیرہ کی سربراہان مملکت کی 'زیارت' کی طرح) اکبر کے مزار کی ملاقات کا چشم دید حال لکھا ہے۔ اس پر میں نے

ایک مضمون پانچ سات سال ہوئے انگریزی میں لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اسی کو اردو میں لکھا جا سکتا ہے۔ خود عبد اللطیف اپنے امیر لشکر خاں کی جانب سے (لشکر خان کو جہانگیر نے اس ملاقات کے لئے Chief of Protocol بنایا تھا) سفیر کے ساتھ اول سے آخر تک رہا۔ انشائے عبد اللطیف کے ایک خط میں اس ملاقات کا پورا حال لکھا ہے جو دلچسپ ہے او رموضوع کی ندرت کے لحاظ سے اردو قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہو۔

بہر حال اور کوئی موضوع ذہن میں آئے گا تو انشاء اللہ مضمون لکھوں گا۔ یہاں کتابوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کام نہیں ہو رہا۔ اپنی تھوڑی بہت کتابوں سے کام چلتا رہتا ہے۔ پھر اب آنکھوں کی تکلیف کے باعث بھی نوشت وخواند کچھ کم ہی ہو رہی ہے۔

خدا بیگم نذیر صاحب کو شفائے کامل بخشے۔ امریکہ کے کسی کتابخانے میں عبد اللطیف عباسی کا مرقومہ (نہایت اچھے نستعلیق میں) رباعیات عمر خیام کا نسخہ ہے جس کا عکس مرحوم ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی نے شائع کیا ہے لیکن موصوف نے حسب معمول اس کے جائے وقوع کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ شاید یہ Cleveland کے میوزیم میں ہو۔ اس کی ایک اور مرقومہ کتاب کا حوالہ میں نے اپنی کسی یادداشت میں قلم بند کیا ہے جو سر دست مل نہیں رہا۔

اگر ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی صاحب سے رابطہ قائم ہو تو ان سے کہیں کہ کبھی کبھار یاد فرما لیا کریں۔ مختار الدین صاحب وہاں ہوں تو سلام۔ بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں ہمارا سلام عرض ہے۔

مخلص

ضیاء الدین دیسائی

احمد آباد

(۱۵)

۹ جولائی ۲۰۰۱ء

محترم المقام دام مجدہ، سلام مسنون

کافی دن ہوئے آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا تھا۔ امید کہ آپ اور بیگم نذیر صاحب بخیر عافیت ہوں گے۔

کل بوہیے والا صاحب تشریف لائے تھے۔ دہلی سے پرسوں واپس لوٹے ہیں۔ ان کی اور میری بھی خواہش ہے کہ آپ اکتوبر کے وسط میں ہونے والے درگاہ شریف کے گجرات کی علمی خدمات کے سے می نار میں تشریف لے آئیں تو وہ سب آپ کے احمد آباد کے سفر کا پورے طور پر خیال رکھیں گے کہ آپ کو کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔

میں چراغ بہ سحر ہوں۔ ویسے اللہ تبارک وتعالٰی کے لطف وکرم سے امید ہے۔ بہر حال چوں کہ اب میرے باہر جانے کا سوال کم بلکہ ناممکن سا ہے آپ کی تشریف آوری سے ایک مرتبہ اور شرف نیاز حاصل ہوگا۔

دوسری عرض یہ ہے کہ ڈاکٹر نثار احمد انصاری کا مقالہ (ڈاکٹریٹ) طباعت کے آخری مرحلے میں ہے۔ وہ

چاہتے ہیں کہ آپ ایک مختصر سا اپنی رائے کا نوٹ ارسال فرمائیں۔ انھوں نے اپنے اس مقالے کے مقدمے کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ آپ از راہ کرم تھوڑا سا وقت نکال کر جتنا بھی جلد نوٹ ارسال فرمائیں ہم ممنون ہوں گے۔

اِدھر الحمد اللہ میں بخیر و عافیت ہوں۔ بیگم دیسائی اور بچے بھی آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ بیگم نذیر صاحب کو بھی۔

اِدھر میں نے دو ایک مضامین انگریزی میں لکھے ہیں۔ ایک بیاض (بلکہ البم) حمیدہ بانو بیگم پر جس میں سلطان محمد کی تصویروں کے بارے میں لکھا ہے کہ شاہ طہماسپ اول کے تصویر خانہ کے سربراہ اس مصور کی چونکہ بہت کم تصویریں دستیاب ہیں، یہ تصویریں صفوی عہد کی اسلامی مصوری کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتی ہیں۔ آپ کے عابدی صاحب کے اور مرحوم یوسف کمال بخاری کے مضامین کا ذکر کیا ہے۔

دوسرا مضمون بشن داس مصور کے بارے میں ہے۔ ظفر خاں احسن کی مثنویات کے مجموعے پر ایک فارسی تحریر جو شائع ہو چکی ہے، اس سے اس مصور کے بارے میں کچھ نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ابھی ابھی یہاں کے مشہور کیلیکو ٹکسٹائل میوزیم جو اب ایک آرٹ میوزیم کی شکل اختیار کر چکا ہے اس کے مخزونہ چنداین—لورک چاندا کے پانچ مصور اوراق کے عربی خط میں متن کا ترجمہ وغیرہ میوزیم کے لئے کر کے دیا ہے۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ کچھ نہ کچھ کر پا رہا ہوں۔

سنا ہے سید اکبر علی ترمذی صاحب خانۂ فرہنگ ایران کے ماتحت جو سے می نار ایران اور گجرات کے تعلقات پر بڑے پیانے پر کر رہے ہیں، آپ تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بھی میرے لئے ایک خوش خبر ہے چشم ما روشن۔ بیگم صاحبہ کو سلام۔ طالب دعا

مخلص

ضیاء الدین دیسائی

احمد آباد (۱۶)

۳۰ اگست (؟)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

ایک عرصہ ہوا جناب والا اور بیگم نذیر صاحب کی خیر و عافیت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اِدھر مئی کے حادثے کے بعد کمر والے درد کی معمولی ہی سہی تکلیف جاری ہے۔ پھر میں جون کے اوائل میں شریف صاحب کو دہلی آپ کے لئے ایک نسخہ دیوان جلالی احمد آبادی (والد صدر الصدور سید جلال) اور رقعہ بھی بھیجا تھا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ جولائی ۱۱/ کو آپ دہلی

تشریف لے جائیں گے تو آپ کو پیش کردیں گے۔ پتا نہیں وہ نسخہ آپ کو ملا یا نہیں۔

اِدھر تاریخ شاہجہان نامہ والا کام کچھ تاخیر میں پڑا ہوا ہے۔ بیگلی صاحب اپریل میں یہاں سے گئے اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو پایا اور جاڑوں میں جب وہ یہاں تھے تو اب کی بار میں نہ جا سکا اور وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی آمد اور اپنے شاگرد کے ساتھ دکن کے مقامات کی سیر کرنے میں مصروف رہے۔ تاریخ شاہجہان کی پہلی جلد (سنہ جلوس ا تا ۳۰) یوں تو بالکل تیار ہے لیکن امریکہ میں جان رچارڈز وغیرہ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ فٹ نوٹس بھی ہونے چاہئیں ورنہ یہ اس وقت تک اشاعت کے لئے تیار ہو جاتا۔

بیگم نذیر صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

طالب دعا

ضیاء الدین دیسائی

(۱۷)

۱۴ خورشید پارک

پوسٹ آفس جوہاپورہ

احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵

۳۰ ستمبر (؟)

محترم و مکرم بندہ، سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خیال تھا کہ ۲۱ ستمبر والے سے می نار میں شرکت کرتے ہوئے نیاز حاصل ہوگا اور استفادے کا موقع بھی نصیب ہوگا۔ لیکن نہ ہو سکا۔

میں الحمد اللہ بخیر و عافیت ہوں۔ گزارش یہ ہے کہ کسی آنے جانے والے کے ساتھ میری وہ کاپی جس میں 'جمعات شاہیہ' کی وہاں کی لائبریری والے نسخوں کی یادداشتیں ہیں، دہلی شریف الحسن قاسمی صاحب (شریف حسین قاسمی) یا خانۂ فرہنگ ایران میں یا ایوانِ غالب میں تاباں صاحب کے ہاتھ ارسال فرمائیں تو میں ۱۱ اکتوبر کو دو ایک دن کے لئے دہلی انشاء اللہ جاؤں گا اُس وقت مجھے مل جائے۔ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ شریف صاحب کو کہہ رکھا تھا لیکن وہ غالباً بھول گئے۔

پٹنہ سے می نار کے لئے مہروں، ترقیموں، عرض دیدوں اور تحریروں پر ایک مقالہ بھیجا تھا جو غالباً عنقریب شائع ہوگا۔ اس میں ترمیم و اضافے کی گنجائش ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں اور اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں۔

امید کہ بیگم نذیر صاحب کی صحت اچھی ہوگی۔ ان کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

طالب دعا

ضیاء الدین دیسائی

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کا تاجِ شاہی[1]

آخری مغل بادشاہ سراج الدین ابوالمظفر محمد بہادر شاہ دوم کے تاج شاہی کے وجود اور اس کی حالیہ جائے وقوع کے بارے میں اردو داں طبقہ کم و بیش ناواقف ہوگا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو کے انگریزی داں قارئین بلکہ انگریزی داں حضرات کو بھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ عظیم تاریخی یادگار اور قومی ورثہ ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا اپنے وطن سے ہزاروں کوسوں (میل) دور برطانیہ پہنچ کر وہاں کڑی نگرانی میں محفوظ ہے۔ یہ بھی ستم ظریفی سے کم نہیں کہ یہ کوئی خفیہ یا چھپی ہوئی بات ہے۔ اس تاج کے لندن پہنچنے کی روداد انگریزی کتابوں میں شایع ہو چکی ہے لیکن ہمارے اچھے خاصے پڑھے لکھے قارئین فنون لطیفہ کے بارے میں خاصی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس لئے مصور قلمی نسخوں، خطاطی کے نمونوں اور وصلیوں، تصویروں، کاشی کاری اور دھات وغیرہ کے خوبصورت منقش مختلف النوع برتن وغیرہ جیسی اشیا کے بارے میں یورپی زبانوں کی کتابوں یا مجلوں میں جو معلومات شایع ہوتی رہتی ہیں، ان سے وہ ناواقف ہیں۔

ادھر کچھ کم ایک صدی قبل سے یورپ اور بعد میں امریکہ میں شبہ قارہ کی عہد اسلامی بالخصوص مغل دور کی ان اشیا کی نمائش وقتاً فوقتاً ہوتی رہی اور اب بھی ہوتی رہتی ہے۔ ان نمائشوں کی نہایت جامع، مفید اور دیدہ زیب فہرستیں یا کٹیلاگ مع رنگین اور سیاہ و سفید تصاویر اعلا دبیز آرٹ پیپر پر شایع ہوتی ہیں۔ ایسی ایک نمائش لندن کے وکٹوریا البرٹ عجائب گھر (میوزیم) میں ۱۹۸۲ء کے ۲۱ اپریل سے لے کر ۲۲ اگست تک 'جشن ہندو برطانیہ' کی تقریب کے موقع پر منعقد ہوئی تھی۔ نمائش میں اس مغل تاج شاہی کو سینکڑوں ناظرین نے دیکھا۔ ان نمائشی اشیا کا تعلق شاہان مغلیہ کی طرز زندگی اور فنون سے ان کی دلچسپی سے تھا۔ اس لئے اس کے کٹیلاگ کا نام ''میراثِ ہند۔ شاہانِ مغل کی درباری زندگی اور فنون'' رکھا گیا (۲)۔ اس کے مرتب، مسٹر اسکیلٹن نے اس کی مختصر روداد دی ہے۔ یہ تاج شاہی اب ملکہ' برطانیہ الزابیتھ دوم کے لندن سے کچھ فاصلے پر مشہور ایٹن کالج کے قریب واقع سر کیسل (ونڈسر قلعہ) میں ملکہ کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ ملکہ برطانیہ کے اس ذخیرے میں نہ صرف آرٹ کی ایسی لاثانی، نادر اور بیش قیمت اشیا موجود ہیں بلکہ اس میں نایاب اور منحصر بفرد فارسی، عربی، اردو مخطوطات کے علاوہ نہایت کم یاب انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی قدیم مطبوعات اور اس قسم کے دیگر آثار قدیمہ اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ چار سال قبل دہلی کے نیشنل میوزیم میں ملا عبدالحمید لاہوری کی شاہجہاں کی بیس سالہ فارسی تاریخ 'بادشاہ نامہ' کی جلد اول کی تصویروں کی خصوصی نمائش کا بڑے پایہ پر اہتمام کیا گیا تھا۔ بادشاہ نامہ کا یہ نسخہ شاہجہاں نے اپنے دربار کے ماہر خوش نویس محمد امین مشہدی اور خوش خط نستعلیق میں کتابت اور اسے اپنے دربار کے مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی اعلا تصویروں سے مزین کرایا

تھا۔ دہلی والی نمائش میں صرف یہ تصاویر ہی رکھی گئی تھیں۔(۳)

بہ قول مسٹر اسکیلٹن اس تاج شاہی کا سب سے پہلا ذکر بیسویں صدی کے دہۂ ہفتم میں مسٹر آر۔کولیئر نے 'غدر ہند' نامی اپنی انگریزی کتاب میں کیا تھا اور غالباً پہلی بار اسے جشن ہند والی نمائش میں رکھا گیا۔ کولیئر نے لکھا ہے کہ یہ تاج رابرٹ ٹاٹلر نامی کسی شخص نے ملکۂ برطانیہ وکٹوریا کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ ٹاٹلر نے اسے غدر کی افراتفری اور لوٹ مار کے دوران ملی ہوئی چیزوں کے نیلام میں خریدا تھا(۴)۔ اسکیلٹن نے اس بارے میں مزید تفصیل نہیں دی۔ نہ یہ پتا چل سکا کہ خود کولیئر نے اس بارے میں کچھ اور لکھا ہے یا نہیں۔ دہلی کی قدیم تاریخ اور آثار قدیمہ میں دلچسپی رکھنے والے فاضل اساتذہ اور دیگر محققین سے خود کولیئر نے اپنی کتاب میں اس تاج کی پوری کیفیت یا اس کے ٹاٹلر کے نیلام میں خریدنے اور ملکہ وکٹوریا کے ہاتھ فروخت ہونے کی روداد بیان کی ہے یا نہیں، اس بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اسکیلٹن نے اپنے کٹیلاگ میں اس مغل تاج کی تصویر نہیں دی۔ نہ اس کے نہ دیے جانے کی کوئی وجہ بتائی ہے۔ البتہ بہادر شاہ ظفر کی تاج سمیت شاہانہ لباس زیب تن کیے ہوئے (ہاتھ کی) بنی ہوئی ایک اعلا رنگین تصویر سے اس تاج کی نوعیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر دوسری بار امریکہ کے جشن ہند کی نمائش ۱۹۸۵ء جو نیویارک میں میٹروپالیٹن میوزیم آف آرٹ میں منعقد ہوئی تھی، میں رکھی گئی تھی۔ نمائش کے منتظم اور کٹیلاگ کے مرتب مشہور و معروف امریکہ کے چوٹی کے اسلامی مصوری کے متخصص مسٹر اسٹوارٹ کیری ویلش ونڈسر کیسل والے تاج شاہی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس تاج کو ملکہ وکٹوریہ نے نیلام میں پان سو پاونڈ میں خریدا تھا جو صحیح نہیں۔(۵)

اسکیلٹن کی رائے میں شاہی تاج انیسویں صدی عیسوی کے ربع دوم میں کسی یورپین تاج کے نمونہ پر بنایا گیا تھا۔ سونے کے اس تاج میں قیمتی جواہر بٹھائے گئے ہیں۔ اس کی اونچائی ۲۷۰۵ سینٹی میٹر اور اس کا قطر ایک طرف ۱۷۰۷ اور دوسری جانب ۱۶۰۴ سینٹی میٹر ہے۔ اس کے حلقہ اور سونے کے ورق کی دھجیوں کے ابھرے ہوئے تزئینی کام اور حلقے کے اِردگرد جڑے ہوئے فیروزہ، لعل اور ہیرے کے گل بوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاج یورپین تاج کی بعینہٖ نقل نہیں ہے۔ ان دھجیوں کے سرے پر موتی اور زمرد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چسپاں ہیں جن سے بڑے جالی دار زمرد پارے اور چھوٹی فلزی لڑیاں آویزاں ہیں۔ ہیرے سے جڑے سونے کے ورق کی بنی ہوئی ایک دوسرے سے آمنے سامنے ہو کر ملی ہوئی دو کمانوں کے اوپری حصے کے درمیان موتی، زمرد اور لعل لگے ہوئے سفید پروں کے ایک سونے کی آراستہ پیراستہ کلاہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرہ میں بھی چھوٹی فلزی لڑیاں آویزاں ہیں۔ تاج کے اندرونی حصے میں قرمزی رنگ کی مخمل اور سفید سوت کے کپڑے کی استرکاری میں گل بوٹوں کی تزئین اور آرائش کا نہایت عمدہ اور خوبصورت کام ہے(۶)۔ افسوس کہ کٹیلاگ میں اس تاج کی تصویر نہیں دی گئی۔ بقول اسکیلٹن یہ تاج اُس تاج سے ملتا جلتا ہے جو مذکورہ بالا نیویارک کی نمائش والی رنگین تصویر میں بادشاہ نے پہنا ہے(۷)۔ اسٹوارٹ کیری ویلش کی رائے میں تصویر کا تاج وہی ہے جو اب ملکہ برطانیہ کی مِلک ہے(۸)۔ بہرحال اس تصویر کے تاج سے اصل تاج شاہی کی نوعیت اور کیفیت کا کافی حد تک اندازہ ہو سکتا

ہے۔لندن کے کٹیلاگ میں بھی اس تصویر کا عکس دیا گیا ہے لیکن وہ اتنا واضح نہیں۔ اس سے قبل یہ تصویر دو نمائشوں کے کٹیلاگ میں شایع ہو چکی تھی۔ پہلی بار ۱۹۸۷ء میں کیمبرج (میسے چیوسٹس امریکہ) کے ہارورڈ میوزیم آرٹ کی نمائش کے کٹیلاگ میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۵ء کے جشن ہند امریکہ کی نیویارک میٹروپالیٹن میوزیم آف آرٹ میں منعقدہ نمائش کے کٹیلاگ میں۔ موخر الذکر کٹیلاگ کی نہایت خوبصورت اور واضح تصویر سے اس مغل تاج کی ہو بہو کیفیت نظر کے سامنے آ جاتی ہے یہاں تک کہ تاج کے وہ چھوٹے چھوٹے اجزا بھی، جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، واضح طور پر نمایاں ہیں اور اصل تاج کیسا ہے، اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ یہی تاج بہادر شاہ ظفر نے اپنی تاج پوشی کے دن پہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ تصویر لال قلعہ کے خاص محل (تسبیح خانہ) کے میزان عدل والے محجر کے پس منظر میں ۱۲۵۴ھ کے ماہ ربیع الاول میں یعنی تاج پوشی سے آٹھ ماہ قبل بنائی گئی تھی۔ جیسا کہ میزان عدل کی محرابوں پر نقش شدہ کتبے کی عبارت سے ظاہر ہے(۹)۔ یہ تصویر اب امریکہ کے نیلیگٹن ذخیرے میں محفوظ ہے جو مسٹر اسٹوارٹ کیری ویلش کی ملک میں تھا اور اب ہارورڈ میوزیم آف آرٹ میں ہے۔ ویلش نے جشن ہند امریکہ کے اپنے مرتب کردہ کٹیلاگ میں اسے بہادر شاہ کی تخت نشینی کی تصویر قرار دیا ہے(۱۰)، جو صریحاً غلط اور ناقابل اعتبار ہے۔ تصویر دیکھ کر کوئی بھی شخص بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں دکھایا ہوا منظر تاج پوشی یا تخت نشینی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بادشاہ کی اپنے ولی عہد اور دوسرے شاہزادے اور ایک ذی مرتبہ حواری کی ایک غیر رسمی نجی صحبت کا منظر پیش کرتی ہے جس میں بادشاہ حقہ نوش فرماتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ تاج پوشی یا تخت نشینی کی تقریب دیوان عام وخاص (عرف عام میں دیوان عام) میں منعقد ہوتی تھی جس میں وزیر اعظم اور دیگر وزرا سے لے کر بڑے بڑے امیر امرا، اعیان وعمائد، منصب دار، درباری، شہر کے ہر طبقے کے نمائندے وغیرہ حضور یاب ہوتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویر میں بہادر شاہ نے جو تاج شاہی سمیت مکمل زرق برق شاہانہ لباس زیب تن کیا ہے وہ وہی ہوگا جو تاج پوشی کے دن پہنا ہوگا اور غالباً اسی لئے ویلش اس غلط فہمی کے مرتکب ہوئے کہ یہ تصویر تاج پوشی کی ہے۔ یہ تصویر کیوں اور کس موقعے پر بنائی گئی اس بارے میں کسی قیاس کی گنجائش نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سراغ دربار معلیٰ کے اخبارات، روزنامچے اور اس قسم کے دیگر سرکاری کاغذات اور دستاویزات میں ملے لیکن ان کو کھنگالنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اس تصویر میں بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ولی عہد مرزا محمد فخر الدین، شاہزادہ مرزا فرخندہ اور بقول اسٹوارٹ کیری ویلش ایک مورچھال بردار ملازم (لیکن میری رائے میں جیسا کہ سطور آیندہ میں بیان کیا جائے گا) کی شناخت، ان کے نام اور القاب کے ذریعے مذکورہ بالا کتبے کی عبارت سے کی گئی ہے، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اس اہم کتبے کی پوری عبارت قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کتبہ حسب ذیل ہے۔(۱۱)

(الف) میزان عدل کے نیچے اور کمان والا بہادر شاہ کا کتبہ

''شبیہ مبارک حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی بادشاہ جم جاہ [ملا] یک سپاہ شہریار ظ ل (کذا

=ظل) اللہ لاسلام (کذا = اسلام) پناہ مروج دین محمدی رونق افزای ملت احمدی سلالۂ خاندان گورکانی نقاوۂ / دودمان صاحبقرانی خاقان المعہ ظم (کذا = المعظم) شاہنشاہ الاعظم، الخاقان/ابن الخاقان السلطان ابن السلطان صاحب المفاخر و المغہ ازین (کذا = المغازی)/ ولیعت (کذا = ولینعمت) حقیقی و خداوند مجازی ابو المظفر سراج او الدین (کذا = سراج الدنیاوالدین) محمد بہادر شاہ بادشاہ غازے خہ الد (کذا = خلد) ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ (کذا = برہ) واحسانہ"۔

(ب) بائیں طرف ولی عہد بہادر کا کتبہ (دیوان میں طاقچہ پر)

"شبیہ صاحب عالم (و) عالمیان مرشد زادۂ جہان نیان (کذا = جہانیان) ممبرزا (کذا = مرزا) محمد فخر الدین فتح المما لک شاہ بہادر دام حشمتہ وجہا (کذا = جاہہ)"

(ج) دائیں جانب شاہزادہ کے اوپر والا کتبہ

"شبیہ مرشدزادۂ آفاق مرزا فرخندہ بہادر"

(د) دائیں طرف مور چال بردار حواری کا کتبہ (دیوان میں طاقچہ پر)

"در ماہ ربیع الاول ۱۲۵۴ ہجری مطابق سنہ احد جلوس معلی۔ نواب، فرزند لئیق، رکن السلط نت (کذا = السلطنت) اعظم الامراء جمسد (کذا = جمشید) الدولہ دبیر الملک مرزا رفل بیگ خان بہادر نصرت جنگ"

بہادر شاہ ظفر اور دو شاہزادوں کی ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں بنی ہوئی یہ ایسی ہو بہو تصویر ہے گویا کیمرہ سے کھینچی ہوئی رنگین تصویر ہے۔ اس میں بادشاہ ٹھاٹھ باٹ والا رسمی شاہی لباس اور سر پر جواہر جڑا ہوا تاج، موتیوں کے ہار، بازوبند، پہونچیاں، بائیں ہاتھ میں انگشتری وغیرہ زیب تن کئے ہوئے ہے۔ ان کا چیغہ، فرجی (بغیر آستین والا بالا پوش)، شلوار، کمر بند، پٹکا وغیرہ خوش اسلوبی سے بہترین اور قیمتی جنس کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ ایک چوڑی اور کچھ نیچی سی کرسی پر بیٹھے حقہ نوش فرما رہے ہیں۔ کرسی کے دونوں بازووں کے پیروں کو دو سروں سے مضبوط بنایا گیا ہے جبکہ اس کے بازووں میں بھی کسی جانور کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ کرسی جس پر قرمزی رنگ کے مخمل کا استر لگا ہوا ہے خاص محل کے میزان عدل کے مجرے سے لگی ہوئی ہے۔

بادشاہ کی دائیں جانب ولی عہد بہادر دونوں ہاتھ میں عصا پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان کا نام مرزا محمد فخر الدین (۱۲) اور لقب فتح المما لک بتایا گیا ہے۔ یہ بھی کم وبیش بادشاہ کی طرح رسمی لباس میں سر پر تاج پہنے ہوئے ہیں۔ دوسرے شاہزادے مرزا فرخندہ بہادر کا لباس اتنا زرق برق نہیں نظر آتا۔ کرسی سے ذرا ہٹ کر بائیں جانب ایک ادھیڑ عمر کا خوبصورت گورا چٹا شخص کھڑا ہے جس کی تعبیر ویلش نے مور چال بردار ملازم سے کی ہے۔ اس کی شناخت والے منقولہ

بالا کتنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ شخص کوئی شاہی ملازم نہیں بلکہ ایک اعلا فرنگی یا انگریز افسر ہے۔ مغل دور کی تاریخ سے واقف حضرات سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ شاہی دربار کے رسم ورواج اور تکلفات میں مور چال پنکھا وغیرہ لے کر بادشاہ کے حضور میں کھڑے رہنا اور اس قسم کی دیگر خدمات انجام دینا باعث فخر وعزت سمجھا جاتا تھا اور یہ شرف صرف مقرب الحضرت امیروں اور منصب داروں کے لئے مخصوص تھا۔

لیکن یہ شخص یا انگریز افسر کون ہے یہ کہنا آسان نہیں۔ اس دور کی تاریخ کے محققوں سے اس سلسلے میں استفسار کرنے پر راقم سطور کو کوئی خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ کتبے میں اسے نواب، فرزند لیئق، رکن السلطنت، اعظم الامرا، جمشید الدولہ، دبیر الملک، نصرت جنگ جیسے بڑے القاب سے یاد کیا گیا ہے اور اس کا نام رفل بیگ خان بہادر بتایا ہے۔ اس لئے یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے جسے ویلش نے ہاتھ میں مور چال دیکھ کر ایک ملازم کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے القابات اس بات کے مظہر ہیں کہ وہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک اعلا افسر ہے۔ اس کے لباس اور سر پر ہیٹ سے وہ کوئی انگریز افسر لگتا ہے۔ اس القاب والے غدر سے پہلے مغل دربار سے وابستہ ہونے یا تعلق رکھنے والے کسی برٹش افسر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ میرے کرم فرما اور بزرگ دوست، غالب اور اس کے عہد کے مشہور ومعروف ماہر جناب مالک رام مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ پہلے ایک صحبت میں کہا تھا کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جمشید الدولہ نام کے کسی شخص کا نام غالب کے ایک فارسی قصیدے میں آتا ہے۔ لیکن ان کی پیرانہ سالی، صحت کی نادرستی، آنکھوں کی کمزوری وغیرہ کی وجہ سے وہ مزید معلومات فراہم نہ کر پائے۔ غالب کے فارسی کلام تک میری سردست رسائی نہ ہونے کے باعث میں بھی اس بارے میں تحقیق نہ کر سکا۔ اگر قارئین میں سے کسی صاحب کو اس افسر کے بارے میں کوئی جانکاری مل سکے تو مطلع فرمائیں۔

مختصراً یہ تصویر بہادر شاہ ظفر کے شاہانہ لباس اور ان کے طرز زندگی کے کچھ پہلوؤں کی جھلک پیش کرنے والی ایک اہم مستند تاریخی دستاویز ہے۔ اس میں دی گئی تاج شاہی کی تصویر بھی خاص اہمیت کی حامل ہے اس لئے بھی کہ یہ تاج ایک عرصے تک پردۂ گمنامی میں تھا اور اب بھی اس تک رسائی بہت مشکل ہے اور عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے اور نہ جانے کب تک اوجھل رہے گا۔ کم از کم اس نقطۂ نظر سے آخری مغل شہنشاہ کا تاج کیسا تھا، اس کی اچھی خاصی جھلک اس تصویر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ مسٹر اسکیلٹن نے اصل تاج اور اس تصویر والے تاج میں بہت معمولی فرق ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسے مصور کے قلم کی لغزش پر محمول کیا جا سکتا ہے یا ہو سکتا ہے اصل تاج غدر کے بعد انگریز یا ہندوستانی سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑنے سے لے کر ملکۂ وکٹوریا تک پہنچتے ہوئے کئی ہاتھوں سے گزرنے کے نتیجے میں اس کی لڑیوں، دھجیوں، طرے کے پروں جیسے اجزا متاثر ہوئے ہوں جس کی وجہ سے اسکیلٹن کو یہ خیال گزرا۔

آخر میں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۹۷ء کے غالباً مارچ کے انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی کے مشہور ہفتہ وار 'ہماری زبان' کے کسی شمارے میں اس تصویر کی نقل شایع ہوئی تھی لیکن وہ کہاں ہے اور کس طرح دستیاب ہوئی

اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے نہ تصویر کے بارے میں کچھ لکھا گیا تھا۔ میں نے یہ مضمون لکھتے وقت اپنے دوست ڈاکٹر خلیق انجم کو اس تصویر پر روشنی ڈالنے کی گزارش کی لیکن میرا خط یا تو ان کو ملا نہیں یا اپنی گوناگوں مصروفیات کے پیش نظر وہ جواب نہ دے سکے۔ ابھی ابھی (نومبر ۲۰۰۱ء کے اواخر میں) جہانگیر کے عہد کی مغل مصوری کے ماہر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ڈاکٹر اشوک کمار داس نے مجھے بتایا کہ نیلینگٹن ذخیرے والی تصویر کی نقل حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ بہت ممکن ہے 'ہماری زبان' میں شائع شدہ تصویر یہی ہو۔

حواشی

۱۔ یہ مضمون ۱۹۹۷ء کے اواخر میں نئی دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ 'غالب اور اس کا عہد' سے می نار کے لئے مقالے کی شکل میں انگریزی لکھا گیا تھا۔ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر مقالہ پڑھا نہ جا سکا لیکن منتظمین سے می نار نے اس کے اچھوتے موضوع کے پیش نظر سے می نار کے مقالوں کے مجموعہ 'بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد' میں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا (نئی دہلی ۱۹۹۸ء)۔ مترجم کی انگریزی زبان سے قطعی ناواقفیت کی وجہ سے یہ ترجمہ ایسا لگتا ہے کہ اردو میں نہیں لیکن کچھ عجیب سی اردو نما زبان میں ہے۔ میں نے موضوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے معمولی رد و بدل اور حذف و اضافے کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

۲۔ The Indian Heritage: Court Life and Arts Under Mughal Rule, London, 1982.

۳۔ اس نمائش کا کیٹلاگ بہ عنوان :

Kind of the World The Padshah Nama by Milo Beach and Ebba Koch, 1997 شائع ہوا ہے۔

۴۔ Robert Collier: The Indian Mutiny, London, 1996 p 109. no 307.

۵۔ Stuart Cary Welch: India Art and Culture, 1300-1900. p 428, no 284 New York 1985.

۶۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے :

The Indian Heritage, p 109

اور India Art and Culture, p 428

۷۔ The Indian Heritage, p 109

۸۔ India Art and Culture، تصویر نمبر ۲۸۴

۹۔ دیکھیے کتبے کا متن (۵)۔

۱۰۔ India Art and Culture, p 428

۱۱۔ ایضاً تصویر نمبر ۲۸۴۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ کتبے کے متن کو لکھنے میں مصور املا کی کئی غلطیوں کا مرتکب ہوا ہے۔ عام طور پر مصور عربی فارسی سے ناواقف یا کماحقہ واقف نہ ہونے کی وجہ سے ان غلطیوں کا پایا جانا باعث تعجب نہیں ہے۔

۱۲۔ تھامس ویلیم بیل اپنی فارسی کتاب مفتاح التواریخ، ص ۳۹۴ میں ولی عہد کا نام مرزا غلام فخر الدین بتاتا ہے جو غالباً صحیح نہیں ہے۔

پروفیسر نادم بلخی

جھارکھنڈ کے قبائل اور چیرو : ایک حکمراں قبیلہ

بہار کے بٹوارہ سے قبل چھوٹا ناگپور کا شمار بہار کے پچھڑے علاقوں میں ہوتا رہا۔ بٹوارے کے بعد بہار کا وہ حصہ جو چھوٹا ناگپور کہلاتا تھا، آج جھارکھنڈ کے نام سے ایک صوبے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس پورے حصے میں جتنے قبائل ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۹ ہے جن کی اپنی الگ الگ بولیاں ہیں اور ان بولیوں کا تعلق الگ الگ لسانی خاندانوں سے ہے۔ کچھ قبیلوں کی بولیوں کا تعلق اسٹرو ایشیائی نسل سے ہے تو کچھ کا ہند-آریائی نسل سے۔ اور چار عدد ایسے قبیلے ہیں جن کی بولیاں ڈراویڈی لسانی خاندان سے متعلق ہیں۔ تیرہ ایسے قبیلے ہیں جن کی بولیوں کا تعلق اسٹرو ایشیائی لسانی خاندان سے ہے یا ان میں کسی پر ہند-آریائی نسل کا بھی اثر ہے۔

اسٹرو ایشیائی لسانی نسل سے تعلق رکھنے والے قبیلے مجموعی طور پر ۱۳ ہیں وہ اور ان کے علاوہ دوسرے قبیلے درج ذیل ناموں سے پکارے جاتے ہیں :

قبیلے	بولی کا نام	لسانی خاندان	کیفیت
۱۔ اسور (ASUR)	اسوری	اسٹرو ایشیائی	
۲۔ برہور (BIRHOR)	مُنڈائی شاخ کی ایک بولی	اسٹرو ایشیائی	یہ خانہ بدوش قبیلہ ہے
۳۔ بھونج (BHUNJ)	مُنڈاری/سدانی	اسٹرو ایشیائی	ہند-آریائی مخلوط
۴۔ ہو (HO)	ہو	اسٹرو ایشیائی	
۵۔ کرمالی (KARMALI)	کرمالی	اسٹرو ایشیائی	
۶۔ کَروا (KORWA)	کَروا	اسٹرو ایشیائی	مُنڈاری کی ایک شاخ
۷۔ کورا (KORA)	کورا	اسٹرو ایشیائی	مُنڈاری کی ایک شاخ
۸۔ کھریا (KHARYA)	کھریا	اسٹرو ایشیائی	
۹۔ مُنڈا (MUNDA)	مُنڈاری	اسٹرو ایشیائی	
۱۰۔ سوار (SEVAR)	کھریا	اسٹرو ایشیائی	
۱۱۔ محلی (MAHLI)	محلی	اسٹرو ایشیائی	
۱۲۔ سنتھالی (SANTHALI)	سنتھالی	اسٹرو ایشیائی	
۱۳۔ چیرو (CHERO)	منڈاری	اسٹرو ایشیائی	بولی کوئی نہیں، ملی جلی بولی استعمال کرتے ہیں

۱۴۔ بیگا(BAIGA)	سدانی	ہند آریائی	
۱۵۔ بنجرا(BANJRA)	سدانی	ہند آریائی	
۱۶۔ بیدا(BAIDA)	سدانی	ہند آریائی	
۱۷۔ بھنجیا(BHUNJIA)	سدانی	ہند آریائی	
۱۸۔ برجیا(BIRJIA)	سدانی	ہند آریائی	بنگالی مخلوط
۱۹۔ چک بریک(CHAK BRAIK)	سدانی	ہند آریائی	
۲۰۔ گریت(GORAIT)	سدانی	ہند آریائی	
۲۱۔ کھروار(KHARWAR)	سدانی	ہند آریائی	
۲۲۔ کسن(KISAN)	سدانی	ہند آریائی	
۲۳۔ لوہرا(LOHRA)	سدانی	ہند آریائی	
۲۴۔ پرہیا(PARAHIA)	سدانی	ہند آریائی	
۲۵۔ بھٹوڈی(BHATOUDI)	مخلوط	ہند آریائی	
۲۶۔ گونڈ(GOND)	گونڈ	ڈراویڈی	
۲۷۔ مال پرہیا(MAL PARAHIA)	مالتو	ڈراویڈی	
۲۸۔ اوراوں(ORAON)	کُرکھ(KURKH)	ڈراویڈی	
۲۹۔ سوریا پرہیا(SURIA PARAHIA)	مالتو	ڈراویڈی	

ان مختلف قبیلوں کی جتنی بولیاں ہیں ان پر کھڑی بولی کا بھی اثر ہے جس کے نتیجے میں اردو کے ذریعہ کہیں کہیں عربی کے توسط سے سامی النسل خاندان کے الفاظ بھی آ گئے ہیں۔

ان بھاشاؤں کا جو یہاں کے قبیلے بولتے ہیں اب تک کوئی اپنا خاص رسم الخط نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ یہ تمام بولیاں زبان کی حیثیت نہیں اختیار کر سکیں یعنی انگریزی میں جنھیں DIALECT اور LANGUAGE کہتے ہیں، اس اعتبار سے ان قبیلوں کی بولیوں کو ہم LANGUAGE نہیں کہہ سکتے۔ یہاں کے قبیلوں کی بولیوں کو انگریزوں نے اپنے عہد میں رومن رسم الخط دیا اور اب آزادی کے بعد ہندی جو بھارت کی قومی سرکاری زبان ہے، اس میں لکھا جانے لگا۔

مذکورہ بالا تمام قبیلوں میں ایک ایسا قبیلہ ہے جو یہاں کی تاریخ میں حکمراں قبیلے کی حیثیت رکھتا ہے جس کا نام چیرو(CHERO) ہے۔

چیرو قبیلے سے کیا مراد ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ یعنی یہ چیرو کیوں کہلاتے ہیں اور ان کے بارے میں کتابوں میں کیا کیا پایا جاتا ہے۔ یہ مختصر طور پر نیچے درج کیا جا رہا ہے۔

چیرو لوگ چیرس یا چیراس بھی کہلاتے ہیں۔ جس طرح جھارکھنڈ کا ایک قبیلہ کھروار اٹھارہ ہزاری کہلاتا ہے اسی طرح چیرو قبیلہ بارہ ہزاری کے نام سے بھی موسوم ہے۔ پلاموں کے چیرو لوگوں کی اپنی ایک خاص تاریخ ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ان کی حیثیت ایک شاہی خاندان (ROYAL DYNESTY) کی ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے پورے غیر منقسم بہار میں ان کی آبادی ایک لاکھ تیرہ ہزار تین سو انتالیس تھی جس میں ضلع پلاموں میں سترہ ہزار چھ سو اٹھارہ، شاہ آباد میں گیارہ سو پچاسی، چمپارن میں دو سو بیاسی، گیا میں ۱، مونگیر میں ۱۸۲، رانچی میں ۶۵ اور سنتھال پرگنہ میں ۴ —— مختصر یہ کہ پلاموں کو چھوڑ کر غیر منقسم بہار کے دیگر اضلاع میں ان کی حیثیت اقلیتی رہی ہے۔ پلاموں ضلع میں ڈالٹین گنج میں 5342، برواڈیہہ میں 2842، لاتہار میں 2526، پاٹن میں 2082، بھوناتھ پور میں 1576، لسلی گنج میں 1744، اور ان کے علاوہ پلاموں کے دوسرے تھانوں میں بھی ان کی آبادی کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہے۔

۱۷ویں صدی کے آغاز میں چیرو لوگ شہاباد رائے کی سرکردگی میں پورے بھوج پور کے مالک تھے۔ اس کی سرکردگی میں ان لوگوں نے ۱۶۱۱ء میں چمپارن پر قبضہ کیا اور ۱۶۱۳ء میں بھگونت رائے کی سرکردگی میں یہ لوگ پلاموں پر قابض ہوئے۔ چیرو قبیلے کی پلاموں میں حکومت کا خاتمہ ۱۸۱۸ء میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۳۲ء اور ۱۸۵۷ء کی شورشوں میں دوسرے قبیلوں خصوصاً کھروار قبیلے کے ساتھ مل کر انہوں نے پہلے مغلوں اور بعد میں برٹش راج ہونے کے بعد انگریزوں کے خلاف بھی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ روایتوں کے مطابق بھوج پور میں آنے سے قبل چیرو لوگ مورانگ (کمایوں) پر قابض تھے۔ انگریز اہل قلم میں کرنل ڈالٹن، فاربس، گراہم، رسلی، سنڈر وغیرہ نے چیرو لوگوں سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ تاریخ میں درج ہے۔

ایک عام بیان کے مطابق چیرو لوگوں کا خود اپنے وجود کے بارے میں بھی خیال ہے جس کا تعلق ان کی نسلی حیثیت سے ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کس طرح چیرو کہلائے۔ کیتو نارائن سنگھ گھر گومتی کا ایک بندھیا راجپوت تھا۔ اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی اور چوں کہ وہ اکلوتی بیٹی تھی وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے تاکہ وہ اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ کر سکے چنانچہ ایک برہمن کو بلوا کر اس کی جنم کنڈلی بنوانے کا حکم دیا۔ برہمن نے جنم کنڈلی بنائی۔ جس کے مطابق اس نے یہ کہا کہ جوان ہونے پر اس کی شادی سوائے مُنی (MUNI) کسی دوسرے کے ساتھ نہ ہو یا ہو تو ایسے کے ساتھ ہو جو دیکھنے میں مُردہ معلوم ہو۔ برہمن کی بنائی ہوئی کنڈلی اور اس کی باتوں کو مدنظر رکھ کر راجا نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی متبرک آشرم میں جا کر اپنی بیٹی کو سب سے پہلے ملنے والے مُنی کی خدمت میں پیش کرے۔ جب وہ بیٹی کو لے کر روانہ ہوا تو مُرانگ سے گزر رہا تھا۔ درختوں کے جُھنڈ میں اس نے قیام کیا۔ قریب میں ایک ٹیلہ نظر آیا۔ اس کے بارے میں مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ پتا چلا کہ یہ ٹیلہ ایک زندہ مُنی کا مدفن ہے۔ راجا کے لئے یہ ایک اچھی خبر تھی۔ چنانچہ اس نے بیلچہ کدال منگوا کر اس مقدس انسان کو زمین سے باہر نکالا۔ وہ شخص نکلتے ہی عبادت میں مصروف نظر آیا۔ جیسا کہ جنم کنڈلی بنانے والے برہمن کی پیش گوئی تھی۔ راجا نے سمجھا کہ اس کی بیٹی کے مستقبل کا آقا یہی مقدس شخص ہے۔

چنانچہ راجا نے اس سے شادی کر دی اور اپنے دیس لوٹ آیا۔ راجا کے جانے کے کچھ دیر بعد مقدس مُنی کی تنہائی اور عبادت میں کوئی خلل اس لڑکی کے سبب نہیں پڑا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دھیان سماوی اور ارضی دنیا کی طرف جانے لگا۔ وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ پوچھا تم کون ہو؟ کس طرح آئی ہو؟ آنے کا مقصد کیا ہے؟ سارے سوالات کے مناسب جوابات لڑکی نے دیئے۔ اور لڑکی کی شخصیت سے مطمئن ہو کر مُنی نے زہد و تقوا بھلایا چنانچہ بغیر کسی رسم کی ادائیگی کے اس لڑکی سے شادی کر لی۔

اس شادی سے چیرو یعنی چوہان بنسی راجپوتوں کی نسل چلی جو "چاند والوں کی اولاد" کہلاتی ہے۔ مقدس مُنی سے اس کو تین بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے لڑکے کا نام CHYT RAI تھا۔ اس وقت مرانگ کے حکمراں طبقہ میں راجپوت لوگ تھے جو خود کو راٹھور یا لاتھور کہتے تھے۔ چیت رائے جب وہاں پہونچا تو اس علاقے کے سرداروں کو کھدیڑ کر گدی پر خود قابض ہو گیا اور اپروپ داس نامی ایک شخص کو اپنا دیوان بنایا۔ مرانگ سے چیت رائے کمایوں گیا۔ وہاں کے راجا کو ہرا کر اس پر قبضہ کیا۔ اس علاقے کا راجا بھی راجپوت ہی تھا۔ کمایوں سے چیت رائے کا لڑکا پھول چند چیرو لوگوں کی ایک بڑی فوج لے کر بھوج پور روانہ ہوا اور اس پر قبضہ کیا۔ وہاں چیرو لوگوں کی حکومت سات پشتوں تک رہی۔

اوپر کے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چیرو قبیلہ جنگجو اور حکمراں قبیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آگے کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ ان میں حکومت کرنے کی حوصلہ مندی رہی۔ ان کو غلامی اور ماتحتی کبھی پسند نہیں آئی اور اپنی خودمختاری کے لئے ہمیشہ وہ جنگ کرتے رہے۔ ان کی تاریخ یہ کہتی ہے کہ ان کا ہر خاندان ایک فوجی گروپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ پلاموں میں بھی ان کا یہی حال رہا۔ لیکن انہوں نے امن پسندی اور کاشتکاری کو بھی مدنظر رکھا۔

چیرو لوگ مسطح اور میدانی علاقوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور ایسی جگہوں میں ان کی آبادی زیادہ پائی جاتی ہے جیسا کہ کرنل ڈالٹن نے ANTHOLOGY OF BENGAL 1872 میں لکھا ہے۔ چیرو لوگوں میں صرف غریب ہی ہل تھامنا پسند کرتا ہے ورنہ کوئی بھی سر پر مٹی ڈھونا نہیں چاہتا۔ ڈالٹن آگے لکھتا ہے کہ ان میں لوگ نمائش پسند اور غیر محتاط بھی نظر آتے ہیں جس کے سبب وہ مقروض بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہو سکتی ہے لیکن اس کے بعد کے حالات ایسا ظاہر نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ان میں کام کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ کھپر پوش مکانوں میں ہی نہیں رہتے بلکہ پختہ مکانوں میں بھی رہنا پسند کرتے ہیں جس کے اندر صحن، آنگن، برآمدے اور مردانہ اور زنانہ حصہ بھی ہوتا ہے۔ مویشی خانہ بھی ہوتا ہے۔ مہمان خانہ بھی ہوتا ہے۔ مودی خانہ (STORE ROOM) خواب گاہ بھی۔ ہر کنبہ کے پاس زراعت کے سامان بھی ملتے ہیں۔

پلاموں کے چیرو لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں ایک بارہ ہزاری اور دوسرا تیرہ ہزاری کہلاتا ہے۔ اپنے اگلے سرداروں کی نسل سے تعلق رکھنے والے کچھ چیرو خود کو 'بابوان' کہتے ہیں جن کا تعلق بارہ ہزاری سے ہے۔ یہ لوگ دوسرے چیرو لوگوں سے خود کو اعلا اور افضل سمجھتے ہیں۔ تیرہ ہزاری چیرو BIR BANDIA بھی کہلاتے ہیں۔ فاربس یہ لکھتا ہے کہ ان

لوگوں کی نسل بارہ ہزاریوں کی پھٹ وال شاخ ہے۔ ان کی اپنی کہانی کے مطابق BIR BANDIA چیرو خاص نسل سے نکالی ہوئی ایک شاخ ہے۔ جس سے متعلق یہ کہانی ہے کہ ایک دولت مند چیرو جو BIR BANDIA میں رہتا تھا، ایک دن اس نے اپنے تمام چیرو دوستوں کی دعوت کی۔ وہ لوگ جب دعوت کھانے آئے تو میزبان کو کھڑاؤں پہنے ہوئے دیکھا جو پروسے ہوئے کھانے پر گھی ڈال رہا تھا۔ یہ دیکھ مہمانوں کو غصہ آیا۔ وہ گھر چھوڑ کر نکل گئے اسی وقت سے چیرو لوگوں کی دو شاخ ہوگئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ذات سے نکالے ہوئے چیرو لوگوں کی نسل داشتہ سے ہے لہذا نجیب الطرفین چیرو ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور سماج میں ان کا مقام نیچا سمجھا جاتا ہے۔

چیرو لوگوں کے بارہ ہزاری یا تیرہ ہزاری گروپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اپنے اندر بارہ متوازی شاخیں رکھتے ہیں۔ جسے وہ لوگ سنتھالوں کی طرح ''پارس'' کہتے ہیں۔ ان بارہوں کے نام معلوم نہیں مگر چند کے نام یہ ہیں :

۱۔ چھوٹا موار ۲۔ بڑا مواد ر ۳۔ مہتو ۴۔ منجھیا ۵۔ سموات وغیرہ۔

رسلی نے جو نام گنوائے ہیں وہ سب پلاموں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کے کہنے کے مطابق پارس ان کا خطاب ہے۔ ان لوگوں کے یہاں چچیرے ممیرے میں بھی شادی نہیں ہوتی۔ LAND AND BELT OF TRIBAL BIHAR نامی کتاب میں ڈاکٹر نر بدیشور پرشاد نے کچھ اور روشنی ڈالی ہے۔ سنڈرس کے مطابق چیرو لوگوں میں سموات اور مواد ر میں شادی ہو سکتی ہے لیکن مہتو، منجھیا، راوتیا میں شادی نہیں ہو سکتی۔ سنڈرس نے جو کچھ لکھا ہے آج کے چیرو لوگ اس کے قول کی تردید کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں وراثت مردوں سے چلتی ہے۔ غریب چیرو لوگوں کے یہاں لڑکوں کو آپس میں برابر تر کہ ملتا ہے اور امیروں کے یہاں بڑے لڑکے کو زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اگر ان کے یہاں کسی باپ کو صرف بیٹی ہے اور بیٹا نہیں، تو بیٹی کو بطور تحفہ جائداد ملتی ہے۔ ان کے یہاں ہر طرح کے کنبے پائے جاتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی کا بھی ان کے یہاں رواج ہے۔ دوسرے قبیلوں کی طرح ان کے یہاں نوجوانوں کے لئے اکھاڑا نہیں لیکن ناچ گانے کے موقع پر عورت ہو یا مرد — دونوں حصہ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں آپسی جھگڑے لڑائی اور سماجی مسائل کو پنچایت کے ذریعے حل کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی پنچایتیں گانو، حلقہ اور ضلع کی بنیاد پر ہوتی ہیں اور ان کا سردار مکھیا کہلاتا ہے۔ لیکن ضلعی نوعیت کی پنچایت کا رکن اعلا سبھاپتی کہلاتا ہے۔ پنچایتوں میں بزرگ لوگ حصہ لیتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد ایک مقررہ وقت تک عورت اور مرد خود کو نجس سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لئے یہ مدت تیرہ دنوں اور مردوں کے لئے بارہ دنوں کی ہوتی ہے۔ مدت گزرنے کے بعد گھر کے افراد اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ گھر کی صفائی دُھلائی ہوتی ہے۔ خود بھی غسل کر کے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ بچے کا نام برہمن رکھتا ہے جس کے لئے اُسے بخشش دی جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ خود ہی لڑکے کا نام رکھتے ہیں۔ لڑکا جب پندرہ یا سولہ برس کا ہوتا ہے تو اس کی شادی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی

شادی کی عمر میں فرق ہوتا ہے۔سنڈرس اس کے بارے میں یوں لکھتا ہے۔لڑکے والے کی طرف سے رشتہ داروں میں سے کوئی خاص شخص یہ کام انجام دیتا ہے جسے 'اگوا' کہتے ہیں۔اُس وقت اگر کوئی بُری علامت ظاہر ہوئی تو بات چیت ختم ہو جاتی ہے۔کھرواروں کی طرح شادی کی تاریخ طرفین سے طے ہوتی ہے۔کپڑے، مٹھائیاں اور دوسری چیزیں دی جاتی ہیں۔شادی دو طرح سے انجام پاتی ہے جسے ڈولہ اور چدرہ کہتے ہیں۔پہلے طریقے کے مطابق شادی لڑکی والے کے یہاں جا کر ہوتی ہے۔دوسرے طریقے کے مطابق لڑکے والے کے یہاں لڑکی لے جائی جاتی ہے اور پھر شادی ہوتی ہے۔ دونوں طریقوں میں شادی کی رسم ایک ہی ہوتی ہے۔شادی عام ہندو رسم و رواج کے مطابق ہوتی ہے۔دولھا اور دولھن منڈپ میں طواف کرتے ہیں۔سنڈرس لکھتا ہے کہ ان کے یہاں روحانی پیشوا برہمن اور گھر یاری لوگ سائیں کہلاتے ہیں۔ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پوجا کے وقت ان کا تعلق برہمنوں سے ہوتا ہے۔جو سکل دیپی یا قنوجیا ہوتے ہیں۔

چیرو قبیلہ کی سیاسی زندگی اور حکمرانی سے متعلق باتیں بعد میں عرض کی جائیں گی۔پہلے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی راجدھانی کے بارے میں قارئین کو کچھ بتایا جائے اور اس ضمن میں پلاموں کے دو قدیم قلعوں کے بارے میں کہنا ضروری ہے اس لئے کہ ان کی تاریخی اہمیت ہے۔پلاموں کا موجودہ صدر مقام ڈالٹن گنج ہے۔اس سے لگ بھگ بیس بائیس میل کے فاصلے پر ایک گھنا جنگل ہے جسے BETLA FOREST کہا جاتا ہے۔آج یہ گھنا جنگل شیر، بھالو، جنگلی ہاتھی اور دیگر جنگلی جانوروں کا مسکن بنا ہوا ہے۔چیرو حکمرانوں کے وقت یہ ایک شہر کی حیثیت رکھتا تھا اور جیسا کہ شری حولداری رام 'پلاموں کا اتہاس' میں لکھتے ہیں کہ یہ جگہ باون گلی اور ترپن بازار کے نام سے مشہور تھی۔یہاں دو پرانے قلعے ہیں۔ایک OLD FORT کہلاتا ہے اور دوسرا NEW FORT۔دونوں سے متعلق ضروری باتیں نیچے درج کی جاتی ہیں۔

OLD FORT- پرانا قلعہ کب بنا اور واقعی کس نے بنوایا اس کے بارے میں مستند تاریخ نہیں ملتی۔تاریخ مگدھ کے مصنف فصیح الدین بلخی اپنے مضمون 'پلاموں کی تاریخی سرگذشت' میں یہی کہتے ہیں۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چیرو قبیلہ کے بزرگ ہی اس کے بانی ہیں، واللہ اعلم۔اس کا مورچہ چوٹی سے تلہٹی تک ہے۔دیواروں کی چوڑائی سات فٹ ہے۔ان پر پانچ فٹ کے چوڑے راستے ہیں جن پر آسانی سے گھوڑے دوڑائے جاتے ہوں گے۔مورچوں میں گولیاں چلانے کے لئے ایسے سوراخ ہیں جن سے باہر کے دشمنوں کو آتے ہوئے بآسانی دیکھا جا سکے۔مورچوں کی دیواروں میں بہت سارے کمرے بنے ہوئے تھے۔پہلے دروازے کا نام ''سنگھ دوار'' کہلاتا تھا۔قلعہ کے اندر الگ الگ گھر الگ الگ نام سے مشہور تھا۔یعنی راج دربار، درباریوں کا گھر، مندر؛ اوپر کی منزل میں راج محل، رانیوں کے رہنے کا محل جو دیواروں سے گھرا ہوا تھا، پانی پہنچانے کے اور نکاسی کے لئے باولیاں اور نالیاں بھی تھیں۔اونچی چوٹی پر گنبد نما محل جس کی اونچائی سے دشمنوں کو دیکھا جا سکے۔اس کی حیثیت ٹاور کی سی تھی۔قلعے میں داخل ہونے پر ایک مسجد بھی ملتی ہے جو مغلوں کی یادگار ہے۔

NEW FORT- نئے یا چھوٹے قلعے کے بارے میں عرض ہے کہ پرانے قلعے سے لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔آج اس کی حیثیت کھنڈر جیسی ہے۔اس کے دو منزلہ مورچے پرانے قلعے کے مورچوں سے زیادہ مستحکم تھے۔

جس میں دوسو کمرے تھے۔ چیرو قبیلے کا مشہور راجا مِدنی رائے (MEDNI RAI) اس کا بانی تھا۔ اس کی بنیاد ۱۶۸۰ سمبت ناگ پنچمی کے دن رکھی گئی تھی۔ دروازے پر کتبے ہیں۔ جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کے لکھنے والے پنڈت شری ونمالی مشر تھے۔ صدر دروازہ چالیس فٹ لمبا ہے۔ مِدنی رائے نے چھوٹا ناگپور کے راجا کی راجدھانی ڈُلیا (DULIA) پر حملہ کیا تو وہاں سے کافی دولت لایا۔ وہاں کے راجا کی شکست اور اپنی فتح کی خوشی میں جب یہ دروازہ بنا تو اس کا نام ''چھوٹا ناگپور دوار'' رکھا گیا۔ قلعہ کے دونوں کونوں میں تین منزلہ ٹاور ہے۔ پہلے ٹاور کے نیچے ایک دائرہ نما کنواں ہے۔ کئی محلوں کی ادھوری بنیادیں ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ادھورے پُل کا کھنڈر ہے۔ اگر یہ قلعہ تیار ہو جاتا تو قابلِ دید یادگار ہوتا۔

پرانے قلعے سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی جھیل ہے جسے ''کمل دہ'' کہا جاتا ہے۔ آج بھی اس جنگل میں یہ جھیل موجود ہے اور اس میں آبی پرندے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ نہر یا جھیل پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھی اور ندی سے ملائی گئی تھی۔ یہاں پر جو پہاڑی ندی ہے وہ ''اورنگا'' کہلاتی ہے۔ اس ندی سے قلعہ تک پانی پہنچانے کے لئے ساٹھ فٹ لمبا تانبے کا پایپ تھا۔ قلعے کے ایک حصے میں ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جو ''ڈوم قلعہ'' کہلاتا تھا۔ وہاں قلعہ کی صفائی اور بانس کی اشیا بنانے والے رہا کرتے تھے۔ کچھ دور ہٹ کر پہاڑ سے گھرا ہوا پختہ گھاٹ کا تالاب تھا۔ پہاڑ کے اوپر ایک دومنزلہ دیو مندر ہے۔ اس قلعے میں ایک لمبی سرنگ تھی جو بند ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سادھوؤں کے لئے جو مکان تھا، اُسے ''منی آشرم'' کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے اور چھوٹے قلعے کے درمیان کا جو پھیلا ہوا حصہ تھا اس میں خوبصورت سا ایک شہر بسا ہوا تھا جسے ''باون گلی'' اور ''ترپن بازار'' کہتے تھے۔ اس نگر کے قریب ایک دومنزلہ عمارت تھی جو اب کھنڈر ہے اس کا نام 'مہاجن قلعہ' تھا۔ یہ بنیوں کے رہنے کی جگہ تھی جو قلعے میں رسد پہنچاتے تھے۔ دکھن کی طرف جنگلوں سے گھری ہوئی ایک پہاڑی آج بھی ہے۔ اسی جگہ فوج رہتی تھی اور اس کی حیثیت فوجی چھاونی کی تھی۔ ہتھیار اور گولے بارود یہاں رکھے جاتے تھے۔ اس چھاونی کا نام دس ہزاری چھاونی تھا۔ اسی جگہ سے پلاموں کا نام ماضی میں روشن ہوا۔ پلاموں جو آج کمشنری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کئی خیالات ملتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ لفظ پل - اِم - او سے بنا ہے۔ جس ندی کے کنارے پلاموں کا قلعہ ہے اس میں دانتوں کی شکل کے پتھر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ڈراوڑین لفظ ہے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے، کہنا مشکل ہے۔ چیرو قبیلے کے لوگوں نے رکسل خاندان کے راجپوت راجا کو ہرا کر پلاموں پر قبضہ کیا۔ اسی خاندان کے پانچویں راجا سہل رائے کی مسلمانوں سے جنگ ہوئی تھی۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس راجا کا بیٹا بھگوت رائے اول پلاموں پر قابض ہوا۔ شاہ جہاں کے عہد میں شایستہ خاں نے ۱۰۴۸ ہجری میں پلاموں پر فوج کشی کی۔ مغلوں کی دوسری لشکر کشی ۱۰۷۰ ہجری میں ہوئی۔ مغلوں کی فوج داؤد خاں قریشی اور راجا بہروز کی سرکردگی میں حملہ آور ہوئی۔ چیرو راجا زبردست فوج دیکھ کر گھبرایا۔ اپنے معتمد سورج سنگھ کو صلح کا پیغام لے کر بھیجا۔ لیکن اسی بیچ داؤد خاں کی رسد چیرو فوج کے فوجیوں نے لوٹ لی۔ چنانچہ جنگ شروع ہو گئی۔ راجا نے مقابلہ کیا مگر ہار گیا۔ داؤد خاں کا قلعے پر قبضہ ہو گیا۔

اس نے منگل خاں کو قلعے اور فوجداری سپرد کی۔ جب مغلوں نے لشکر خاں کو بہار کا صوبیدار بنایا تو پلاموں کی حکومت براہ راست اس کی تحویل میں آئی۔ مغلوں سے جنگ کا تاریخی اہمیت کا حامل نقشا منوں لال لائبریری گیا، میں موجود تھا جس کا حوالہ فصیح الدین بلخی نے تاریخ مگدھ میں دیا ہے۔ چیرو قبیلہ کے جتنے راجا ہوئے اور جتنے دنوں تک انہوں نے حکومت کی، اس کا ذکر مختصر ہی سہی مگر لازمی ہے اور بعد میں کیا جائے گا۔ انگریزوں کے عہد میں چیرو راجاؤں کا کیا حال رہا، اس پر روشنی ڈال دینا ضروری ہے۔

۱۷۲۱ء کے قریب چیرو راجاؤں میں سلطنت کے لئے جھگڑا ہوا۔ جے کشن رائے نے رنجیت رائے کو مار ڈالا۔ اس کے لوگوں نے جے کشن رائے کو قتل کر کے چھتر جیت رائے کو راجا بنایا۔ گوپال رائے نے پٹنہ جا کر کیپٹن کینک سے مدد طلب کی۔ چنانچہ انگریزوں کی توپیں اور فوجیں پلاموں کی طرف روانہ ہوئیں لیکن قلعے پر ان کی توپوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اودنت رائے نے جو اُس وقت قلعے میں تھا، خفیہ دروازے کے بارے میں انگریزوں کو بتا دیا اور اس طرح قلعے پر انگریز قابض ہو گئے۔ چھتر جیت رائے سرگجا بھاگ گیا۔ تھوڑے دنوں میں اودنت کو گوپال رائے نے مار ڈالا۔ انگریزوں نے اسے قید کر کے پٹنہ بھیج دیا وہ وہیں مر گیا۔ اس کی جگہ چیراون رائے راجا ہوا، لیکن وہ نا اہل تھا۔ ۱۸۰۰ء میں بدامنی پھیلی۔ کرنل جانس فوج لے کر آیا۔ باغی سرگجا بھاگ گئے انگریزوں نے ۱۸۱۱ء میں میجر ریفرج کے کہنے پر پلاموں اور یہ قلعہ دیو کے راجا گھنشیام رائے کے ہاتھ نیلام کر دیا۔ ۱۸۱۷ء میں اسے یعنی پلاموں کو ضلع رام گڑھ میں ملایا گیا۔ ۱۸۳۱ء میں کول لوگوں کی بغاوت ہوئی جس میں چیرو لوگوں نے بھی حصہ لیا۔ ۱۸۵۴ء میں پلاموں، لوہردگا کا ایک سب ڈیویژن بنا۔ ۱۸۵۹ء میں لسلی گنج صدر مقام بنا اور ۱۸۹۴ء میں کرنل ڈالٹن کے نام پر شہر ڈالٹن گنج بسا جو آج تک ضلع پلاموں کا صدر مقام ہے۔

پلاموں کا حکمراں قبیلہ چیرو ہے اس کا ثبوت ہمیں تاریخ سے ملتا ہے۔ ان حکمرانوں میں درج ذیل حکمراں تھے۔

نام	مدت سلطنت
۱۔ بھگوت رائے	۱۶۳۰ سے ۱۶۳۱ء تک
۲۔ اننت رائے	۱۶۳۱ سے ۱۶۴۱ء تک

۱۶۴۲ء میں مغل سپہ سالار شائستہ خاں نے پلاموں پر چڑھائی کی اور ۱۶۴۳ء تک مغلوں کا پلاموں فورٹ پر قبضہ رہا۔ لیکن اننت رائے کچھ ہی دنوں بعد قلعے پر پھر قابض ہو گیا۔ ۱۶۶۱ء میں گوپال رائے چیرو حکمراں نے کچھ دنوں کے لئے زمام حکومت سنبھالی۔ ۱۶۶۲ - ۱۶۷۴ تک مشہور چیرو حکمراں مدنی رائے کی حکومت قائم ہوئی جس کے بارے میں کہا جا چکا ہے کہ اس نے چھوٹا ناگپور کے راجا پر چڑھائی کر کے اسے شکست دی۔ مدنی رائے کی حکومت تیرہ برسوں تک رہی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ذرگ پال رائے کی حکومت ۱۶۸۱ سے ۱۶۹۱ء تک رہی۔ اس طرح کئے بعد از دیگرے کئی چیرو راجاؤں کا مختصر عہد رہا اور رنجیت رائے کا عہد ۱۷۱۶ء سے ۱۷۲۲ء تک رہا۔ رنجیت رائے کے بعد جے کشن رائے راجا ہوا

جس کے زمانے میں مرہٹوں نے پلاموں پر حملہ کیا۔ مغل سلطنت کا ہندوستان میں زوال شروع ہو چکا تھا۔

لارڈ کلائیو کے عہد میں چیرو لوگوں کے درمیان سلطنت کا جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ رنجیت رائے نے جے کشن رائے کو مار ڈالا۔ چھتر جیت رائے کو مسند نشیں کیا۔ جے کشن رائے کے پوتے گوپال رائے نے پٹنہ جا کر انگریزوں سے مدد طلب کی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جس کے نتیجے میں انگریز اس علاقے پر قابض ہوتے ہیں۔ پہلے اس علاقے کو گھنشیام راے کے ہاتھ نیلام کرتے ہیں بعدہٗ ۱۸۱۱ء میں خود قابض ہو جاتے ہیں۔

چیرو حکمرانوں کے جو دوار اوپر دکھائے گئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں وہ حکمراں جو کسی کی بھی ماتحتی پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے اپنی آزادی کو ہر قیمت پر ترجیح دی خواہ وہ مغل حملہ آور ہوں یا انگریز۔ لیکن جب ان میں بھی نااہل لوگ حکمراں ہوئے تو ان کی بد اندیشیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے سبب اس حکمراں خاندان کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا نہ صرف یہی بلکہ رفتہ رفتہ ان کا وجود ہی ختم ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دوسرے قبیلوں کے ساتھ مل کر چیرو لوگوں نے بھی حصہ لیا لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہیں ملا۔ عنان حکومت انگریزوں کے ہی ہاتھ میں رہی۔ ۱۸۵۷ء کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب انگریزوں کے ہاتھوں بابو کنور سنگھ شہید ہوئے تو ان کے بھائی امر سنگھ نے جیسا کہ پلاموں گزیٹر میں پی-سی-رائے چودھری لکھتے ہیں، دوسو یا اس سے زیادہ بندوق برداروں کو لے کر شاہ آباد ہوتے ہوئے پلاموں کا رُخ کیا۔ جپلا کے پاس کوئل ندی کو پار کیا۔ ان کے ساتھ یہاں کے زیادہ تر کھروار قبیلے کے لوگ ہوئے۔ اس وقت انگریزوں کی بڑی چھاونی کروندھیا میں تھی اور اس کا سپہ سالار کرنل گراہم تھا۔ یہ خبر سن کر وہ گھبرایا۔ لفٹیننٹ بنگال کو خط لکھ کر اس سے کہا کہ اگر ان باغیوں کو آگے بڑھنے سے نہیں روکا گیا تو یہ چھوٹا ناگپور کو پار کر کے آگے بھی بڑھ سکتے ہیں لہذا کثیر فوج کی ضرورت ہے۔ رام گڑھ فوجی چھاونی سے بھی اور بنگال سے بھی فوجیں بھیجی جائیں۔ ایسا ہی ہوا۔ بغاوت دبا دی گئی۔ نیلامبر پیتامبر اور دوسرے سرداروں کو پھانسی دے دی گئی اس کے بعد لسلی گنج فوج کا صدر مقام بنایا جاتا ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

انگریزوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پلاموں کو باضابطہ ایک ضلع قرار دیا جائے اور یہ پورا علاقہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۲ء کو ضلع بنایا جاتا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں بنگال حکومت نے اس کا نوٹیفیکیشن جاری کیا اور دوسرے گریڈ کا ڈپٹی کمشنر اے-وی-گارڈن مقرر ہوا۔ جس کی تصدیق کلکتہ گزٹ پارٹ ون صفحہ ۹۲۱ سے ہوتی ہے۔

پلاموں کے جو تین گزیٹر لکھے گئے ہیں ان میں ایک اوملے کا، دوسرا پی-سی-ٹیلنٹ کا اور تیسرا پی-سی-رائے چودھری کا ہے۔ پہلا ۱۹۰۷ء دوسرا ۱۹۲۵ء اور تیسرا آزادی کے بعد شائع ہوا۔ پہلے گزیٹر میں ڈبلیو-آر-برج کو ڈپٹی کمشنر بتایا گیا ہے۔ لیکن گورنمنٹ اور آثار قدیمہ کی رپورٹوں کی بنیاد پر پی-سی-رائے چودھری اپنے گزیٹر میں صفحہ ۳۱۶ پر گارڈن ہی کو پہلا ڈپٹی کمشنر مانتے ہیں۔ پلاموں کا موجودہ صدر مقام ڈالٹن گنج ہے جسے برجیا باغ بھی کہا جاتا تھا جو راجا مدنی رائے سے منسوب ہے۔

مصادر :

(۱) لینڈ اینڈ پیپل آف ٹرائبل بہار۔ ڈاکٹر زبدیشور پرشاد

(۲) پلاموں گزیٹر۔ ایل-ایس-او ملے (Omely)

(۳) پلاموں گزیٹر۔ جی-سی-ٹیلینٹ

(۴) تاریخ مگدھ۔ فصیح الدین بلخی

(۵) پلاموں کی تاریخی سرگذشت۔ فصیح الدین بلخی مطبوعہ، کوئل ڈالٹن گنج

(۶) پلاموں کا سانسکرتک ادھین (ہندی)۔ حولداری رام گپتا

(۷) پلاموں کا اتہاس (ہندی)۔ رام دین پانڈے

(۸) کوئل ندی کے کنارے کنارے (ہندی) مہابیر ورما

(۹) انتھولوجی آف بنگال۔ کرنل ڈالٹن (انگریزی)

(۱۰) احوالِ حسین آباد۔ ابوالاعجاز سید نوروز محمد عرف شریف حسین شریفؔ

(۱۱) پلاموں گزیٹر۔ پی-سی-رائے چودھری

(۱۲) اوراؤں ریلیجن اینڈ کسٹم۔ ایس-سی رائے

(۱۳) منڈا اینڈ ور کنٹری۔ ایس-سی رائے

(۱۴) آر-ایس فوربس سیلیمنٹ رپورٹ ۱۸۷۲ء۔ از فوربس

(۱۵) ڈی ایس سٹلمنٹ رپورٹ ۱۸۹۸ء۔ از سنڈرس

(۱۶) سم سائڈ لائٹ آن دی چیرو رولرس ان پلاموں۔ ڈاکٹر بی ورتم

(۱۷) سول ریبلین ان انڈین میوٹنی ۱۸۵۷ء۔ ایس-جی-چودھری

(۱۸) ڈبلو آر برج کی رپورٹ ۱۸۶۳ء۔ ڈبلو آر برج

(۱۹) بہار تھرو دی ایجز۔ آر-آر-دیواکر

(۲۰) فری ڈم مومینٹ آف بہار۔ ڈاکٹر کے-کے-دتا

(۲۱) انڈیا اینڈ دی جمبو لینڈ۔ امرناتھ داس

(۲۲) رپورٹ آف دی سینسس آف بنگال ۱۸۷۲ء۔ ایچ بورلی

Kund Mohalla, Daltonganj, Palamu (JHARKHAND) - 822101

ڈاکٹر مختار الدین احمد

علی گڑھ میں تصانیفِ خسرو کے قلمی نسخے

(۱)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کتب خانہ، جو پہلے لٹن لائبریری، اور جو اب ۱۹۶۰ء سے مولانا آزاد لائبریری کے نام سے مشہور ہے، اپنے قدیم مطبوعات اور نادر مخطوطات کی بنا پر ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان سے باہر بھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اس کتب خانے کی ابتدا سرسید احمد خاں اور جسٹس سید محمود کی ذاتی کتابوں سے ہوئی، پھر ان کے احباب اور مخیر اصحاب کی اعتنا سے جلد ہی یہ ذاتی ذخیرے، کتب خانے کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

سرسید کو فارسی و عربی کی قدیم مؤلفات اور اسلامیات پر یورپ میں چھپی ہوئی تصانیف سے بڑا شغف تھا۔ یورپ میں جوں ہی کوئی کتاب ان کی دل چسپی کی چھپتی تو وہ اسے فوراً منگوانے کا انتظام کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مطبوعاتِ عربی و فارسی جس تعداد میں یہاں موجود ہیں، ہندوستان میں کسی جگہ کم ہوں گے۔ یہاں بیسیوں کتابیں ایسی دیکھنے میں آئیں جن پر سرسید، سید محمود اور علامہ شبلی نعمانی کی تحریریں اور یادداشتیں ثبت ہیں۔ قانونِ ابن سینا جو روم (اطالیہ) میں، ۱۵۹۳ء یعنی سولہویں صدی کے اواخر میں عربی متن اور لاطینی ترجمے کے ساتھ چھپا تھا۔ اس کا نایاب نسخہ سید محمود مرحوم ہی کے کتب خانے کا ہے۔

سرسید قلمی کتابوں کے جمع کرنے میں بڑی توجہ اور گہری دلچسپی سے کام لیتے تھے۔ تاریخ گزیدہ مصنفہ خواجہ حمد اللہ مستوفی، جس کے پہلے صفحے پر عہد اکبر کے مشہور شاعر اور دبیر فیضی کی تحریر، دستخط اور مہر ثبت ہے، سرسید کا ہی مملوکہ نسخہ ہے جو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں کچھ دن گزار کر لٹن لائبریری پہنچا۔ اس پر سوسائٹی اور سرسید کی مہریں موجود ہیں۔ تاریخ گزیدہ کے اس نسخے پر فیضی کے قلم کی حسب ذیل تحریر ہے: مالک هذا التاریخ النجیب بالهبة الصحیحة الصریحة ابو الفیض فیضی۔ مہر میں بھی ابوالفیض فیضی صاف پڑھا جاتا ہے۔ ایک مہر مولانا محمد اسحاق کی ہے۔ مہر کی عبارت یہ ہے: تابع شرع: محمد اسحاق، ۱۰۹۲ھ۔

مولانا آزاد لائبریری میں ان ذخیروں کے علاوہ مولوی سبحان اللہ خان رئیس گورکھپور، نواب عبدالسلام خان (رام پور)، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (میرٹھ)، سر شاہ محمد سلیمان (الہ آباد)، شاہ منیر عالم (غازی پور)، احسن مارہروی، جلیل قدوائی، حاجی قطب الدین، مولانا عبدالحیٔ (فرنگی محل)، خان بہادر سید ابو محمد ممبر پبلک سروس کمیشن یو پی، پروفیسر ولی محمد وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، مولانا عبدالماجد دریابادی، رام بابو سکسینہ وغیرہم کے ذخائر کتب آ کر جمع ہو گئے ہیں، جن میں

اہم اور نفیس مخطوطات کی خاصی تعداد ملتی ہے۔

جو کتب خانے بعد کو علی گڑھ منتقل ہوئے، ان میں جواہر لال میوزیم (اٹاوہ) اور کتب خانہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (حبیب گنج) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اٹاوہ کلکشن کی ساری کتابیں، خان بہادر ڈاکٹر بشیر الدین مرحوم بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی فراہم کردہ ہیں۔ اس ذخیرے میں مارہرہ شریف کے ایک بزرگ سید محمد موسیٰ خلف حافظ سید عبدالجلیل کی دو ہزار کے قریب کتابیں شامل ہیں۔ اس طرح خاندانِ مارہرہ کے بزرگوں کی تصنیفات کا ذخیرہ بھی یہاں محفوظ ہوگیا ہے۔ اٹاوہ کلکشن میں اہم مخطوطات، اور خوبصورت قیمتی فرامین کے علاوہ مرزا غالب کے دوست اور ان کے معاصر حضرت سید شاہ صاحب عالم مارہروی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے روزنامچوں کے کچھ مجلدات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب خانہ حبیب گنج، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (۱۸۶۷ء تا ۱۹۵۰) کی ذاتی توجہ اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی توجہ قیمتی کتابوں اور نوادر کے حصول کی طرف ابتدائے عمر سے رہی۔ مشہور عالم، عرب خطاط یاقوت المستعصمی کے قلم کے لکھے ہوئے کلام مجید کے ایک قیمتی نسخے کے حصول پر علامہ شبلی نے انھیں لکھا: ''گانو (حبیب گنج) میں بیٹھے ہوئے بغداد (جہاں یاقوت مستعصمی تھا) تک چھاپہ مارتے ہو''۔ صدر یار جنگ کو کتابوں کی تعداد بڑھانے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ میں صدر یار جنگ کو آئرلینڈ کا چیسٹر بیٹی سمجھتا ہوں، جس نے اپنی پوری عمر اور ساری دولت مخطوطات کے جمع کرنے میں صرف کی لیکن صرف نفائس و نوادر اور بیشتر مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخوں کی طرف اس نے اپنی توجہ مبذول رکھی۔

کتب خانہ حبیب گنج میں ۱۹۲۲ء تک مخطوطات و مطبوعات کی تعداد ۴۱۷۳ تھی۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی تعداد ۶۰۹۰ ہوگئی۔ کتابوں کی خریداری اور فراہمی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء، یعنی ان کی وفات تک کتابوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں الحاج مولوی عبیدالرحمٰن خان شروانی نے جو علم و ادب سے دلچسپی میں صحیح معنوں میں نواب صدر یار جنگ کے خلف ارشد ہیں، اس خیال سے کہ ذخیرۂ حبیب گنج سے علمی دنیا زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم و مغفور کے ایما پر اپنا ذخیرۂ کتب، کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھیج کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

حبیب گنج کلکشن کے نوادر پر ایک مستقل مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ آج کی صحبت میں موقع کی مناسبت سے امیر خسرو دہلوی کے تصانیف کے ان قلمی نسخوں پر گفتگو کی جارہی ہے جو اس ذخیرے میں محفوظ ہیں۔

(۲)

سب سے پہلے خسرو کے دواوین کو لیجئے۔ یہ تعداد میں پانچ ہیں:

(۱) **تحفۃ الصغر** : ان کا پہلا دیوان ہے، اور جیسا کہ ان کے لکھے ہوئے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے اس میں ان کے ابتدائی عہد کا کلام درج ہے جو ان کے ۱۶ سال سے ۱۹ سال تک کی عمر کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس دیوان کا زمانہ ترتیب ۶۷۱ھ کے لگ بھگ سمجھنا چاہیے۔ اس میں قدیم ایرانی اساتذہ انوری، خاقانی اور سنائی کے طرز سخن کے تتبع کی انھوں نے کوشش کی ہے۔

دیوان میں ۳۵ قصیدے، پانچ ترجیع بند و ترکیب بند، متعدد قطعات اور ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ قصیدے سلطان غیاث الدین بلبن، شہزادہ نصیر الدین محمد اور دوسرے امرا کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ، جو انھوں نے اپنے نانا نواب عماد الملک کی وفات پر لکھا ہے وہ بہت درد انگیز ہے۔

اس دیوان کا صرف ایک نسخہ ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے اور وہ ذخیرۂ حبیب گنج میں ہے۔ صفحات ۱۳۰، سطور ۱۳، نہایت خوشخط، دبیز کاغذ پر اس کی کتابت کی گئی ہے اور آیاتِ قرآنی اور عربی فقرات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ ورق ۸ الف تک خسرو کا لکھا ہوا دیباچہ ہے اور اس صفحے کے نصف حصے سے قصائد شروع ہو جاتے ہیں، پھر غزلیات، مثنویات، رباعیات درج ہیں۔ کتابت قدیم ہے۔ کاتب کا نام اور سالِ کتابت درج نہیں۔ آخر میں مالک کتاب کا نام ہے اور نسخہ دستخط شدہ ہے۔ ایک مہر محمد شاہ کی ہے اور اس پر سال ۱۰۱۹ء منقوش ہے۔ ورق ۶۲ پر کسی ''محمد بہادر علی'' کا نام لکھا ہے۔ کسی زمانے میں یہ نسخہ ان کے پاس رہا ہوگا۔ اس نسخے پر صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی کی حسب ذیل تحریر ثبت ہے :

> ''اس مجموعے میں بعض قصائد سلطان علاء الدین کی مدح میں بھی ہیں، جو غالباً الحاقی ہیں۔ اس لئے کہ سلطان ممدوح کا جلوس ۶۹۵ھ میں ہوا۔ امیر خسرو کی عمر اس وقت ۴۳ برس کی تھی۔ اس لئے کہ ان کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہوئی اور اس مجموعے میں (جیسا کہ دیباچے سے واضح ہوتا ہے) مصنف نے ۱۶ برس سے ۱۹ برس کی عمر تک کا کلام فراہم کیا ہے''۔

(۲) **وسط الحیوٰۃ** : خسرو کا دوسرا دیوان ہے۔ اس میں ان کا وہ کلام جمع ہے جو انھوں نے ۱۹ سے ۲۴ برس کی عمر تک نظم کیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو خود انھوں نے یا نقل نویسوں نے بعد کے کہے ہوئے اشعار بھی دیوان میں شامل کر دیے جو انھوں نے ۳۲/۳۳ سال کی عمر میں سپرد قلم کئے تھے۔ اس طرح اس دیوان کے ترتیب کا زمانہ ۶۸۴ھ متعین ہوتا ہے۔ اس میں ۵۸ قصیدے، ۸ ترجیع بند اور متعدد قطعات و رباعیات ملتے ہیں۔ بیشتر قصائد، شہزادہ سلطان شہید کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ قصائد کے دوسرے ممدوحین: حضرت نظام الدین اولیاؒ، بلبن، کیقباد، بغرا خاں، اختیار الدین، شمس الدین، تاج الدین اور جلال الدین فیروز خلجی ہیں۔ ترجیعات میں سے تین میں سلطان محمد شہید کا مرثیہ ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس دیوان میں اس زمانے کا کلام درج ہے۔ جب ان کی شاعری اپنے پورے شباب پر تھی،

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دیوان کی طرف نقل نویسوں نے کم توجہ کی ہے اور اس کے قلمی نسخے نسبتاً کم ملتے ہیں اور بعض کلیات کے نسخوں میں تو سرے سے یہ دیوان موجود ہی نہیں ہے۔

(۳) غرۃ الکمال : خسؔرو کا تیسرا دیوان ہے جو ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا۔ اس میں ۳۴ سال سے لے کر ۴۳ سال کی عمر تک کی لکھی ہوئی منظومات ملتی ہیں، لیکن اس میں بعد کے کلام کا اضافہ بھی انھوں نے کیا ہے۔ خسؔرو خود دیباچے میں لکھتے ہیں: ''بعد ازیں ہر چہ جمع افتد، ہم دریں کارخانہ خرج شود''۔ اس طرح یہ دیوان ان کے دواوین میں سب سے زیادہ ضخیم ہوگیا ہے۔ اس میں ۹۰ سے زائد قصیدے، نو مثنویات اور متعدد قطعات و رباعیات درج ہیں۔ اس میں غزلوں کے کچھ خوبصورت نمونے مل جاتے ہیں۔ قصائد: جلال الدین خلجی، اس کے بیٹوں اور متعدد امرا کی مدح میں ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مدح میں جو قصیدہ انھوں نے سپرد قلم کیا ہے، اس کے بارے میں خود ان کا قول بعض تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے کہ اگر حوادثِ زمانہ سے میرا سارا کلام مفقود ہو جائے اور صرف یہ قصیدۂ مدحیہ باقی رہ جائے تو مجھے کسی قسم کا رنج یا تردّد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جو شخص بھی اس قصیدے کو پڑھے گا وہ اقلیم سخن میں میرے مرتبے اور قابلیت و صلاحیت کا معترف ہوگا۔

غرۃ الکمال کا دیباچہ خسؔرو نے بہت توجہ سے لکھا ہے اور اس سے متعدد قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔

(۴) بقیہ نقیہ : خسرو نے اپنا چوتھا دیوان ۷۱۶ھ میں، یعنی ۶۴ سال کی عمر میں مرتب کیا۔ اس میں ۶۳ قصیدے، ۶ ترجیعات، ایک مثنوی، ۲۰۰ قطعات، ۳۶۰ رباعیات اور ۵۷۰ غزلیں ہیں۔ قصائد زیادہ تر انھوں نے علاء الدین خلجی کی اور کچھ قطب الدین مبارک شاہ کی مدح میں لکھے ہیں، بقیہ اس عہد کے امرا کی مدح میں ہیں۔

یہ دیوان، غرۃ الکمال سے مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ خسؔرو کے پختہ کلام کے بہت نادر نمونے اس میں ملتے ہیں۔ اس کا ایک اچھا صحیح نسخہ ذخیرۂ عبد السلام میں محفوظ ہے اور اس دیوان کا ایک قدیم نسخہ، مکتوبہ محمد قاسم بن حاجی حسین ابن مرحوم خواجہ حاجی جان بن شیخ عطاء قزوینی، ذخیرۂ حبیب گنج میں بھی پایا جاتا ہے جو شہر ذوالحجہ ۹۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ تعداد اوراق ۵۱۳، سطور فی صفحہ ۲۰۔ اس کا خط خفی ہے لیکن روشن اور واضح۔ اس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں۔ اس نسخے پر ''علی مظفر فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی'' کی مہر ثبت ہے، آخر میں کاتب کا ترقیمہ :

> وقع الفراغ من تنسیق هذا الکتاب من ید الفقیر، الحقیر محمد قاسم بن حاجی حسین بن خواجه حاجی اجی جان بن المغفور حضرت شیخ عطاء قزوینی فی شهر ذی الحجة سنة اربع و تسعین و تسع مئة. اللهم اغفر لکاتبه و لمن نظر فیه بفضلک و حولک

برحمتک یا ارحم الراحمین"۔

ترقیمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب پڑھا لکھا ہے اور عربی اور فارسی سے بھی واقف ہے۔ اس سے یہ توقع بے جا نہیں کہ اس نے نسخہ صحیح لکھا ہوگا، **بقیہ نقیہ** اگر کسی صاحب ذوق نے دوبارہ شایع کیا تو اس کے لئے نسخہ حبیب گنج کی طرف مراجعت ناگزیر ہوگی۔

(۵) نہایت الکمال: خسرو کا یہ پانچواں دیوان اس کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے مرتب ہوا۔ اس میں ۲۲ قصیدے، ۵ ترجیع بند، ۴ مثنویاں، متعدد قطعات و رباعیات اور کچھ غزلیں ملتی ہیں۔ قصائد: غیاث الدین بلبن، شہزادوں اور امرا کی مدح میں ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مدح میں جو قصیدہ انھوں نے نظم کیا ہے، وہ بقولِ وحید مرزا: "ان کے جذباتِ عقیدت اور احساساتِ ارادت کا آئینہ دار ہے"۔

اس دیوان کے نسخے کم یاب ہیں۔ ذخیرۂ حبیب گنج میں ایک نسخہ موجود ہے جو عبدالکریم بن عبدالجلیل صدیقی کے قلم کے لکھے ہوئے نسخے (تاریخ کتابت ۱۷ محرم الحرام ۱۰۱۴ھ) سے نقل کیا گیا ہے۔ کتاب خانہ حبیب گنج کے سابق کتاب دار شیخ ضامن علی چناری نے ۱۳۲۰ھ میں اس کی نقل تیار کی ہے۔ اس نسخے میں جا بجا بیاضیں ہیں۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور دیباچہ، قصائد، مثنویات وغزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان اگر کبھی طبع ہوا تو نسخہ حبیب گنج سے استفادہ یقیناً مفید ہوگا۔ نسخہ منقول عنہا کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

> تمام شد، بعنایت الٰہی، نہایۃ الکمال، خواجہ خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ و الغفران، بخط اضعف العباد اللہ القوی عبدالکریم بن عبدالجلیل الصدیقی غفرلہ وستر عیوبہ، در تاریخ ۱۷ شہر محرم، در وقت چاشت، روز دوشنبہ ۱۰۱۴ھ۔

اس کے بعد موجودہ نسخے کے کاتب نے لکھا ہے:

> "نسخہ مذکورہ خط زیادارد، مادر مقامہا بیاض ہم داشت، مطابق آں دریں نسخہ ہم بیاض گذاشتہ شد۔ کاتب شیخ ضامن علی چناری"۔

صدر یار جنگ کے قلم سے اس میں اضافہ: "مہتمم کتاب خانہ حبیب گنج، ضلع علی گڑھ، شیخ ضامن علی چنار، یوپی کے رہنے والے تھے اور حبیب گنج کے کتاب خانے میں ملازم"۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں۔

(۳)

اب امیر خسرو کی تاریخی مثنویوں کو لیتا ہوں۔ قران السعدین (زمانۂ ترتیب ۶۸۸ھ) مفتاح الفتوح

(سال تکمیل ۶۹۰ھ) دول رانی خضر خاں جس کا دوسرا نام منشور شاہی ہے، لیکن یہ عشقیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مثنوی ۷۱۵ھ میں مکمل ہوئی۔ خسرو نے نہ سپہر ۶۷ سال کی عمر میں ۷۱۸ھ میں لکھی۔ تغلق نامہ، جو تاریخی سلسلے کی آخری مثنوی ہے، اسے خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے مکمل کیا۔

قران السعدین کے ۱۲ نسخے علی گڑھ کے کتاب خانے میں ملتے ہیں: یونیورسٹی کلکشن میں دو (جس میں ایک میر حبیب اللہ سندیلوی کے قلم سے لکھا ہوا ہے، سالِ کتابت ۴۶ جلوس والا ۹۵۰ھ، اور دوسرا شیخ عمر بن حاجی محمد مفتی کا مکتوبہ ہے)۔ ذخیرۂ احسن مارہروی میں دو (جس میں ایک انی رائے کھتری کا مکتوبہ ہے، در ۱۲ جلوس ہمایوں بمقام حسن ابدال)۔ ذخیرۂ قطب الدین میں دو، ذخیرۂ سبحان اللہ میں دو (ایک نسخہ عاشق محمد کا لکھا ہوا ہے)۔ ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں دو نسخے (ایک نسخہ مکتوبہ محمد اشرف در ۱۲۷۳ھ، دوسرا کسی نامعلوم کاتب کا ۱۸۷۶ء کا لکھا ہوا) ہے محفوظ ہے۔ ذخیرۂ شیفتہ کا نسخہ غلام محی الدین محمد اکرم قریشی کے قلم کا ہے اور ۱۱۰۸ھ کا مکتوبہ۔ اس پر خادمِ شرع محمد میر عدل خطیب کی مہر ثبت ہے جس پر ۱۱۵۷ کے ہندسے منقوش ہیں۔ حبیب گنج کا نسخہ دبیز کاغذ پر نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ اوراق ۱۳۷، سطور فی صفحہ ۱۴، کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

مثنوی دول رانی خضر خان کے دو نسخے یونیورسٹی کلکشن میں، دو ذخیرۂ سر سلیمان میں (جس میں ایک نسخہ منگل سین کے قلم کا ۱۸۷۳ء کا لکھا ہوا ہے)، ایک ایک منیر عالم اور اٹاوہ کے ذخیروں میں محفوظ ہے۔ ایک نسخہ خان بہادر ابو محمد مرحوم سابق ممبر پبلک سروس کمیشن یو پی کی کتابوں میں علی گڑھ پہنچا ہے جو محمود احمد کا نوشتہ ہے۔ یہ قدیم اور بہت اچھا نسخہ ہے اور ۹۹۰ھ کا لکھا ہوا۔ اس مثنوی کا ایک اچھا نسخہ، جو خاصا خوش خط ہے، بنی رائے منشی گنیش رائے ابن شتاب رائے متوطن پرگنہ کیتل، قوم کائستھ ناگر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔

اس مثنوی کا دوسرا نسخہ، جو ذخیرۂ حبیب گنج میں ہے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ نسخہ ۲۰۹ اوراق پر، جن میں ۱۱ سطور فی صفحہ ہیں، نہایت واضح خوش خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"تمت الکتاب بعون الملک الوہاب سنة ثلاث و عشر و الف
مائة در خطۂ بہار دار الخلافه، پٹنه. کاتبه ....."

اس کے بعد کی سطریں تراش دی گئی ہیں اور اس پر دوسرے کاغذ کا پیوند لگا دیا گیا ہے۔ یہ نسخہ چودھری عبد الحمید خاں رئیس سہاور ضلع ایٹہ نے صدر یار جنگ کو پیش کیا تھا۔

نہ سپہر کا ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں اور بہت اعلا قدیم نسخہ ۸۸۷ھ کا مکتوبہ ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ یہ بہت خوش خط ہے۔ اس پر لطیف الدین بہادر کی مہر ۱۱۱۳ھ کی منقوش اور ایک دوسری مہر مہاراجا نگینہ رائے کی ہے جس کے اوپر "بتقدیم شہر رمضان ۱۲۰۶ھ عرض دیدہ شدہ" لکھا ہوا ہے۔

اس کے نسخے ذخیرۂ اٹاوہ، ذخیرۂ سبحان اللہ، ذخیرۂ سلیمان میں بھی محفوظ ہیں۔ آخر الذکر نسخہ جوالا پرساد کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ خان بہادر ابو محمد کا نسخہ نسبتاً قدیم ہے اور ۱۰۲۸ھ کا نوشتہ۔

تغلق نامہ کے نسخے کمیاب ہیں، بلکہ اس کے متعلق یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ یہ کتاب ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی ہے، لیکن ذخیرۂ حبیب گنج میں ایک قلمی نسخہ جہانگیر نامہ ملا اور مطالعے سے اندازہ ہوا کہ یہ گم شدہ تغلق نامہ ہے جس کا بقولِ وحید مرزا: ''ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں کہیں کھوج نہ ملتا تھا''۔ جہانگیر کے عہد میں یہ مثنوی نا مکمل حالت میں ملی تھی۔ جہانگیر نے اپنے درباری شاعر حیاتی گیلانی سے کہا کہ وہ مثنوی کو مکمل کردے۔ چنانچہ اس نے ۱۷۹/ شعر کہہ کے اسے مکمل کر دیا۔ آخر کا ایک باب غائب ہے۔ اس حالت میں یہ مثنوی ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد میں شایع ہوئی ہے۔

(۴)

خمسۂ خسرو کا امیر خسرو کی اہم تصانیف میں شمار ہوتا ہے۔

خمسۂ خسرو، **خمسۂ نظامی** کے جواب میں ہے اور یہ پانچ مثنویوں، **مطلع الانوار**، **شیریں خسرو**، **مجنون و لیلیٰ**، **آئین سکندری**، **هشت بهشت** پر مشتمل ہے۔

مثنوی **مطلع الانوار** ۶۹۸ھ میں صرف دو ہفتے میں لکھی گئی، جب ان کی عمر ۴۸ سال تھی۔ **شیریں خسرو** اسی سال رجب میں شروع کی گئی اور ماہ ذوالحجہ میں اتمام کو پہنچی۔ اس کے بعد خسرو نے **مجنون و لیلیٰ** لکھی۔ **آئین سکندری** ۶۹۹ھ میں اور **هشت بهشت** ۷۰۱ھ میں مرتب ہوئی۔ اس طرح **خمسۂ خسرو** کا زمانۂ تصنیف ۶۹۸ھ سے شروع ہو کر ۷۰۱ھ میں ختم ہو جاتا ہے۔

خمسۂ خسرو ذخیرہ کتب الدین، ذخیرۂ شیفتہ میں محفوظ ہیں۔ نواب مصطفیٰ خان کا ذاتی نسخہ نہایت پاکیزہ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور ایک اچھا نسخہ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں بھی پایا جاتا ہے۔

ان پانچ مثنویوں میں **شیریں خسرو** کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے نسخے بھی ان کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس کے چار نسخے یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک نسخہ اٹاوہ کلکشن میں محفوظ ہے۔ اس کے ایک فرہنگ کا قلمی نسخہ سبحان اللہ خان کے ذخیرۂ کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خمسۂ خسرو کی حسب ذیل مثنویوں کے قلمی نسخے ذخیرۂ حبیب گنج میں دیکھنے میں آئے :

مطلع الانوار : اس مثنوی کا ایک خوش خط نسخہ نستعلیق میں لکھا ہوا نظر سے گزرا۔ اس پر ایک مدور بڑی مہر ''صلاح الدین خان فدوی محمد بادشاہ غازی'' کی ثبت ہے جو ۱۱۴۵ھ میں کھدی تھی۔ دوسری مہر ''محمد علی بن محمد بادی'' کی

ہے۔جس پر ۱۲۳۰ھ کے اعداد منقوش ہیں۔

شیریں خسرو : نسخہ حبیب گنج کے سرورق پر مولوی احمد علی خاں اسیر بونی پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ملتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتب خانے میں پہنچنے سے پہلے یہ نسخہ ان کے پاس رہ چکا تھا۔

مجنون و لیلیٰ : اس مثنوی کے یہاں دو نسخے ہیں۔ایک جوذرا خوش خط ہے۔اس پر کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں۔دوسرا نسخہ جدید الخط ہے، جس کی تصحیح پہلے سید احمد حسین شوکت میرٹھی مرحوم نے کی ہے اور پھر صدر یار جنگ مغفور نے، جنھوں نے اس کا متن اشاعت کے لئے تیار کیا تھا۔مجنون ولیلیٰ پر شروانی صاحب کے طویل مقدمے کا ایک نسخہ بھی اس کتب خانے میں محفوظ ہے۔

آئین سکندری : اس کا ایک نسخہ حبیب گنج کلکشن میں، خوش خط نستعلیق میں کتابت کیا ہوا محفوظ ہے۔ حاشیے پر بھی اشعار درج کئے گئے ہیں۔عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔سرورق پر ''علی مظفر خاں فدوی محمد شاہ بہادر بادشاہ غازی'' کی مدوّر مہر ثبت ہے جس پر ۱۱۳۳ھ کے اعداد منقوش ہیں۔مہر کے اوپر کسی کے قلم سے (عطیہ حضرت سلطانی) اور نیچے (عرض شد ۱۲جلوس والا) کے الفاظ لکھے ہوئے ملتے ہیں۔یہ نسخہ شروانی صاحب نے لکھنو سے ۱۸ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ کو خریدا تھا جیسا کہ ان کی توقیع سے معلوم ہوتا ہے۔

ھشت بھشت : حبیب گنج کا یہ نسخہ خوش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔کاتب نے ترقیمے میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے :

''حررہ داعی ابراھیم بن شیخ اسمٰعیل سمرقندی الاصل الانصاری، صانھا اللہ عن الآفات''۔مخطوطے پر ایک کلاں مدوّر مہر ثبت ہے جس پر قاضی افضل علی بن نجف علی کا نام کھدا ہوا ہے اور ۱۲۸۹ھ کے اعداد ہیں۔ایک دوسری مہر ''محمد علی بن محمد ہادی'' کی ثبت ہے جس پر ۱۲۳۰ھ کے اعداد منقوش ہیں۔

(۵)

اب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتاب خانے میں خسرو کی تصانیف کے ان نسخوں کا ذکر کرتا ہوں جو کسی نہ کسی حیثیت سے قابل توجہ ہیں :

دیوانِ امیر خسرو : صفحات ۳۹۹، سطور فی صفحہ ۱۴، خوش خط نستعلیق۔یہ غزلیات کا دیوان ہے، تا ردیف میم۔۔خاتمے پر یہ عبارت تحریر ہے :

''دیوان مبارک خواجہ امیر خسرو نور اللہ مرقدہٗ بہ خط حضرت مولانا رضی الدین دہلوی،

خلف مولانا سلیم الدین خان، تلمیذ حضرت با کرامت سید السادات، فخر زمانہ مولانا محمد امیر پنجہ کش دہلی شریف دام فضلہم العبد الحقیر .....''

اس کے بعد لکھنے والے کی مہر ہے جو پڑھی نہیں جاتی۔ نسخے پر تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں، لیکن سرورق کی عبارت پر شعر ہے۔ یہ نسخہ دہلی کے مشہور خوش نویس رضی الدین خاں کا لکھا ہوا ہے جو فن کتابت میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے استاد تھے اور جن کا سلسلہ تلمذ میر پنجہ کش سے ملتا ہے۔

دیوان امیر خسرو کا ایک نسخہ ذخیرۂ شیفتہ میں بھی ہے خط نستعلیق میں لکھا ہوا۔ اس کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے :

ز جامِ عشق تو چوں دو بہ مدعاست مرا
چہ التفات بہ جامِ جہاں نماست مرا

اور آخری غزل کا مطلع یہ ہے :

گر او را ہست دو صورت بجودے
ندارد ہیچ دو معنی وجودے

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ خسرو کا کون سا دیوان ہے۔ ذخیرۂ شیفتہ کی فہرست مخطوطات، جو حال میں شائع ہوئی ہے، اس کے فہرست نگار کا بیان ہے کہ خسرو کے پانچوں مشہور دواوین میں سے یہ دیوان نہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ کسی خوش ذوق نے خسرو کے کلام کا یہ انتخاب کیا ہے یا کسی سے مرتب کرایا ہے۔ بہر حال اس نسخے کا مطالعہ غور سے کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اس میں خسرو کے کچھ ایسے اشعار ملیں جو ابھی تک کہیں نہیں ملے ہیں اور ممکن ہے اس دیوان سے کچھ روشنی پڑے۔

یہاں ابو محمد گلگشن میں ایک قلمی کتاب '' قصہ شہرخ و مہرخ '' ہے جو محمد معصوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ سال کتابت ۱۲۹۰ھ۔ خسرو کی تصانیف کے ذیل میں اس کتاب کا ذکر نہیں مل سکا۔ اس کا تمام تر مطالعہ کر کے پتا چلانا چاہئے کہ کیا اندرونی کوئی شہادت ایسی ملتی ہے جس سے اسے خسرو کی تصنیف تصور کیا جائے یا یہ صرف خوش نویسوں کا کرشمہ ہے۔

اس طرح اناوہ گلگشن کا مخطوطہ '' خیالات امیر خسرو '' بھی اہلِ نظر کی توجہ چاہتا ہے۔

NAZIMA MANZIL,
Amir Nishan Road, Dodhpur,
Aligarh - 202002

پروفیسر شریف حسین قاسمی

فرہنگ قوّاس

ترتیب و تصحیح کا ایک اعلا نمونہ

پروفیسر نذیر احمد صاحب فارسی اور اردو زبان و ادب کے محقق، دانشور اور استاد کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری فارسی دنیا میں متعارف اور بجا طور پر قابلِ احترام اور معتبر شخصیت و مقام کے مالک ہیں۔ آپ کے علمی، تحقیقی اور ادبی کارناموں کی فہرست پر نگاہ ڈالیے تو احساس ہوتا ہے کہ جو کام آپ نے تن تنہا انجام دیا ہے، وہ عام طور پر آج کے علمی ادارے اور اکیڈمیاں بھی مشکل ہی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا پائی ہیں۔ آپ کے مختلف النوع علمی کارناموں کی روشنی میں تحقیق، تنقید و تدوین، متن، نسخہ شناسی، کتبوں کا مطالعہ اور ان کی ادبی و تہذیبی اہمیت، علمی و تحقیقی انداز پر سوانح نگاری، استخراج وغیرہ کے قابلِ قبول اور معتبر اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

یہ نامناسب نہیں اگر میں اپنے ان تاثرات کا مختصراً اظہار کر دوں جو پروفیسر نذیر احمد صاحب کی مختلف تصنیفات، تالیفات اور مقالات کے مطالعے کے بعد میرے ذہن پر نقش ہو گئے ہیں اور میرے ایسے ہر طالب علم کے لیے راہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نذیر صاحب کے علمی و ادبی کارناموں پر غائر نظر ڈالیے تو ان حقایق کا علم ہوتا ہے کہ:
''ایک محقق، مؤرخ اور عالم کے کارناموں کی کامیابی کا پیمانہ اور اس بات کی شہادت کہ اس کو اپنے فن میں کس درجے کا ملکہ اور مہارت حاصل ہے، اسے کس نوعیت کی علمی بصیرت ودیعت کی گئی ہے، وہ اس کوچے کی رسم و راہ سے کہاں تک آگاہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنے صفحے سیاہ کیے اور کتنی ضخیم تصانیف پیش کی ہیں، اس کا راز دراصل اس کے جزئیات و معلومات کے انتخاب اور اس کے رد و قبول میں پوشیدہ ہوتا ہے جس سے اس نے اپنی تصانیف میں کام لیا ہے''۔ سب ہی جانتے ہیں کہ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کے چند مقالات سے اس بات کا اس طرح ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ کسی موضوع پر ایک مقالہ سپردِ قلم کرنے کے بعد، پروفیسر صاحب اسی موضوع پر غور و فکر اور تلاش و جستجو جاری رکھتے ہیں اگر خود نتائجِ تحقیق کو جدید دریافت کے بنا پر قابلِ تنسیخ و ترمیم پاتے ہیں تو بلا تردد اس امر کا اظہار کرتے اور صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔ تحقیق میں راست بازی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ عمید لوئکی پر آپ کے مضامین اور بعض ایرانی محققین کے مقالات پر آپ کے اضافات اسی نگاہ سے دیکھے جانے چاہئیں۔

اس وقت صرف فرہنگ قواس بہ تصحیح پروفیسر نذیر احمد کا اس پہلو سے تعارف مقصود ہے کہ استادِ گرامی نے اس فرہنگ کے متن کی تصحیح، تحقیق اور پھر ترتیب میں کس عالمانہ انداز سے کام لیا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کی دلچسپی کا ایک موضوع فارسی فرہنگوں کی ترتیب و تصحیح ہے۔ آپ نے اب تک دستور الافاضل، فرہنگ قواس، لسان الشعرا اور فرہنگ زفان گویا جیسی اہم فرہنگیں مرتب اور شائع کی ہیں۔ نقد قاطع برھان بھی فرہنگ نویسی پر ایک ایسا تنقیدی کام ہے جس کی ابتدا قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے کی تھی لیکن اس کی تکمیل و تہذیب کا سہرا پروفیسر نذیر احمد صاحب کے سر ہے۔

فرہنگوں پر نقد و تبصرہ ایک علمی و فنی کام ہے۔ نذیر صاحب کو اس میدان میں خاص بلکہ استعداد اور خداداد صلاحیت حاصل ہے۔ اس کام کے لیے گہری علمی بصیرت اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ دور بہ دور فارسی فرہنگ نویسی کی تاریخ سے بخوبی آشنائی، ترکی، عربی اور حتیٰ سنسکرت، ھندی زبانوں پر گہری نظر، مختلف زبانوں میں الفاظ کے معانی و مفاھیم اور تراکیب کی سرگذشت، تمام فارسی فرہنگوں سے ذھنی مناسبت وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا افہام فرہنگوں پر کام کرنے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔

ھندوستان میں فارسی کی متعدد معتبر اور متداول فرہنگیں مرتب ہوئی ہیں۔ ھم نے متعدد فرہنگیں شائع بھی کی ہیں اسی وجہ سے فارسی فرہنگ نویسی میں ھندوستان کو دنیائے فارسی میں ایک موقر مقام حاصل ہے۔ یہاں پر دو ایک دانشوروں نے فرہنگ نویسی کی تاریخ وغیرہ پر بنیادی نوعیت کا کام بھی انجام دیا ہے، لیکن ھندوستان میں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے پہلے کسی نے فارسی کی قدیم فرہنگوں کو اعلا علمی و فنی معیار پر مرتب کیا ہو، اس کا راقم کو علم نہیں۔ اس اعتبار سے پروفیسر نذیر صاحب کو اس میدان میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور یہ ہم سب کے لیے باعث فخر ہے۔

حالات نے اب اس قابل نہیں چھوڑا کہ ھندوستان میں فارسی فرہنگ نویسی کی روایت کو جاری رکھا جائے، لیکن ھندوستان میں تالیف ہونے والی فرہنگوں کی تصحیح و ترتیب، وہ بھی علمی بنیادوں پر، صرف پروفیسر نذیر احمد صاحب کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ھندوستان اب بھی اس علمی میدان میں گرانقدر نقوش چھوڑنے کا مدّعی ہوسکتا ہے۔

عام حالات میں کوئی بھی ایک لغت کا شروع سے آخر تک اس طرح مطالعہ نہیں کرتا جیسا کہ دوسری کتابوں کا کیا جاتا ہے۔ فرہنگ یا فرہنگوں سے بہ وقت ضرورت رجوع کیا جاتا ہے۔ ایک یا چند الفاظ کا املا یا معانی و مفاہیم دیکھے جاتے ہیں اور بس۔ راقم کو بہر حال یہ فخر حاصل ہے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کی مرتبہ دو فرہنگوں کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ ایک لسان الشعرا اور دوسری فرہنگِ قواس (دوسرا ایڈیشن)۔ اس لیے مجھے ان دونوں فرہنگوں کو الف سے یے تک پڑھنے کا موقع ملا اور تصحیح و ترتیبِ فرہنگ میں پروفیسر نذیر صاحب کی علمی روش، تنقیدی رویّے اور دیگر فارسی فرہنگوں پر آپ کی گرفت اور گہری نظر کا احساس ہوا۔

اس وقت فرہنگ قواس میں استاد نذیر احمد صاحب نے ترتیب و تصحیح کی جو روش اختیار کی ہے اس پر مختصر اظہار نظر مقصود ہے۔ یہ بات بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فرہنگوں کی تصحیح و ترتیب میں پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے

جس علمی تبحر، فنی ادراک اور گہری ادبی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے، یہ ناچیز اس سے محروم ہے، اور اسی لیے ایک عرصے سے آرزو کے باوجود، میں اس فرہنگ پر تبصرہ کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ لیکن بہرحال آپ حضرات کی اجازت سے فرہنگ قواس پر ایک طالب علمانہ نظر ڈال رہا ہوں۔ فرہنگ قواس تالیف فخر الدین مبارک شاہ قواس غزنوی ساتویں صدی کے اواخر یا آٹھویں صدی کے اوائل میں تالیف ہوئی۔ اس میں پانچ بخش (باب) ہیں۔ ہر بخش میں چند ''گونہ'' (فصل) ہیں۔ اور گونہ چند بہرہ میں منقسم ہے۔ گونہ اور بہرہ کا ایک عنوان دیا گیا ہے اور اسی عنوان سے متعلق الفاظ اور مدخل اس کے تحت بیان کیے گئے ہیں مثلاً گونۂ اول در نام خدائے تعالیٰ، گونۂ دوم در نام چیز ھای پراگندہ، یا بہرۂ نخست در نام پرندگان بزرگ کہ بہ ھوا پرند وغیرہ مؤلف نے الفاظ کے محض معانی لکھے ہیں یا کہیں کہیں نہایت مختصر توضیح بیان کی ہے۔ ہر لفظ کے معانی کی مزید وضاحت کے لیے شاہد کے طور پر التزاماً کسی شاعر کا شعر نقل کیا ہے۔

فرہنگ قواس پروفیسر نذیر احمد صاحب کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ سب سے پہلے ۱۳۵۳ش/۱۹۷۴ء میں تہران سے شائع ہوئی تھی۔ یہ اشاعت فرہنگ قواس کے صرف ایک معلوم و مکشوف قلمی نسخے پر مبنی تھی جو ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتے میں محفوظ ہے۔ یہ خطی نسخہ بعض لحاظ سے نامکمل تھا اس لیے یہ اشاعت بھی کتاب کی نامکمل صورت پیش کرتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد نذیر صاحب کو فرہنگ قواس کا ایک مکمل مخطوطہ دستیاب ہوا اور آپ نے پچھلی نامکمل اشاعت کو اس نسخے کی مدد سے مکمل کیا جو رامپور رضا لائبریری سے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

فرہنگ قواس کو اب تک دستیاب اطلاعات اور انکشافات کے مطابق فارسی کی دوسری قدیم ترین فرہنگ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ نذیر صاحب نے اس کی ترتیب و تصحیح میں جس علمی و تحقیقی رویّے کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے اس فرہنگ کی دوسری اشاعت کو ایک منفرد مقام عطا کردیا ہے۔ اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ پروفیسر نذیر صاحب نے اصل فرہنگ کے ایک ایک لفظ پر غور و خوض کیا ہے، اور ہر لفظ پر حاشیہ لکھا ہے۔ آپ نے حواشی میں صرف اختلاف نسخ کی نشاندھی نہیں کی ہے، بلکہ ایک ایک لفظ پر دوسری قدیم و جدید فرہنگوں کی بنیاد پر اجمالی تبصرہ کیا ہے۔ فرہنگ قواس کے مندرجات کا دوسری فرہنگوں سے اس طرح توجہ سے مقابلہ کیا ہے کہ فرہنگ قواس پر حواشی، خود فرہنگ قواس کی ایک زیادہ بہتر، مستند اور معتبر شکل میں سامنے آئے ہیں۔ مزید برآں حواشی میں بعض دوسری فرہنگوں کے محاسن و معائب بھی غالباً سب سے پہلے ان حواشی ہی میں نظر آتے ہیں اور یہ ایک عظیم علمی و ادبی خدمت ہے جو ان حواشی کے ذریعے نذیر صاحب نے انجام دی ہے۔

مطبوعہ فرہنگ قواس پر پروفیسر نذیر صاحب کا مفصل مقدمہ خاصہ کی چیز ہے۔ مرتب محترم نے اس میں فرہنگ قواس کے مؤلف علاؤالدین خلجی کے دور (۶۹۵/۱۲۹۶-۷۱۶/۱۳۱۶) کے فخر الدین مبارک قواس غزنوی کے مختلف مآخذ سے تعارف کے بعد فرہنگ قواس پر علمی تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ اب تک کی اطلاعات کے

مطابق ،لغت فرس اسدی طوسی (متوفی: ۴۶۵ / ۱۰۷۲) کو فارسی کی قدیم ترین فرہنگ سمجھا جاتا ہے، اور یہ صحیح ہے، لیکن فرہنگ قواس کو دوسری قدیم ترین فرہنگ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ صحاح الفرس کے مرتب طاعتی صاحب کا یہ خیال کہ ۷۲۷ھ/ ۲۷-۱۳۲۶ میں تالیف ہونے والی یہ فرہنگ لغت فرس اسدی کے بعد قدیم ترین فرہنگ ہے۔ نذیر صاحب کی اس تحقیق اور انکشاف کے بعد بے معنی ہو جاتا ہے۔

نذیر صاحب نے اپنے مقدمے میں فرہنگِ قواس کی تالیف کا سبب، اس کا انتساب، اس کے مندرجات، اسکے مآخذ و منابع، لغت فرس اسدی اور فرہنگِ قواس میں معانی و مفاہیم کے بیان میں مماثلت، فرہنگ قواس کی خصوصیات، اس کا دوسری فرہنگوں سے مقابلہ، اس کے بعض تسامحات، اس کی زبان اور انداز بیان، اس کے خطی نسخوں کا مفصل تعارف، دوسری فرہنگوں میں اس فرہنگ سے نقل واقتباس وغیرہ پر اظہارِ نظر کیا ہے کہ یہ تمام امور فرہنگ قواس کی اہمیت اور اس کے مقام کے تعین کے لیے ضروری ہیں۔

پروفیسر نذیر صاحب نے فرہنگ قواس کی تصحیح و ترتیب میں پچھتر مآخذ سے مدد لی ہے۔ ان میں چھتیس (۳۶) فرہنگیں، تیئس (۲۳) دیوان اور دیگر منظومات، چودہ تاریخ کی کتابیں اور چند دیگر ادبی مآخذ شامل ہیں۔ منابع و مراجع کی یہ تعداد ہی نذیر صاحب کی اس محنت اور مشقت کا پتا دیتی ہے جو آپ نے اس فرہنگ کی ترتیب میں برداشت کی ہے۔

اس فرہنگ کی ترتیب میں پروفیسر نذیر صاحب کی تنقیدی نگاہ خود مصنف کے مقدمے ہی سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ مصنف نے فرہنگ کی وجہ تالیف کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس نے یہ فرہنگ شاهنامۂ فردوسی کے الفاظ کی وضاحت کے لیے تالیف کی ہے۔ اس نے شاهنامے کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ پہلوی الفاظ کو کاغذ پر لکھا اور دوسری فرہنگوں کی مدد سے ان پر نگاہ ڈالی ہے اور یہ فرہنگ تالیف کی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے فرہنگ قواس کو فرہنگ شاهنامہ بھی کہا گیا ہے۔ نذیر صاحب مؤلف کے اس دعوی کو قبول نہیں کرتے۔ ان کی تحقیق اور دریافت یہ ہے کہ قواس نے شاهد کے طور پر شاهنامے کے اکثر ابیات وہی نقل کیے ہیں جو لغت فرس اسدی میں شامل ہیں اور لغت فرس فرہنگ قواس کا ایک اہم مآخذ ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ قواس نے وضاحت کے قابل الفاظ بلا واسطہ شاهنامے سے نہیں، بلکہ لغت فرس اسدی سے اخذ کیے ہیں۔

نذیر صاحب نے مقدمے میں ایک دوسری جگہ دلچسپ گرفت یہ کی ہے کہ مصنف اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف میں یہ جملہ لکھتا ہے: دوست پرور دشمن کُش کہ آصف برخیا پیشکارش و بزرجمہر بینا خوالستان دارش سزد۔ اب اس جملے میں خوالستان دار پر حاشیے لکھتے ہیں کہ ــ

خوالستان بہ معنی دوات، لهٰذا خوالستان دار بہ معنی کسی کہ دوات را بر دست دارد تا نویسندہ

را درنوشتن آسانی باشد، لہٰذا دوات دار منصبی بودہ است و مترادف خوالستان دار نیست۔

مرتب محترم نے اپنے حواشی میں بعض صفات والفاظ وغیرہ کے بارے میں یہ نشاندھی بھی کی ہے کہ انھیں سب سے پہلے کس مصنف نے اپنی کس کتاب میں استعمال کیا ہے۔ فرہنگ قواس کے مقدّمے میں مصنف نے لکھا ہے :

نخست شاھنامہ را کہ شاہِ نامہ ھاست، پیش آوردم، از سرتا پا خانہ خانہ فرو خواندم۔

نذیر صاحب شاہِ نامہ پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ راحۃ الصدورِ راوندی (ص ۵۹) میں یہ جملہ آیا ہے کہ:

در شاھنامہ کہ شاہِ نامہ و سر دفتر کتابہاست۔

نذیر صاحب نے راحۃ الصدور سے یہ جملہ اسی لیے نقل کیا ہے کہ ان کا ذھن اس طرف منتقل ہوا کہ غالباً مصنف فرہنگِ قواس نے شاھنامہ کے لیے شاہِ نامہ کی جو صفت اختیار کی ہے، ممکن ہے راحۃ الصدور ہی سے اخذ کی ہو۔ یہاں عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ اس نوعیت کا کام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب متعدد کتابیں مرتب کی نظر سے گزر چکی ہوں اور صرف اس کے مطالب ہی نہیں بلکہ حتی اس میں استعمال ہونے والی خاص زبان وتراکیب وصفات بھی اس کے ذھن میں متحضر ہوں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، فرہنگِ قواس میں تقریباً ہر لفظ کے معانی ومفہوم کی وضاحت کے لیے مصنف نے مختلف شعرا کے کلام سے شواھد پیش کیے ہیں۔ یہ فرہنگ ۶۹۵/۹۶-۱۲۹۵ اور ۷۱۶/۱۳۱۶ کے درمیان کسی وقت تالیف ہوئی ہے۔ اس دور سے پہلے کے حتّٰی کہ مشہور شعرا کا کلام بھی مکمل صورت میں ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ اور جن شعرا کے دواوین شائع ہوئے ہیں، وہ مکمل نہیں۔ ایسی صورت میں اگر ان قدیم شعرا کا ایسا ایک شعر بھی کسی قدیم مأخذ سے دستیاب ہوتا ہے جو اس کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، تو یہ ایک اہم دریافت سمجھی جائے گی۔ نذیر صاحب نے اسی صورت حال کے پیشِ نظر فرہنگ قواس میں منقول ایسے متعدد اشعار کی نشاندھی کی ہے جو بعض قدیم شعرا کے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں۔ یہ خود ایک اہم کام ہے۔ اگر ایسے اشعار نذیر صاحب کے حواشی سے جمع کر لیے جائیں تو یہ فارسی کے منظوم ادب میں اضافہ ہوگا۔ اس ضمن میں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرہنگ قواس میں لفظ ''پرن'' سے متعلق یہ توضیح کی گئی ہے :

پرن : پروین را گویند فرخی گوید :

تا چو خورشید نتابد ناھید   تا دو پیکر نبود ھمچو پرن

اس بیت پر نذیر صاحب حاشیہ لکھتے ہیں: این بیت در دیوان فرخی چاپ دبیر سیاقی شامل نیست، لہٰذا در فرس ۳۶۱، صحاح ۲۳۵ بہ نام شاھد درج است۔

فرخی اور دوسرے بعض قدیم شعرا کے اس نوعیت کے متعدد ابیات فرہنگ قواس میں منقول ہیں، جو فرخی کے

ناقص دستیاب کلام کی تکمیل میں معاون ہوں گے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فرہنگ قواس کے حواشی میں ایسے ابیات کی بھی نشاندھی کی ہے جو اس فرہنگ میں درست اور متعلقہ شعرا کے دواوین میں نادرست (مغلوط) شائع ہوئے ہیں۔ سوزنی کا یہ شعر اس کے مطبوعہ دیوان میں مغلوط شائع ہوا ہے :

دو کس را حق حرمت دار دو بس　　　　به در دو دیگران را یال وتبوز

فارسی کے قدیم شعرا کے کلام میں الحاق کا مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ ہے۔ نذیر صاحب نے خود اس موضوع پر اپنے چند مقالات میں اظہار نظر کیا ہے، الحاقی کلام کی نشاندہی بھی کی ہے۔ فرہنگ قواس کی تصحیح کے وقت یہ مسئلہ بھی پروفیسر نذیر صاحب کے مدّ نظر رہا ہے۔ فرہنگ قواس میں لفظ کیان کے معانی کی وضاحت کے لیے مصنف نے نظامی کی لیلی و مجنون سے یہ بیت نقل کی ہے :

دیلم کلہ ایم دلستان بود　　　　در جلہ کیا نیم ہمان بود

مطبوعہ لیلی و مجنون میں مرتب نے اس بیت کو الحاقی سمجھا ہے۔ نذیر صاحب فرہنگ قواس میں اس بیت کے نظامی سے انتساب پر اسے الحاقی قرار نہیں دیتے اور یہ خیال درست اس لیے کہ فرہنگ قواس ایک قدیم مأخذ ہے اس لیے جب تک قطعی طور پر یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے، نظامی سے اس کے انتساب کو قبول کرنے میں تردد نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ محترم نذیر صاحب نے فرہنگ قواس کے غلط انتساب پر بھی گرفت کی ہے۔ مصنف نے یہ بیت :

شہریاری کہ خلافش طلبد زود فتد　　　　از زخن زار بہ خارستان واز کاخ بہ کار

خسروی نام کے شاعر سے منسوب کیا ہے۔ نذیر صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ بیت دیگر فرہنگوں میں فرخی سے منسوب ہے اور فرخی کے مطبوعہ دیوان میں موجود بھی ہے، اس لیے مصنف نے اسے خسروی سے نادرست منسوب کیا ہے۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فرہنگ قواس کی سب سے پہلے اس کے ایک نامکمل نسخے کی بنیاد پر تصحیح کی تھی۔ اس نسخے کی بعض نامکمل عبارتیں اور حتی بیت شاھد بھی آپ نے قیاسی طور پر قوسین میں درج کر دیے تھے۔ فرہنگ قواس کے مکمل نسخے کی دستیابی کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ تصحیح درست تھی۔ اس عمل کو مصحح کے تبحر علمی اور فرہنگ نویسی سے طبعی مناسبت کے علاوہ اور کیا نام دیا جائے اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے :

بہمنجنہ کے بارے میں مؤلف فرہنگ نے لکھا ہے :

اول روز بہمن است بہمنجنہ را تاج دبیر گفتہ است :

اس کے بعد بیت شاھد کلکتے کے نسخے میں مفقود نذیر صاحب نے اپنے قیاس سے تاج دبیر کا وہی شعر درج کر دیا تھا جو

فرہنگ قواس کے مکمل نسخے میں موجود ہے۔ نذیر صاحب نے جہاں اپنی اس قیاسی تصحیح کے درست ہونے پر حاشیے میں بجا طور پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے، وہاں اس بیت کے نقل کرنے اور اسے بیت شاہد کے طور پر ترجیح دینے کی وجہ بھی لکھی ہے کہ اینجانب در فرہنگ قواس چاپی ۷۱ ھمین بیت راقیاسا در قوسین درج کردہ بودم وحدس بندہ معنی براین بود کہ یک بیت از قصیدہ ای کہ شامل بیت مزبور است، برای توضیح کلمۂ شیون (ص ۱۰۱) در کتاب حاضر درج شدہ است۔

فرہنگ قواس میں الفاظ مختلف عناوین کے تحت درج ہوئے ہیں۔ ایک گونہ (فصل) کا عنوان ہے :

درنام آدمی بردوبہرہ۔ اس بہرہ میں مصنف نے یشک کے معانی لکھیں ہے کہ:

چہار دندانِ پیش باشد، عنصری گوید:

بسپاریم دل بجستنِ جنگ　　　　درِدُم اژدھا و یشک نہنگ

مصنف کا یہ تسامح بھی پروفیسر نذیر احمد صاحب کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہا کہ یہ بہرہ تو در "نام آدمی" ہے اور یشک نہنگ اس بہرہ میں شامل نہیں ہونا چاہیے چونکہ یہ تو جانور کے جسم کا ایک حصّہ ہے۔ فرہنگ قواس جس نہج پر ترتیب دی گئی ہے، اس کی تنہا ایک مثال ایران میں نظر آتی ہے اور وہ ہے برہان قاطع مرتبہ استاد محمد معین مرحوم۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ استاد معین پروفیسر نذیر احمد صاحب کے ایرانی اساتذہ میں شامل ہیں۔ استاد معین نے برہان قاطع کی تدوین میں جس علمی وفنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ نذیر صاحب کی مرتبہ فرہنگوں میں بہ نحو احسن جلوہ گر ہے۔

Deptt. of Persian, Delhi University

سید حسن عباس

زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار

[محیط ثالث] کا نادر مخطوطہ

زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار، علی میرزا ابن میرزا ابو طالب دہلوی ثم عظیم آبادی کی ایک بہت اہم تالیف ہے۔ دراصل یہ حاجی علی میرزا متخلص بہ مفتوں عظیم آبادی کا سفرنامۂ حج ہے۔ مصنف کا تعلق دہلی سے تھا لیکن وہ عظیم آباد (پٹنہ) میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ یہ سفرنامہ، جو ایران و عرب کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اس نے وزیر امین الدولہ ناصر جنگ کے نام معنون کیا ہے۔ سفرنامہ اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے جس میں واقعات کی تفصیلات مع جزئیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مصنف کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

یہ سفرنامہ تین محیط (ابواب) پر مشتمل ہے اور ہر محیط مختلف نہروں میں منقسم ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود اس کتاب کے مخطوطے کا نمبر ۶۳۱ و ۶۳۲ ہے۔ یعنی یہ سفرنامہ دو جداگانہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد محیط اول اور دوسری جلد محیط ثانی ہے جبکہ تیسری جلد جو محیط ثالث ہے، ابھی تک گمنامی میں پڑی ہوئی تھی اسکا منحصر بفرد مخطوطہ مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی کے کتب خانے میں موجود ہے جو بہ خط مصنف ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں اس سفرنامہ کی تیسری جلد یعنی ''محیط ثالث'' کا تعارف مقصود ہے۔

جلد اول سے مصنف کا سفر حج شروع ہوتا ہے۔ وہ عظیم آباد سے کشتی کے ذریعے باڑھ، بھاگل پور، راج محل، ہگلی پھر کلکتہ پہونچتا ہے۔ وہاں سے سیلان، مخا، جدہ، مدینہ اور مکہ جاتا ہے۔

دوسری جلد جدہ سے مسقط، شیراز، کازرون، اصفہان، کاشان، نصر آباد، قم، تہران، سمنان، دامغان، نیشاپور اور مشہد اور پھر تہران واپسی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں کاظمین، بغداد، سر من رائے، نینوا، نجف اشرف اور پھر وطن واپسی کا بیان ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ محیط ثالث کے بارے میں گفتگو کی جائے محیط اول و دوم کے بارے میں کچھ معلومات جو خدا بخش لائبریری کی فہرست مخطوطات فارسی میں درج ہیں ضمناً بطور مختصر پیش کی جارہی ہیں۔

محیط اول: مخطوطہ نمبر ۶۳۱، خط نستعلیق، جداول طلائی، عناوین سرخ، تاریخ کتابت ۲۵ رجب ۱۲۴۶ ہجری، بخط میرزا امیر علی شاہجہاں آبادی مقیم عظیم آباد برادر مصنف و بفرمائش مصنف، ۱۲۴، اورق، ۱۴، سطر۔ آبدیدہ۔

آغاز: ''سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجدالحرام ... امابعد بر خاطر دریا مقاطر سیاحان

قلزم بینش...،،

○

ترقیمہ: ''الحمدللہ رب العالمین کہ محیط اولی کتاب زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار بعرصہ یک شہر در شہر عظیم آباد بتاریخ بست وپنجم شہر رجب المرجب ۱۲۴۶ ہجری ...از خط خام مرزا امیر علی موطن شاہجہاں آباد باشندہ حال عظیم آباد بحسب الارشاد... جناب بھائی صاحب قبلہ وکعبہ ام جناب حاجی مرزا صاحب قبلہ کہ مصنفش ذات ممدوح است صفت اختتام پذیرفت''۔

محیط اول میں نو نہریں ہیں جن کی تصفیل یہ ہے۔

نہر اول : ۸ ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۵ء کو عظیم آباد سے مصنف کے سفر کا آغاز ——— بذریعہ کشتی کلکتہ ——— باڑھ، بھاگل پور، راج محل اور ہوگلی کا ذکر

نہر دوم : کلکتہ میں قیام۔ شہر کے حالات کا تذکرہ

نہر سوم : کلکتہ سے روانگی۔ مختلف مسائل کا تذکرہ

نہر چہارم: جدہ کا ذکر

نہر پنجم : مخا کا ذکر

نہر ششم : جدہ پہنچنے اور شہر کا ذکر

نہر ہفتم : مدینہ کا سفر اور شہر کا تذکرہ

نہر ہشتم : مدینہ سے مکہ کو روانگی

نہر نہم : مکہ پہنچنے اور شہر کا ذکر، حرم، مزارات، مساجد اور دیگر مقامات کا تذکرہ۔

جلد اول (محیط اول) مصنف کی جدہ واپسی اور یہاں میر عبداللہ کے گھر پر قیام کے واقعات کے ذکر پر تمام ہوجاتی ہے۔ اس جلد کے آخر میں مصنف نے زیارت اور سفر کی تقسیم بندی کر کے سفر کے مسائل ومشکلات وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

○

محیط دوم: مخطوطہ نمبر ۶۳۲، بہ خط نستعلیق وبقلم مصنف، جداول زرین وطلائی، عناوین سرخ، تاریخ کتابت ۹ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ ۱۷۸ اوراق، ۱۴ سطر، کتاب کے شروع اور آخر میں مصنف کی مہر ''عبدالراجی علی مرزا'' ثبت ہے۔

آغاز : ''المحیط الثانی فی غوص البحار الزاخرہ من الاسفار... برارباب عقول سلیمہ وارباب فطانت صحیحہ ومشتریان

جواہر نفیسہ...''

ترقیمہ : "تمام شد و حسن اختتام یافت این محیط ثانی از کتاب مستطاب زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار از قلم شکستہ رقم مولف حقیر سراپا تقصیر حاجی علی مرزا ابن مرزا ابوطالب مرحوم بتاریخ نہم ماہ جمادی الثانی روز چہار شنبہ ۱۲۴۹''۔

○

محیط ثانی درج ذیل سات انہار پر مشتمل ہے :

نہر اول : مصنف کی جدہ سے مسقط روانگی

نہر دوم : مسقط کے حالات

نہر سوم : مشہد کے لئے روانگی مورخہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء، شیراز —— حافظیہ —— سعدی و حافظ کے مزارات اور کازرون کے حالات۔

نہر چہارم: اصفہان روانگی —— اصفہان جاتے ہوئے جن مقامات اور عمارات کو مصنف نے دیکھا ان کا اور شہر اصفہان کا بیان۔

نہر پنجم : تہران روانگی —— کاشان، نصر آباد اور قم و تہران کے حالات کا بیان۔

نہر ششم : تہران میں قیام —— فتح علی شاہ اور اس کے بیٹے کا تذکرہ نیز ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں ایران و روس کے خراب روابط سے پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر۔

نہر ہفتم : تہران سے مشہد روانگی —— سمنان، دامغان، نیشاپور اور مشہد کا بیان۔

یہ جلد مشہد مقدس اور یہاں واقع حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے روضۂ اطہر کے بیان اور مشہد سے تہران واپسی (بتاریخ جمعہ ۷ صفر ۱۲۴۲ھ) کے ذکر پر ختم ہو جاتی ہے اور مصنف اس کے بعد کے حالات محیط ثالث میں بیان کرنے کا ذکر کرتا ہے، ملاحظہ ہو :

''بتاریخ ہفتم شہر صفر المظفر روز جمعہ صحیحاً سالماً من آفات السفر داخل دار الخلافہ طہران گردید و مال و اسباب جمیع اہل قافلہ از دست بردتر کمانیہ محروس و محفوظ ماند۔ دیگر حالات در محیط ثالث انشاء اللہ تعالیٰ زیب کتابت خواہد یافت''۔

○

واضح رہے کہ پروفیسر شریف حسین قاسمی صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے اس سفرنامہ سے متعلق دو مضامین فارسی میں لکھے ہیں ایک مجلّہ دانش اسلام آباد (پاکستان) کے شمارہ ۱، جلد ۱ (بہار ۱۳۶۴ھ ش/ ۱۴۰۵ھ) بعنوان ''دریچہ

ای بہ شیراز قرن نوزدھم میلادی،، اور دوسرا مجلہ آشنا تہران شمارہ ۲۴''۔ سال چہارم (مرداد و شہریور ۴ ۱۳۷ھ ش) میں بعنوان زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار، دونوں مضامین تعارفی نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکرہ شریف قاسمی نے محیط دوم تصحیح ومقدمہ اور مفید فہارس کے ساتھ حال ہی میں دہلی سے شائع کردیا ہے۔

○

محیط ثالث: حسن اتفاق کہ مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی کے کتب خانے میں دوران مطالعہ مجھے زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار کی تیسری جلد یا محیط ثالث کے مطالعے کا موقع ملا۔ نسخہ اچھی حالت میں ہے اور اس کے ظاہری کوائف سے پتا چلتا ہے کہ یہ مؤلف کا نسخہ ہے جو دونوں محیط سے بچھڑ کر مدرسہ سلیمانیہ کے کتب خانے کی زینت بن گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ پورا نسخہ پٹنہ ہی میں موجود ہے۔ محیط ثالث بھی محیط ثانی کی طرح اہم ہے کیونکہ یہ خود مصنف کا نوشتہ ہے۔

نسخہ کی کیفیت: مخطوطہ خوشخط نستعلیق میں ہے بخط قلم شکستہ رقم الراجی حاجی علی مرزا بتاریخ بست وہفتم جمادی الثانی سنہ یک ہزار دو صد و پنجاہ و دو ہجری (۲۷ جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ) ۳۰۵ صفحات، سرلوح وجداول طلائی وعناوین سرخ۔ شمارہ ۶۷، با تقریظ مولوی بشارت علی متخلص بہ خفا عظیم آبادی۔

آغاز: ''الحیط الثالث من بحرنا الزخار اعنی کتابنا زبدۃ الاخبار بر نقود دانش صیارفہ بیان اقمشہ بینش سماسرۂ تبیان و طالبان اخبار صحیفہ ہر دیار ......''

ترقیمہ: تمت ہذا الکتاب المستطاب بعنوان اللہ الملک الوہاب .....از قلم شکستہ رقم الراجی الی رحمۃ ربہ الاعلی حاجی علی مرزا..... بتاریخ بست وہفتم شہر جمادی الثانی سنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و دو ہجری..... عصر روز سعید یوم الاحد الٰہی ایں عروس زیبا نگار محبوب الانظار، اولوالابصار را از چشم بد روزگار و حوادثات لیل ونہار بحفاظت خود محفوظ دار بہ محمد وآلہ الاطہار''۔

اصل کتاب صفحہ ۳۰۵ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد ۱۵ صفحات میں مصنف کے متفرق اشعار ہیں جن پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالی جائے گی۔ سفرنامہ زبدۃ الاخبار کا یہ حصہ یعنی محیط ثالث پانچ نہر اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔

نہر اولی: مشتمل بر دو نہر (ص ۵)

۱۔احوال کاظمین ۲۔ذکر بغداد

نہر دوم: بغداد کے کچھ اور حالات (ص ۴۴)

نہر سوم: سرزمین رائے کا بیان نیز وہاں سے کاظمین میں ورود کے حالات (ص ۵۱)

نہر چہارم: نینوا یعنی ارض مقدس کربلائے معلی کے حالات (ص ۷۱)

نہر پنجم : زیارت نجف اشرف وحالات وغیرہ (ص ۲۰۳)

خاتمہ : فی ذکر المراجعۃ من سفر المبارک الموصوف الی الوطن المالوف (ص ۲۵۱) ۔ (سفر سے وطن واپسی)

اس اجمالی فہرست کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

نہر اول اس حصے میں مصنف نے قم سے کاظمین تک کے احوال سفر بعنوان ''منزل'' بیان کئے ہیں۔ اس حصے میں کئی منازل کا ذکر آیا ہے مثلاً منزل پنجم —— سرداب؛ منزل ششم —— گیو؛ منزل ہفتم —— آشیان؛ منزل ہشتم —— آہنگران؛ منزل نہم —— دیز آباد؛ منزل دہم —— دولت آباد؛ یازدہم —— پرسوہ؛ دوازدہم —— کنگور؛ سیزدہم —— صحنہ؛ چہاردہم —— کوہ بیستون؛ پانزدہم —— کرمان شاہ؛ شانزدہم —— ماہی دشت؛ ہفدہم —— ہارون آباد؛ ہجدہم —— کرن؛ نوزدہم —— پل ذہاب؛ بیستم —— قصر شیرین؛ بیست ویکم —— خانقی (خانقین)؛ بیست ودوم —— قدر آباد؛ بیست وسوم —— شہروان؛ بیست وچہارم —— یعقوبیہ؛ بیست پنجم —— کاظمین۔

اسی طرح نہر دوم، نہر سوم، نہر چہارم و نہر پنجم میں بھی مختلف مقامات کا ذکر منزل اول و منزل دوم کے تحت آیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سفر نامہ لکھتے وقت کس حد تک جزئیات کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں پورے سفر نامہ کے محتویات و مطالب پر روشنی ڈالنا دشوار ہے اس لئے مصنف کی وطن واپسی کی طرف تھوڑا اشارہ کیا جارہا ہے جس کا تفصیلی ذکر اس نے خاتمے میں کیا ہے۔

مصنف نجف اشرف کی زیارت کے بعد کاظمین آتا ہے اور وہاں چودہ دن قیام کرنے کے بعد بغداد آتا ہے۔ مصنف کے ہمراہی مسافروں کی تعداد اٹھارہ تھی جن میں میر منصور علی صاحب نامی مسافر کے اہل وعیال ان کے ہمراہ تھے اور چند خواتین بھی ان اٹھارہ نفر میں شامل تھیں۔ اسباب سفر بحری جہاز سے بغداد بھجوادیے گئے اور خود خچروں کے ذریعہ بغداد پہونچے۔ اثنائے راہ میں بغداد کے ساحل کی طرف چند زیارت گاہیں اور حضرت جعفر طیار کا مزار واقع ہے اس کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہیں سے کچھ فاصلے پر حضرت سلمان فارسی کی قبر شریف واقع ہے۔ الغرض ان مقامات کی زیارت سے مشرف ہوتے ہوئے یہ قافلہ بغداد پہنچتا ہے جو یہاں سے چھ فرسخ کی دوری پر ہے اور مصنف یہاں سے بغداد سات دنوں میں پہنچا۔

بغداد سے بصرہ —— پھر بصرہ کے کچھ حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بیان کے لئے جو عنوان قائم کیا گیا ہے وہ ہے ''ام الامراض بصرہ''۔

بصرہ مصنف ۱۸ ربیع الاول کو بمبئی کے جہاز پر جس کا ناخدا محمد بن عبداللہ تھا، سوار ہوا۔ مسافرین میں پانچ

بیمار ہو گئے تھے اور دوا دارو کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے زہرا بیگم صاحبہ زوجہ حکیم مرزا علی دہلوی کے سات سالہ اکلوتے بیٹے کی حالت غیر ہو گئی۔ خدا خدا کر کے جہاز جزیرۂ خارک پہنچا۔ یہ جزیرہ، بوشہر سے متصل ہے۔ اس وقت یہ علاقہ شیخ عبدالرسول خان دریا بیگی کے زیر حکومت تھا۔ محمد حنیفہ کی قبر بھی یہیں ہیں۔ اس زمانے میں بندر بوشہر کی بھی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ طرح طرح کی بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا کوئی دن نہیں گزرتا تھا جب طاعون کی چپیٹ میں آکر کوئی مرتا نہ ہو۔ مصنف بھی بیمار ہو گیا۔

وہاں سے شیراز و مشہد ہوتے ہوئے بہ ہزار خرابی وتباہی مصنف ۲۴ رشعبان کو بمبئی پہنچتا ہے۔ ایک رات بھنڈی بازار میں حاجی سید حسن رضا کی معیت میں گزاری اور دوسرے دن پانچ روپیہ ماہوار کرایہ پر ایک مکان لے لیا۔ پھر مصنف نے جزیرۂ بمبئی کے حالات لکھے ہیں۔ پھر بمبئی سے پونا، اس کا محل وقوع اور وہاں کے بازاروں کا حال رقم کیا ہے۔ پونا سے اورنگ آباد کے لے ۲۲ رشوال ۱۲۴۴ھ کو روانہ ہوا۔ اورنگ آباد کے حالات — ناگپور — جبل پور — مرزاپور — بنارس وغیرہ کے حالات۔ مصنف ۱۵ جمادالثانی ۱۲۴۵ ہجری کو بنارس پہنچتا ہے اور یہاں شوالہ میں مرزا محمد ابراہیم صاحب اور مرزا عبداللہ کے مکان پر پہنچتا ہے جو مصنف کے قرابت دار تھے۔

○

ص ۲۹۷ پر مولوی بشارت علی متخلص بہ خفا عظیم آبادی کی تقریظ ہے اور مادۂ تاریخ بھی:۔

چہ خوش کرد تالیف مفتون کتاب — کہ اخبار اسفار را شد محیط

دل از روی اخلاص تاریخ گفت — گہر وز جواہر پر است این محیط (۱۲۴۵ھ)

دوسری تاریخ مصنف کے ورود کربلائے معلی در ۱۲۴۳ھ کے موقع پر ملا حسین متخلص بہ گوہر نے کہی تھی۔ یہ قطعہ تاریخ دس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کے آخری دو اشعار یہ ہیں۔

از پی تاریخ سال ختم این فرخ کتاب — کو بنظم ونثر آمد بی عدیل و بی نظیر

طبع گوہر گشت غواص این گہر آمد بدست — از محیط زبدۃ الاخبار لولو باز گیر

مصنف نے بھی محیط ثالث از زبدۃ الاخبار کے لئے قطعہ تاریخ اتمام کہا ہے جو ۱۷ اشعار پر مشتمل ہے۔

ختم چوں یافت ایں کتاب بدیع — مشتمل بر سوانح اسفار

چہ کتابی کہ ہست بشگفتہ — گل معنی در او ہزار ہزار

جستم از دل چو سال اتمامش — شد مشوش بسی از این گفتار

ناگہان خواست از لب جبریل

سال اتمام ''زبدۃ الاخبار'' (۱۲۴۸ھ)

قطعہ تاریخ فراغت از کتابت نسخہ از مصنف :

بخطِ خام خود ہر گہ مؤلف | نمود این نسخۂ زیبا چو ارقام
پی صدق مقالش بی کم و کاست | بشد تاریخ تحریرش ''خط خام'' (۱۲۵۰ھ)

مصنف نے زبدۃ الاخبار میں جگہ جگہ اپنے فارسی اشعار بھی متن میں درج کیے ہیں ایسے اشعار کی بہتات محیط ثالث میں بھی نظر آ جاتی ہیں مثلاً :

- قطعہ در توصیف کاظمین (ص ۳۲)
- قصیدہ در مدح حضرت موسیٰ بن جعفر و حضرت محمد بن علی الجواد (ص ۳۶)
- قطعہ تاریخ ورود مشہد شریف کاظمین (ص ۴۲)
- قطعہ تاریخ و قصیدہ (ص ۵۹)
- رباعی در مدح علی ابن محمد (ص ۶۲)
- رباعی در مدح حسن ابن علی (ص ۶۲)
- قصیدہ در مدح امام عصر (ص ۶۳)
- قطعہ در توصیف سر من رائے (ص ۶۷)
- قطعہ در تعریف ارض مقدس کربلا (ص ۷۴)
- قطعہ در تعریف خاک شفا (ص ۷۴)

پوری کتاب میں اس طرح کے اشعار کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ افسوس کہ مفتونؔ عظیم آبادی جیسے قادر الکلام شاعر کا دیوان موجود نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ اتنے قادر الکلام شاعر کا دیوان ضرور ہوگا یہ اور بات ہے کہ زمانے کے ستم ظریف ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکا ہے یا کہیں پڑا خاک پھانک رہا ہو۔ ایسے میں اگر زبدۃ الاخبار میں موجود ان کا سرمایۂ کلام الگ یکجا کیا جائے تو ایک مختصر دیوان تیار ہو سکتا ہے۔ محیط ثالث کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتونؔ جس طرح فارسی میں اشعار کہا کرتے تھے، اردو میں بھی وہ شاعری کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مصنف نے اس جلد کے آخر میں اپنے فارسی اشعار کے ساتھ اردو اشعار بھی درج کیے ہیں۔

اصل کتاب کے خاتمے کے بعد مفتونؔ نے اپنے جو اشعار لکھے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

- فارسی رباعیاں ۱۸ عدد۔ در حمد و نعت و منقبت (ص ۳۰۶)
- رباعی بطور معما جس سے حضرت علی علیہ السلام کا نام بر آمد ہوتا ہے۔ (ص ۳۰۶)
- قطعہ اردو - ایک عدد (ص ۳۰۸)

گو ہوں خاطی پر ہوں مستظہر ترے افضال سے　　حال یہ پہنچا ہے بے شک زشتئ اعمال سے

.... پانی ہو گیا ہوتے نہیں ہیں بند و بست　　یا قوی الاقویا مت کر زبوں اس حال سے

- منقبت حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ مورخ ۲۲ محرم ۱۲۵۳ھ۔

یہ منقبت مسدس میں ہے اور پہلے بند کا پہلا مصرع کرم خوردہ ہے اس لئے پڑھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ اس میں ۲۹/ بند ہیں ایک بند درج کیا جا رہا ہے۔

وہی نفس نبی بھی جانشین مصطفیٰ برحق
سر مو جائے شک و ریب کچھ اس میں نہیں مطلق
دوئی سمجھے جو اس میں ہے وہ مردک، احول و احمق
یہ وہ ہے نام جس کا ہے خدا کے نام سے مشتق

علی کا نام ہے نام خدا کیا راحت جاں ہے
عصائے پیر ہے، تیغ جواں ہے، حرز طفلاں ہے

○

اس کے بعد بھی مفتوںؔ کے فارسی قطعات و ابیات درج ہوئے ہیں۔ جن کے ذکر سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔

بطور مجموعی اس سفرنامے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیوں کہ یہ اپنی نوعیت کا وہ واحد سفرنامہ ہے جسے ایک ہندستانی مصنف نے فارسی زبان میں قلم بند کیا ہے۔ مصنف شیعہ تھا اس نے اس سفر کے دوران جتنے ائمہ و امام زادوں اور محترم ہستیوں کے مزارات کی زیارت کی ان سب کی تفصیلات مع جزئیات تحریر کی ہیں۔ یوں بھی یہ اس کا زیارتی سفر تھا۔ اس نے عالم اسلام کی معزز ہستیوں کے مزاروں پر حاضری دی اور ان کا ذکر خیر بھی اسی احترام کے جذبے کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے مزاروں کی زیارت کے وقت ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے مزاروں، مساجد اور دیگر اہم عمارتوں پر درج یا موجود کتبوں اور اشعار کی نقلیں بھی اس کتاب میں فراہم کی ہیں۔ اثنائے سفر میں جن جن شخصیات سے ملاقاتیں کیں ان کا ذکر بھی بہت اچھی طرح کیا ہے۔ زبان و بیان پر مصنف کو پوری قدرت و مہارت تھی۔ عربی اقوال و احادیث کے ساتھ اپنے اشعار بھی متن میں جگہ جگہ مضمون کی مناسبت سے پیش کئے ہیں۔ ◉◉◉

سید حسن عباس

تذکرہ ریاض الشعرا (والہ داغستانی) کے ایک مخطوطے کی سرگزشت

کتابوں کے تاج محل رضا لائبریری رام پور میں والہ داغستانی کے فارسی شعرا کے مشہور تذکرے 'ریاض الشعرا' کے دو نسخے ہیں۔ ایک نسخہ جس کا نمبر ۲۴۰۲ ہے، ۱۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ۲۳×$\frac{1}{2}$۳۲ سینٹی میٹر ہے۔ خط نستعلیق سیاہ اور عنوانات سرخ روشنائی سے ہیں۔ تاریخ کتابت صفر ۱۲۰۷ھ ہے۔ اس کے آخری دو صفحات (۱۱۶۹-۷۰) پر اس نسخے کی کچھ دلچسپ سرگذشت بیان کی گئی ہے جو بزبر حسین انیس بلگرامی کے قلم سے ہے۔ مخطوطات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ سرگذشت قابل مطالعہ ہے۔

اس مخطوطے کو نواب بہادر دل خان ناظم حیدر آباد نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶-۱۲۰۰ھ) کے لیے نقل کروایا تھا جسے کئی کاتبوں نے لکھا۔ نقل نویسی کے بعد اس نسخے کو حیدر آباد سے اورنگ آباد بھیجا گیا جہاں مولانا آزاد مقیم تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی کی وفات کے بعد اُن کے پوتے سید امیر حیدر بلگرامی (م-۱۲۱۷ھ) کی کتابوں کے ہمراہ یہ نسخہ بلگرام پہنچا۔ اُس وقت امیر حیدر بلگرامی کلکتہ میں مفتی محکمہ عدالت شریعت تھے۔ یہ نسخہ اُن کے پاس کلکتہ پہنچا۔ امیر حیدر بلگرامی کے ایک بھاگل پوری دوست منشی وقار محمد جمیل نے اس نسخے کی نقل چاہی۔ امیر حیدر بلگرامی نے ایک نقل تیار کروا کر بھاگل پور بھیج دی۔ چوں کہ اس نقل کا اصل سے مقابلہ نہیں کیا جا سکا تھا اس لیے انھوں نے امیر حیدر بلگرامی سے اصل نسخہ کلکتہ سے منگوایا۔ امیر حیدر بلگرامی نے مذکورہ نسخے کے ساتھ بزبر حسین بلگرامی متخلص بہ انیس کو اس کام پر مامور کیا۔ انھوں نے آٹھ ماہ اور چند دنوں کے دوران مقابلہ کیا۔ مقابلے کے دوران غلطیوں کو دور کیا۔ کاتب نسخہ کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں تھا اس لیے غلطیاں بھی کافی تھیں۔ اس نے جہاں املا کی اور بہت سی غلطیاں کی تھیں وہیں 'صفت' کو 'ص' کے بجائے 'س' سے اور 'سفارش' کو 'س' کے بجائے 'ص' سے لکھا تھا۔ انیس بلگرامی نے کاتب کے لئے لفظ 'حمار' کا استعمال کیا ہے۔ انیس بلگرامی نے ۲۰/ ذی الحجہ ۱۲۱۰ھ کو مقابلے کا کام شروع کیا اور ۱۱/ شعبان ۱۲۱۱ھ کو مکمل کیا۔ اُس نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جس میں مقابلے کی تاریخ نظم کی ہے۔ قطعہ یہ ہے :

منت خدای را کہ پس از محنت انیس
اغلاط این کتاب ز ہر باب فصل شد
حرفی کہ ماند از قلم کاتب حمار
آن ہم بزور بازوی تصحیح و وصل شد
تاریخ این مقابلہ را زد رقم انیس
''این نقل دلکشایی مقابل ز اصل شد'' ۱۲۱۱ھ

واضح رہے کہ پروفیسر شریف حسین قاسمی (شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی) نے اس تذکرے کی ترتیب و تدوین کی ہے جسے رضا لائبریری نے شائع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمود فتاحی (شعبۂ فارسی دانشگاہ تربیت معلم تہران) نے ''نگاهی بہ تذکرہ ریاض الشعرای والہ داغستانی'' کے عنوان سے فارسی میں ایک مقالہ تہران میں شائع کیا ہے۔ ❊❊❊

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس

''نعت رنگ'' کراچی ——— ایک مطالعہ

اُردو صحافت بالخصوص اردو کی مجلاتی صحافت کا دامن رسائل و مجلات کے تنوع اور موضوعات کی بوقلمونی سے مالا مال ہے۔ اردو میں علمی، ادبی، سائنسی اور مذہبی رسائل تو شایع ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن گزشتہ عشرے کے دوران پاکستان سے بعض ایسے رسائل کے اجرا کا سلسل چل پڑا جو صرف ''نعت'' کے لیے مخصوص ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا نام راجا رشید محمود کے رسالے ماہنامہ ''نعت'' لاہور کا ہے جو ۱۹۸۸ء میں جاری ہوا۔ اردو رسائل و جرائد کی تاریخ میں راجا رشید محمود کے اس رسالے سے قبل کوئی ایسا رسالہ نہیں ملتا جو تمام و کمال صرف نعتیہ ادب کے لیے مخصوص ہو۔ نعتیہ صحافت کی روایت کو آگے بڑھانے میں ادیب رائے پوری کا ماہنامہ ''نوائے نعت'' (کراچی) منیر قصوری کا رسالہ ''ایوان نعت'' شہزاد احمد کا ماہنامہ ''حمد و نعت'' (کراچی) اور طاہر سلطانی کا رسالہ ''جہانِ احمد'' نہایت سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ ان رسائل کی بدولت پاکستان میں نعتیہ صحافت اردو صحافت کے ایک اہم اور منفرد شعبے کے طور پر ابھر آئی ہے۔ حال ہی میں نعتیہ رسائل کے اس خوشۂ پروین میں ایک نئے ستارے کا اضافہ ہوا ہے جس کا نام ''نعت رنگ'' ہے۔ اس کے مدیر صبیح رحمانی ہیں جو پاکستان کے نہایت مقبول و خوش لحن نعت خواں اور تازہ فکر و تازہ اسلوب نعت گو شاعر ہیں۔ صبیح رحمانی کے اسلاف سرزمین دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ نعت خوانی اور نعت گوئی کے علاوہ نعتیہ ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں صبیح رحمانی کا اہم کارنامہ نعتیہ مجلّے ''نعت رنگ'' کا اجرا ہے۔ ''نعت رنگ'' نعتیہ ادب کا یادگار کتابی سلسلہ ہے جس کا پہلا شمارہ ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ پیش نظر شمارہ اس کی گیارھویں اشاعت ہے۔ یہ شمارہ بھی گزشتہ اشاعتوں کی طرح مستقل کتاب کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں نعتیہ ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین اور نعتیہ تخلیقات شامل ہیں۔

پیش نظر شمارے کا پہلا مضمون ''اردو نعت میں 'صلعم' کا استعمال اور اس کے مضمرات'' ہے جس میں مقالہ نگار رشید وارثی نے بتایا کہ ''صلعم'' عربی لغت کے اعتبار سے ایک مہمل لفظ ہے۔ لہٰذا اسے آنحضرتؐ کے اسم گرامی کے ساتھ درود شریف کے متبادل کے طور پر نہیں لکھنا چاہیے۔ ان کی تشویش بجا ہے کہ بعض معروف نعت گو شعرا اور مقررین بھی ''صلعم'' کو درود شریف کا صیغہ سمجھ کر تقریر و تحریر میں اسے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسرا مقالہ پروفیسر محمد اکرم رضا نے بعنوان ''نعت اور احترام بارگاہ رسالت مآبؐ '' لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے نعت گوئی کے سلسلے میں صدق و اخلاص اور عشق و عقیدت کے ساتھ آنحضرتؐ کے ادب و احترام کے نازک تقاضوں پر زور دیا ہے۔ یہ مقالہ تقریباً اسّی صفحات کو محیط ہے۔ نعت کے نمونوں میں انتخابیت کو بروئے کار لایا جاتا تو بیس صفحات میں اس کی سمائی ممکن تھی۔

تیسرا مقالہ ''نعت کے موضوعات'' ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری کا ہے۔ اس میں انھوں نے نعتیہ شاعری کے مواضیع کی تفصیلی فہرست دی ہے۔ انھوں نے نعت میں اسرائیلی روایات اور ہندوی اثرات کے رواج پر تنقید کی ہے

کیونکہ اس سے شانِ الوہیت اور شانِ رسالت کا استخفاف ہوتا ہے۔ مقالہ نگار نے عید میلاد النبیؐ پر محمد قلی قطب شاہ کی نظموں پر میلاد نامہ کا اطلاق کیا ہے اور داؤد (مصنف ''چندائن'') کو اردو کا پہلا تخلیق کار بتایا ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں معراج نامہ کی روایت کو حضرت سید محمد گیسو درازؒ سے منسوب کیا ہے۔ یہ سارے مزعومات تحقیقی اعتبار سے محل نظر ہیں۔

ظہیر غازی پوری کا مقالہ ''نعتیہ شاعری کے لوازمات'' اپنے موضوع پر ایک جامع مقالہ ہے جس میں انھوں نے نعت گوئی کے لوازمات کی صراحت کرتے ہوئے متقدمین اور متاخرین شعرا کے ہاں عدم اعتدال اور افراط و تفریط کے نمونوں کی نشاندہی کی ہے اور نعتیہ شاعری کو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے معیاری، بلیغ اور بامعنی بنانے پر زور دیا ہے۔ شفقت رضوی نے اپنے مقالے ''گفتنی ناگفتنی'' میں ان شاعروں پر نکیر کی ہے جو عقیدے کے اعتبار سے الحاد و اباحیت کے گرفتار اور اسلام بیزار ہیں لیکن شہرت کی ہوس میں حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ بھی لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف جمیل فلاحی کا مقالہ شاعرِ رسولؐ حضرت حسانؓ کی نعتیہ شاعری کے تفصیلی مطالعہ پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری کا مضمون ''اقبال کی رباعیات'' میں نعت ایک اہم تحریر ہے جس میں ''ارمغان حجاز'' کی رباعیات میں نعتیہ عناصر کی تحسین و تفہیم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے اپنے مضمون میں مشہور مصری شاعر احمد شوقی بک (م-۱۹۳۲ء) کے نعتیہ قصیدے ''الھمزیۃ النبویہ'' کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد اقبال نے بیدم شاہ وارثی اور پروفیسر جعفر بلوچ نے علیم ناصری کی نعت گوئی پر مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین و مقالات کے علاوہ اس شمارے میں نعتیہ شاعری کے مختلف مجموعوں اور نعت کے حوالے سے لکھی جانے والی تحقیقی و تنقیدی کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں جو بیشتر تعارفی نوعیت کے ہیں۔ نعتیہ تخلیقات کا حصہ بھی نہایت وقیع اور معیاری ہے۔ اس حصے میں عاصی کرنالی، ریاض مجید، طلحہ رضوی برق، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر محمد علی اثر، مناظر عاشق ہرگانوی اور ظہیر غازی پوری کی نعتیں شامل ہیں۔

رسالے کے آخر میں مبین مرزا کا ایک مختصر لیکن اہم مضمون ''لفظ نعت کا استعمال'' شایع کیا گیا ہے۔ بھارت کے صلاح الدین پرویز نے ہندی گیتوں کے اسلوب میں شری کرشن جی کی تعریف میں ایک نظم لکھی اور اس پر ''نعت'' کا عنوان لگایا۔ پاکستان کے نقاد جیلانی کامران نے اس عنوان کے جواز میں مضمون لکھا۔ مبین مرزا نے اس پر گرفت کرتے ہوئے قطعیت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ نعت محض ایک لفظ نہیں بلکہ شعر و ادب کی مسلمہ اصطلاح ہے جو صرف مدحتِ خیر الانامؐ سے مخصوص ہے۔ ہر کس و ناکس کی قصیدہ خوانی کو نعت کا عنوان دینا گستاخانہ جسارت ہے جو قابل مذمت ہے۔ تبصرہ نگار کو مقالہ نگار کے موقف سے کلی اتفاق ہے۔

نعت رنگ کا سرورق نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ کتابت اور طباعت روشن اور جاذب نظر ہے۔ اس رسالے کے مشمولات نعت کے موضوعات، لوازم و اسلوب، مقاصد و محرکات اور نعتیہ شاعری کی تحقیق و تنقید اور تفہیم و تحسین پر مبنی ہیں۔ نعتیہ صحافت کے میدان میں ''نعت رنگ'' ایک اہم اضافہ ہے جس نے نعتیہ ادب کے آسمان پر نعتیہ شاعری کے گہرے، پاکیزہ، روشن اور چمکدار رنگوں کی چھوٹ سے ایک حسین و دلکش قوسِ قزح تخلیق کی ہے۔ یقین ہے کہ نعت کی صنفی شناخت اور معیار بندی میں صحیح رہنمائی کا یہ رسالہ اہم اور موثر کردار انجام دے گا۔ ✿✿✿

احمد یوسف

تاثرات — ایک مطالعہ

'تاثرات' یہ نسیم اختر کے نو مضامین کا مجموعہ ہے جن کی حیثیت تحقیقی و تنقیدی ہے۔ ابتدا میں محمد شفیع الرحمٰن کا ایک پیش لفظ ہے، اور کتاب کی پشت پر غلام سرور کی ایک مختصری تحریر جو بے حد جامع اور وقیع ہے۔

'کربل کتھا' اس مجموعہ کا پہلا مضمون ہے جس میں نسیم اختر نے مختار الدین احمد کی اس کدو کاوش کا ذکر کیا ہے جو انہیں 'کربل کتھا' کے ایک نایاب نسخے کے حصول میں اٹھانی پڑی تھی۔ 'کربل کتھا' اردو نثر کے چند ابتدائی کتابوں میں ہے۔ اس کا مخطوطہ مختار الدین صاحب کو جرمنی کے ایک شہر کی لائبریری کے مخطوطات سکشن میں ملا تھا۔ اس کے حصول نے اردو کی قدیم نثر کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا تھا۔

'مسدس حالی اور بھارت بھارتی - ایک تقابلی مطالعہ' دوسرا اہم مقالہ ہے۔ دونوں کتابوں کا تقابلی جائزہ پہلی مرتبہ کسی مصنف نے لیا ہے۔

میتھلی شرن گپت ہندی کے صف اول کے شاعر ہیں، انہوں نے مسدس حالؔی کے Pattern پر ہندی میں ایک قومی نظم 'بھارت بھارتی' لکھی ہے، جس کے کچھ بند تو ایسے ہیں جو صاف صاف 'مسدس حالی' کے بندوں کا ترجمہ نظر آتے ہیں اور بے حد Prosaic ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ نظم 'مسدس حالی' کے مقابلے میں کہیں Stand نہیں کرتی ہے۔

'مسدس حالی' کا تو یہ عالم ہے کہ رسولؐ کی بعثت کے موضوع پر اس کا ایک آدھ بند تو ایسا ہے جو دنیا کی عظیم ترین شاعری کا نمونہ ہے، میری مراد ذیل کی بند سے ہے ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس مضمون میں دونوں کا تقابلی تجزیہ پیش کر کے نسیم اختر نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے۔

'امراؤ جان ادا' کا شمار اردو کے عظیم ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ایک دور تھا کہ کسی ناول یا افسانے کو قاری کے لئے پر کشش بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ اسے حقیقی ناول یا افسانہ لکھ دیا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ناول حقیقی ہو یا فرضی، یہ سرتا سرلا حاصل بحث ہے۔ قصہ مختصر 'امراؤ جان ادا' مصنف کا ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔

نسیم اختر نے 'امرا جان ادا' کے باب میں پروفیسر خورشید الاسلام کا ذکر نہیں کیا ہے، جن کا مقدمہ اس ناول پر

حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس ناول کو سماجی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی بے حد کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ مقدمہ ہمارے سامنے ناول کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے۔

'پہیہ- ایک تجزیہ' میں نسیم اختر نے بہت سارے پردے ہٹائے ہیں۔ انہوں نے ایک وسیع تناظر میں اس افسانے کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کے مطالعہ کا حق ادا کیا ہے۔

غیاث احمد گدی کے افسانوں میں 'پہیہ' کا ایک بڑا مقام ہے۔ کلام حیدری بھی یہی کہتے تھے۔

دراصل لچھورانی کی گاڑی کا ایک پہیہ تو وہ خود ہے اور دوسری جانب جو پہیہ ہے اس کا نام ہم کبھی اُلفت، کبھی سدو اور کبھی گدی جانتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نامرد نہیں، ہاں وہ عمل میں لچھورانی کے مقابلے کا پہیہ ثابت نہیں ہوتے۔

اور یوں جب اسے پٹھان مل گیا تو لچھورانی نے یہ جانا کہ اسے جس برابر کے پہیے کی ضرورت تھی، وہ بالآخر مل گیا۔

خواجہ احمد عباس صف اول کے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے وہ ایک بلند پایہ صحافی اور فلمساز بھی تھے لیکن انہوں نے انگریزی میں لکھی گئی اپنی خودنوشت میں جہاں کئی ہستیوں اور بالخصوص کپور خاندان کے سلسلے میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ہیں وہاں منٹو کے باب میں صرف ڈیڑھ دو سطروں پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ فلمسازی کو اپنی تمام مصروفیتوں میں سب سے زیادہ مقدم جانتے تھے۔ البتہ ان کے 'آزاد قلم' کے حوالے سے نسیم اختر نے جس دانشوری کا جائزہ لیا ہے اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔

'اوپندر ناتھ اشک' میں انہوں نے الہ آباد جا کر اشک صاحب سے ملنے کی مکمل روداد پیش کی ہے۔ ضمناً اشک صاحب نے اپنے کچھ افسانوی مجموعے کا بھی ذکر کیا ہے۔ بیچ بیچ میں ان کی شعر گوئی اور ذاتی زندگی کے بعض اہم راز کا انکشاف بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ یہ ایک پُر لطف ملاقات ہے۔

میرؔ کی شخصیت پر ان کے مضمون کا بیشتر مواد 'ذکر میرؔ' سے حاصل کیا گیا ہے، ہاں نیر مسعود کے ایک مضمون سے بھی انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ میر سولہ برس کے تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر نے دلی پر حملہ کیا، پھر کچھ سال بعد احمد شاہ ابدالی کی یلغار ہوئی۔ اس کے بعد بھی روہیلے، کبھی مراٹھے اور کبھی سکھ دلی پر چڑھائی کر دیتے، تا آنکہ بنگال میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوا۔

میر کو دلی کی بربادی کا غم ہے، پھر بھی وہ جینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لیتے ہیں:

دل و دلی دونوں اگر ہیں خراب   پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہیں

میرؔ نے دل کے رنج والم کو دلی کی بربادی اور شکستگی سے جس طرح Associate کیا ہے وہ ان کے فن کا

کمال ہے:

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے	یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دیدنی ہے شکستگی دل کی	کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
دل کی ویرانی کی وہ حد خرابی کہ نہ پوچھ	جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گذرا

میرؔ کی کفایتِ لفظی خود ایک بڑا فن ہے، پھر وہ جا بجا اپنی ایجاد کردہ ترکیبوں سے معنویت کی ایک دنیا آباد کر دیتے ہیں۔

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو کا ٹپکا	ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا
کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک	مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
اک موج ہوا پیچاں کل میرؔ نظر آئی	شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئی جس کے سبب	....

یہ اور اس نوع کے چالیس پچاس اشعار تلاش کرنے سے میرؔ کے کلیات میں مل جاتے ہیں، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ جس شاعر نے تقریباً ۲۷، ۲۸ ہزار اشعار کہے ہوں اس کے یہاں یہ چالیس پچاس اشعار کس شمار و قطار میں ہیں۔ اور پھر یہ کہ یہ ان کے نمائندہ اشعار بھی نہیں ہیں۔ شاعر کی قدر و قیمت کا تعین تو اس کے نمائندہ اشعار سے کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ میرؔ کی شخصیت کے جن متضاد پہلوؤں کو نسیم اختر نے جس طرح یکجا کر دیا ہے اور جو سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں ان سے انکار کی گنجائش نہیں۔

کلیم عاجز کہتے ہیں:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے	کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

ان کی ایک نمائندہ غزل کے دو شعر سنتے چلئے:

زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو	جو دل میں رکھیو وہی سب کے روبرو رکھیو
اڑا نہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں	بچا کے دل کے پیالوں میں کچھ لہو رکھیو

یہ صحیح ہے کہ یہ لب و لہجہ میرؔ کا ہے لیکن کلیم عاجزؔ بڑے شاعر اس لئے نہیں ہیں کہ وہ میرؔ کے لب و لہجے کے خوشہ چیں ہیں بلکہ اس لئے ہیں کہ ان کے یہاں احتجاج کی وہی تند و تیز لہریں ملتی ہیں جو میر کی شاعری کا خاصہ بنی۔ وہی انسان دوستی، وہی وطن دوستی اور وہی کج کلاہی جو میرؔ کو میر بناتی ہے، کلیم عاجزؔ کے یہاں بھی بدرجۂ اتم مل جاتی ہے۔

لب و لہجے کا تو یہ حال ہے کہ داغؔ کے درجنوں شاگرد اس سبب سے ڈوب گئے کہ انہوں نے محض اپنے استاد کے رنگ میں شعر گوئی کو اپنے لئے سب سے بڑا اعجاز قرار دیا۔

میرؔ کی پیدائش ۱۷۲۳ء کی ہے۔ کلیم عاجزؔ ان کے دو سو سال بعد ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ دنیا بدل چکی تھی لیکن ظلم و استبداد اور جبر و استحصال دوسری شکل میں اس وقت بھی موجود تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی میرؔ کی طرح بلکہ یوں کہیئے کہ میرؔ نے بڑے شاعر کی طرح زبردست احتجاج بلند کیا ہے :

تو نہیں شہر ستمگراں، میں گدائے کوچہ عاشقاں ۔۔۔ تو امیر ہے تو بتا مجھے، میں غریب ہوں تو برا ہے کیا

ابھی تیرا عہد شباب ہے ابھی کیا حساب و کتاب ہے ۔۔۔ ابھی کیا نہ ہوگا جہاں میں ابھی اس جہاں میں ہوا ہے کیا

دیکھیے جب وہ میرؔ کے انداز میں بڑی ترکیب وضع کرتے ہیں تو اپنی شاعری کو کس بلندی پر پہنچا دیتے ہیں :

منصب ساقی گری بھی ہے ولایت کا مقام ۔۔۔ صاحب دل بنے تب صاحب میخانہ بنے

یہاں منصب ساقی گری کی ترکیب سو فیصد کلیم عاجزؔ کی ایجاد کردہ ہے جس کے سبب اس شعر نے انسانیت عظمیٰ کی تاریخ کو اپنے سینے میں سمولیا ہے۔

'نیپال میں اردو' کے متعلق یہ کہنا ہے کہ یہ بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اس کا Survey Work معرکے کی چیز ہے۔ اس مضمون میں سارک ممالک کا بھی ذکر آ گیا ہے، سو میرا خیال ہے کہ اس نوع کا کام اگر وہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالدیپ اور بھوٹان کے سلسلے میں بھی کر دیں تو ہم اردو والے ان سارے ممالک میں اردو کی پوزیشن سے کما حقہ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ بڑا کام ہوگا۔ ●

پروفیسر نیّر مسعود

اُستادِ محترم

(ڈاکٹر نذیر احمد صاحب)

فارسی میں ڈاکٹری کی سند اب جتنی سہل الحصول ہوگئی ہے، پہلے نہیں تھی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ جو اساتذہ تحقیقی مقالہ نگاروں کی رہنمائی کرتے تھے ان کا معیارِ تحقیق بہت بلند اور سخت ہوتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے زیرِ نگرانی لکھا جانے والا مقالہ اُن کے اس معیار کے مطابق ہو۔ میرے والد مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ اس معاملے میں دوسروں سے کچھ زیادہ سخت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی طویل تدریسی زندگی میں اگرچہ کئی طالب علموں نے اُن کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اُن کے معیارِ تحقیق کا ساتھ نہ دے سکنے کی بنا پر یا تو خود ہی ہار کر بیٹھ گئے یا ادیبؔ نے انھیں کوئی دوسرا شغل اختیار کرنے کا مشورہ دے کر اُن کی نگرانی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے صرف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اُن کے زیرِ نگرانی مقالہ مکمل کر کے ڈگری حاصل کی۔ اسی لیے ادیبؔ مرحوم اپنے شاگردوں کی فہرست میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر فخر کے ساتھ کرتے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ اُس وقت بھی اُن کی بے تصنع انکسار آمیز شخصیت مجھے متاثر کرتی تھی۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی کے اساتذہ خاصے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب بہت سادہ، تقریباً مولویانہ، وضع قطع رکھتے تھے، اسی لیے جب میرے بعض ہم جماعتوں نے، جو ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن تھے، یہ بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بیڈمنٹن کے ماہر کھلاڑی ہیں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے والے اس کھیل کا تصور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ خود ڈاکٹر صاحب سے تصدیق کرانے کا موقع نہیں ملا، لیکن ہم جماعتوں نے مجھ کو یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ بتائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی تبحر کا اندازہ تو اُس وقت کیا ہوتا، لیکن یہ دیکھتا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی علمی موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ اُسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک بچہ خناق کے موذی مرض میں گرفتار ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب سخت پریشانی میں مبتلا اور اسپتال میں ساری ساری رات بچے کے سرہانے بیٹھے جاگتے رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ادیبؔ مرحوم سے کہا کہ میں اسپتال میں رات بھر بیکار بیٹھا رہتا ہوں، تشویش کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی۔ اگر آپ اپنے کتب خانے کی کچھ کتابیں مجھے اسپتال میں لے جانے کی اجازت دے دیں تو وہاں ایک آدھ مضمون لکھ لوں۔ ادیبؔ

مرحوم اپنے ذخیرے کی کتابیں گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے اور ان سے ''ادبستان'' ہی میں استفادہ کیا جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے مطلوبہ کتابوں کی فہرست پیش کی اور ادیبؔ نے سب کتابیں نکال کر اُن کے حوالے کر دیں۔ چندروز میں بچہ شفا پا کر گھر آ گیا اور ڈاکٹر صاحب نے ادیبؔ کو اُن کی کتابیں واپس کرتے ہوئے بتایا کہ اسپتال کی ان شب بیداریوں میں قریب پچاس پچاس صفحے کے دو تحقیقی مقالے تیار ہو گئے ہیں۔ ادیبؔ بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعد اکثر جب علمی لگن کی باتؔ ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے ان مقالوں کا ذکر کرتے تھے۔

O

لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو وقائع نعمت خان عالیؔ پڑھاتے تھے۔ یہ فارسی کی مشکل ترین کتابوں میں ہے۔ اس کی لفظی اور معنوی صنعتوں، اشاروں کنایوں اور مدح کے پردے میں ذم کی کارستانیوں کا سمجھنا کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقائع کی عبارتوں کے ہر اہم لفظ کے مختلف معانی کی وضاحت کرتے، پھر عبارت کے ظاہری معنی بتاتے، پھر اس ظاہر کے پیچھے چھپے ہوئے مدعا کو بیان کرتے۔ متن کی تدریس کا صحیح طریقہ یہی ہے جس پر اب کم عمل کیا جاتا ہے۔ انھیں دنوں اردو کے ایک مشہور اور مقتدر نقاد (جو خود بھی معلم تھے) شعبے میں تشریف لائے۔ وہ واقعی ذی علم آدمی تھے لیکن انھیں اپنے ذی علم ہونے کا احساس اس سے زیادہ تھا جتنا ایک حقیقی عالم کو ہونا چاہئے۔ وہ شعبے کے اساتذہ سے گفتگو کر رہے تھے اور ہم طلبہ بھی باادب سن رہے تھے، لیکن مجھ کو ذرا ہی دیر میں اُن کا ادعائی لہجہ اور قولِ فیصل کا سا انداز بُرا لگنے لگا۔ میں ''ادبستان'' کی صحبتوں میں مولانا امتیاز علی عرشیؔ اور مولانا ضیا احمد بدایونی کے سے اکابر کی متین کسرِنفسیاں دیکھ چکا تھا۔ ان بزرگ عالموں کی کسی بات میں علمی پندار کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ خود ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی گفتگو میں مجھے آج تک ادعائیت کی جھلک نہیں ملی، لیکن مذکورہ نقاد اس طنطنے کے ساتھ گرمِ گفتار تھے کہ معلوم ہوتا تھا احتشام صاحب بھی اُن کے شاگرد ہیں، اور احتشام صاحب اپنی خلقی مروت کی وجہ سے اُن کی ہر بات پر صاد کر رہے تھے۔ احتشام صاحب نے انھیں بتایا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کا مشترک شعبہ ہے۔ انھوں نے فارسی نصاب کے بارے میں دو تین سوال کئے، اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ یہاں پہلوی زبان نہیں پڑھائی جاتی، اس کے بعد پہلوی کے متعلق اپنی معلومات کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اردو کے کسی نقاد کا پہلوی زبان کے بارے میں گفتگو کر سکنا قابلِ تعریف بات ہے لیکن انھوں نے کچھ اس طرح بولنا شروع کیا گویا انھیں اس زبان پر کامل عبور حاصل ہے اور اُن کے مخاطبین اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ابھی تک اُن کی بلند آہنگیوں پر خاموش تھے لیکن اب اُن سے نہیں رہا گیا (غالباً اُس وقت تک وہ ایران جا کر پہلوی زبان کا خصوصی مطالعہ بھی کر چکے تھے)۔ انھوں نے بہت ادب کے ساتھ نقاد صاحب کی کسی غلط بیانی کی تصحیح کی۔ موصوف نے ڈاکٹر

صاحب کو گھور کر دیکھا۔ مولویانہ وضع اور طالب علمانہ لہجے والے ایک غیر معروف معلم کی یہ جسارت انھیں پسند نہیں آئی اور انھوں نے تقریباً ڈپٹ کر اپنی بات دُہرائی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اتنے ہی ادب کے ساتھ اُن سے پہلوی کے متعلق دو تین سوال کر لیے۔ پھر دو تین سوال اور۔ ایک سوال غالباً ہُزوارِش کے متعلق بھی تھا۔ نقاد صاحب نے کچھ بولنا شروع تو کر دیا لیکن اب صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان سوالوں کے جواب تو دور رہے، اُن کی سمجھ میں سوال ہی نہیں آئے ہیں۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب کچھ اور سوال کرنے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ آخر احتشام صاحب نے پہلے تو نقاد صاحب کو آنکھ سے خفیف سا اشارہ کیا، پھر نذیر صاحب کو بھی کچھ اشارہ کیا۔ نقاد صاحب خاموش ہو گئے، نذیر صاحب نے بھی کوئی اور سوال نہیں کیا اور یہ موضوع وہیں ختم ہو گیا۔

○

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی تحقیقی تحریروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اب وہ خود بھی اُن کے اعداد و شمار نہیں دے سکتے بلکہ اپنی متعدد تحریروں کو وہ بھول بھی گئے ہیں۔ ایک بار میرے کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اِس موضوع پر ''شاید'' کچھ لکھ چکے ہیں۔ دیر کے بعد انھیں اپنے اس فراموش شدہ مقالے کا حوالہ یاد آیا۔ اس کا سبب اُن کے حافظے کی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب وہ کسی ایک موضوع پر کام میں لگ جاتے ہیں تو پھر اُسی موضوع اور اس کے متعلقات کے ہو رہتے ہیں اور وہ موضوع اس طرح اُن کے ذہن میں بس جاتا ہے کہ بقیہ تحریریں وقتی طور پر حافظے کے نیم تاریک گوشوں میں چلی جاتی ہیں۔ اپنی تکمیل پسندی کی وجہ سے وہ موضوع کے ضمنی پہلوؤں کو بھی تشنۂ تحقیق نہیں چھوڑتے اور اس تحقیق کے دوران اسی موضوع کے متخصص ہو جاتے ہیں۔ کتاب ''نورس'' کا تعلق موسیقی سے ہے۔ اس پر تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے قدیم فنِ موسیقی کے بارے میں بھی تحقیق کی، اور غالباً اسی کتاب سے متعلق تصویروں کے سلسلے میں فنِ مصوری کا بھی جائزہ لیا اور یہ دونوں ضمنی موضوع ان کی تحقیق کا اصل میدان معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشرقی موسیقی اور مصوری کے متخصص مستشرقین نے اپنے کاموں کے سلسلے میں ان سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے پاس مغربی ممالک سے آنے والے خطوں کے لفافوں پر ان کے نام کے ساتھ کبھی ''صدرِ شعبۂ موسیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' اور کبھی ''صدرِ شعبۂ مصوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' لکھا جاتا تھا۔

اسی تکمیل پسندی کے باعث ڈاکٹر صاحب کی علمی تحقیق کے کئی تخصیصی میدان ہو گئے ہیں۔ ظہوریؔ پر ان کا تحقیقی مقالہ اس اہم شاعر پر واحد بڑا کام ہے۔ کتاب ''نورس'' کے ترجمے اور تدوین کے بعد سے وہ اس موضوع پر سب سے مُستند عالم تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ مکاتیب سنائی کی ترتیب و تدوین نے ان کو ایران و افغانستان کے علاوہ ان سب ملکوں میں جہاں فارسی زبان و ادب پر کام ہو رہا ہے، فارسی کا ایک بڑا عالم اور محقق منوالیا ہے۔ دیوانِ حافظؔ کے

قدیم مخطوطوں کی دریافت اور تدوین بھی ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہندوستان سے زیادہ ایران میں کام کیا جارہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا شاید سب سے بڑا کارنامہ فارسی کے قدیم لُغات کی بازیافت، تدوین، تحقیق اور تنقید ہے۔ لسانیات اور کلاسیکی فارسی ادبیات کے میدانوں میں ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیقات سے استفادہ ناگریز ہوگا۔ ہندوستان ہی نہیں ایران میں بھی اس بنیادی نوعیت کے کام کم ہوئے ہیں۔

غالبیات کے میدان میں بھی ڈاکٹر صاحب نے وقیع کام کیا ہے۔ ایک مستقل کتاب ''نقد قاطع برہان'' کے علاوہ انھوں نے غالبؔ کی بعض تلمیحوں مثلاً ترکانِ ایبک، قبچاق، خلخ، نوشاد: خسرو پرویز کے ترنج زر دکت افشار وغیرہ پر جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں وہ ایک طرف کلام غالبؔ کو پوری طرح سمجھنے کی راہ ہموار کرتے ہیں، دوسری طرف ہمیں یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ غالبؔ کے فارسی سرمائے پر ابھی بہت کم کام ہوا ہے اور یہ بھی کہ اس سرمائے کو نظر میں رکھے بغیر ہم غالبؔ فہمی کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے اور اس سلسلے میں عملی قدم بھی اٹھایا ہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی سیمینار جو ڈاکٹر صاحب کے زیر اہتمام ہوتے ہیں، ان کے موضوعات میں غالبؔ کی فارسی نظم ونثر کو بالالتزام شامل کیا جاتا ہے اور ادھر چند سال سے ان سیمناروں میں ایران کے محقق اور نقاد بھی مدعو ہوتے اور مقالے پڑھتے ہیں۔ اس کا بہت خوشگوار اثر یہ مرتب ہوا کہ اب ایران میں غالبؔ کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے ورنہ ابھی تک وہاں غالبؔ کو ژولیدہ فکر اور ناقابل فہم شاعر قرار دے کر نظر انداز کیا جارہا تھا۔ مستقبل میں اگر غالبؔ کو ایران میں مقبولیت حاصل ہوگئی تو یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

○

مزاح نگار شفیق الرحمن نے ایک صاحب کا ذکر کیا ہے جو بحث کرنے کے اتنے شوقین تھے کہ جب بحث کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو ستانے کے لئے بحث کرنے لگتے تھے۔ یہ بات ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے شوق تحریر کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب وہ کچھ لکھنے سے فرصت پاتے یا تھک جاتے ہیں تو آرام کے طور پر کچھ اور لکھنے لگتے ہیں۔ گزشتہ سال (۱۹۹۴ء) ان سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تو میں نے حسب معمول دریافت کیا کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک تحقیقی کام کی تکمیل کی خوش خبری سنا کر بتایا کہ آج کل فرصت ہے اور اس فرصت کے وقت میں وہ فارسی کے اُن قصیدوں پر لکھ رہے ہیں جن میں حکومتوں اور حکم رانوں کے زوال کا ماتم کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں خاقانی کا قصیدہ ؂

ہان ای دل عبرت بین، از دیدہ نظر کن، ہان
ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان

جو ایران کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ ہے، خاقانی ہی کا ایک اور قصیدہ؛ غزوں کے ہاتھوں سلطان سنجر کی تباہی پر انوری کا قصیدہ ۔

برسمر قند اگر بگذری، ای باد سحر

نامۂ اہلِ خراسان ببر خاقان بر

اور ہلاکو کے منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی بربادی، خلافتِ عباسیہ کے خاتمے اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل پر سعدی کا قصیدہ ۔

آسمان را حق بُود گر خون ببارد بر زمین

بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنین

زیرِ تحقیق آئیں گے ۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی فرصت کا یہ حال ہے تو عدیم الفرصتی کا کیا حال ہوگا۔

○

امراض کے کئی حملوں اور ذاتی صدموں کو جھیلنے اور اسّی سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی تصنیفی فعالیت اور تحریری سرگرمیوں میں انحطاط نہیں آیا ہے۔ وہ مرعوب کن علمی شخصیت کے مالک ہیں لیکن ان میں علمی پندار کا دور دور تک پتا نہیں، نجی صحبتوں میں وہ لطائف وظرائف کے پھول بکھیرتے ہیں، خصوصاً اپنے بعض ہم پیشہ حضرات کے ایسے دل چسپ واقعات سناتے ہیں کہ محفل زعفران زار بن جاتی ہے اور وہ خود بھی کھل کر ہنستے ہیں۔ غالباً اسی حسِ مزاح اور شگفتہ خاطری کی وجہ سے اُن پر ماہ و سال کی گردشیں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکی ہیں۔ میں اُن کو ۵۰ء کے آس پاس جیسا دیکھتا تھا کم وبیش ویسے ہی وہ مجھے اب بھی نظر آتے ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ وہ ایک عرصے تک تصنیف وتحقیق میں یک سوئی کے ساتھ منہمک اور خوش وخرم رہیں۔ ہندوستان میں فارسی کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں اس زبان کو اس پائے کا دوسرا عالم اب نصیب نہ ہوگا۔

○

Adabistan, Deen Dayal Road
Lucknow - 226003 (U.P.)

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

ذوقی بلگرامی

میر عبدالواحد ترمذی بلگرامی متخلص بہ واحد و ذوقی، میر حسن بلگرامی کے بڑے بھائی اور میر عظمت اللہ بیخبر کے دوستوں میں تھے۔ ۱۱۳۴ھ/۲۲-۱۷۲۱ء میں لاہور کے قریب راہون نامی گانو میں آپ کو لوگوں نے شہید کر دیا تھا۔ آپ کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ البتہ بیاضوں سے ان کے بعض اشعار کو جمع کیا گیا ہے۔ آپ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے اس فارسی دیوان میں بھی بے شمار ہندی الفاظ ہیں۔ صاحب روز روشن آپ کے متعلق لکھتے ہیں :

''صاحب طبع لطیف و ذہن شریف بود و بہ حلیہ مکارم اخلاق و جائل اوصاف سراپا آراستگی داشت۔ اختر نجابت از جبین مبینش می درخشید و عطر خلق محمدی از گل عنصرش می تراوید۔ شعر بزبان فارسی و ہندی می گفت و جواہر زواہر... اندیشہ می سُفت... صیاد فکرش و حشیان معانی فراوان صید کردہ، از عوارض روزگار مقید رشتۂ شیرازہ نساختہ لہذا اکثری از آن بہ پرواز آمد۔ برخی از اشعار در بیاضہا ثبت بود...''۔

نیز مولف تذکرہ نے ان کے حسب ذیل فارسی اشعار نقل کیے ہیں :

نباشد از گداز دل محبت نامہ ام خالی　　چو بکشایی سر مکتوب من طوفان شود پیدا

گر بود رہ یک قدم بی رہنما دورست دور　　بی اجل نتوان رسیدن گرچہ منزل زیر پاست
نیستم محتاج خضر از فیض سوز خویشتن　　اخگرم خاکستر خویشم بہ از آب بقاست

عمریست در رخ تو تماشایی خودیم　　آئینہ است بسکہ ترا از صفا جبین

آگہ ز دل شکستن بلبل نہ ای ہنوز　　طرف کلاہ خود مگر ای گل ندیدہ ای

مولف شمع انجمن نے ذوقی تخلص کی وجہ سے ان کو 'ذ' کی فہرست میں رکھا ہے۔

نیز وہ لکھتے ہیں :

''سخن شیرینش بہ گلوسوزی نبات است و شعر آبدارش بہ گوارایی آب حیات۔ اورانسخہ

ایست مسمّٰی بہ 'شکرستان خیال' مشتمل برنظم ونثر در وصف حلویات۔ درین نسخہ بہ مناسبت شیرینی ذوقی تخلص می کند ورنہ تخلص اصلی او واحداست''۔

نیز ان کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جن کا تعلق 'حلویات' سے ہے۔

ببیں بسوی چپاتی بدیدۂ انصاف	کہ بی وصال شکر حالت نزاران چیست
غرض ز موسم برسات اولہ و بوندیست	دگرنہ این ہمہ تمہید برق و باراں چیست

آنان کہ پردہ از رخ بوذیقہ وا کنند	آیا بود تواضع صحنی بما کنند
نان از تنور بہر مربا جدا شدہ	لازم بود کہ حق غریبی ادا کنند
در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست	اہمال در تناول فرنی چرا کنند

انجیر را ز شاخ درخت از جدا کنید	پنہان ز چشم بد بلبش آشنا کنید
ہنگام آن شدہ کہ اسیران انبہ را	بر کام دل ز محنت زنداں رہا کنید
آوردہ ام برای شما شربت انار	نوشش کنید و مخلص خود را دعا کنید

ہم ذوقی کو ہندوستان کا ابو اسحٰق اطعمہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کا حلویات سے متعلق دیوان مسمّٰی بہ 'شکرستان خیال' مع رسالہ حلاوت بخش موسوم بہ 'خوان نعمت' مطبع نول کشور سے تیسری مرتبہ جنوری ۱۸۸۲ء/صفر ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوا تھا۔

مٹھائیوں میں متھرا کے پیڑے، قنوج کی بوئی اور گزہ، کالپی کی مصری اور اجین کی اکبری کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ علاوہ برایں حسب ذیل شیرینیوں کا ذکر ملتا ہے :

برفی، بتاشہ، فرنی، شیر برنج، رساول، مزعفر، گز، حلوا، حریرا، نبات، قند، کھاجا، کھجور، مربای انبہ، قلیہ، پاپڑی، جلیبی، ریوڑی —— حسب ذیل مٹھائیوں اور شیرینیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہے :

ماٹھ، بریاں، چوبہ، باشی، جھنجلہ، چوبہ، آش مکلف، شکر پولاد، حلوای مقراضی، قالیف، کافوریان، نور، غپ چپ، شکر پورہ، سوزینہ۔

شیرینی کے علاوہ حسب ذیل میووں کا بھی ذکر ہے :

کھجور، شریفہ، انبہ، پستہ، اناس، انار، بہی، ناشپاتی، انگور اور تربوزہ۔

اس دیوان سے چند اشعار نقل کر رہے ہیں :

نیست گر نان روغنی موجود | با مربا خوش است آبی ھا
بضیافت اگر مرا خوانند | پُر کنند از شکر رکابی ھا
ریوڑی نقل در حساب مگیر | راستی گفته ام حسابی ھا

دیده ام در علم شیرینی حریفاں صد کتاب | کرده ام یک مصرع تبریزی زآنجا انتخاب

اگر چہ فرنی و فالوده نازک ست لطیف | ولی تناول آن ہر دو بی گلاب عبث
کسی کہ عاشق شیرینی است می داند | کہ ز حلاوه میسر شود کباب عبث

چو دل فریب بود ذوقیا ببیں اینک | بوقت چمچہ زدن عشقہای شیر برنج

خوش نماید بنظر صحنک حلوا دم صبح | گرده نان و دگر جام مربا دم صبح

اس مطبوعہ نسخہ میں بین السطور بعض الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں، جیسے: آشام = پیچھ، شکر پولاو = قیمتی از پولاو، صحنی = طبق بزرگ، صحنک = رکابی۔ غالباً صحنی وہی لفظ ہے جسے ہم اپنی زبان میں سینی کہتے ہیں۔

حاشیہ میں ترکیب پختن کھجور خاصہ، گلگلہ، لڈوی ماش، مربای سیب، مربای تمر ہندی، قلیہ، مزعفر پلاو، کباب خطائی، پلاو، مطنجن لعابدار، قبولی بھوری، حلوای زردک، کباب سادہ، پوری، تلادی ماھی وغیرہ۔

اسی طرح ترکیب تیار کردن اردک روی شیریں مغز، اچار لیموں، اچار انبہ وغیرہ دی گئی ہے۔ چوبھ کے لیے لکھا ہے :

'درھند برنج را پختہ بروشکر و روغن انداختہ میوہ چسپانند'۔

شکر پورہ کے لئے کہا ہے :

'سنبوسہ کہ درون آن از قند و مغز بادام نیمہ کوفتہ پُر بود'۔

غپ چپ کے لئے لکھا ہے :

'نوعی از شیرینی'۔

گمروہ کیا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔ شاید مرتب کو بھی معلوم نہ تھا۔

اس دیوان میں سفالیان جمع سفال دیا ہوا ہے جس کے معنی رکابی کے ہیں۔ لیکن مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندستانیوں نے اسے مستعمل کیا ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ ◉◉◉

Former Head Deptt of Persian
Delhi University, Delhi

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

جمیل بدخشی

فارسی کا ایک فراموش شدہ شاعر

محمد جمیل بن بوتراب حارثی بدخشی کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ البتہ ان کے دیوان کے مطالعے سے ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ، شاید منحصر بہ فرد، رام پور رضا لائبریری میں موجود جس میں تقریباً ۵۴۶/ اشعار ہیں، اس کا نمبر ۳۳۷۳ ہے۔ یہ دیوان اس طرح شروع ہوتا ہے :

خداوندا چو طوطی نطق دہ شیرین زبانم را

بشکر نعمت تنگ شکر گردان دہانم را

اس لائبریری میں جمیل کی ایک اور تصنیف بھی موجود ہے جس کا نام 'منتخب العقاید' (منظوم) ہے اور جو ۱۰۱۶ھ/ ۸-۱۶۰۷ء میں کشمیر میں تصنیف ہوئی۔ اس کا نمبر ۴۸۷۰/۴۰۷ ہے۔

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے خوش نہیں تھے اور باہر جا کر خوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

بر ھر گلم فریفت ز بس انجمن مرا

از یاد رفتہ است چو شبنم وطن مرا

جمیل اپنے وطن بدخشاں کو چھوڑ کر ہندوستان میں بنگال میں رہنے لگے تھے :

ھم صفیر بلبل ایران تواند شد جمیل

گر چہ گویا طوطیش در (کشور) بنگالہ شد

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کافی عمر پائی تھی اس لیے کہ انھوں نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے:

جمیل ز ابر بہار خط تو در پیری برنگ عینک سبز است چشم حیران سبز

بزور عشق در پیری جمیل آخر جوان گشتم کمال قامتم شد راست یکسر چون قد تیرم

جمیل حضرت علی اور امام حسین کے عاشقوں میں تھے :

نشہ بادہ اگر خواہند مانند جمیل خویش را بی خود ز مہر ساقی کوثر کنید

جمیل بر سر کرسی نشین ز خاک نجف نما بہ عرش برین فرش آشیانہ خویش

غبار توتیای دیدۂ خورشید می گردد جمیل از دل چو خود را خاک راہ کربلا کردم

ان کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ بنگال سے نجف گئے اور وہیں ۱۰۲۵ھ/ ۱۷-۱۶۱۶ء میں انتقال کیا۔

بنگر از فضل خدا رفتہ ز بنگالہ جمیل

خفتہ در خاک نجف طالع بیدار ببین

جمیل کسی منعم نامی کے گہرے دوستوں اور عاشقوں میں سے تھے :

جمیل از عشق منعم می کند ناصح نمی داند

کہ مہرش روز کی از عاشق دیرینہ برخیزد

جمیل کو اپنی شاعری پر فخر ہے :

از بلبل من جمیل امروز

خوش نغمہ تری درین چمن نیست

بود ہر مقطعش اہل سخن راحجت قاطع

زبان تری کند گویا جمیل از شربت تیغش

بجولان باز آرم توسن فکر سخن باری

جمیل از صید مضمونی ز دل بیرون کنم آری

وہ عمدہ کلام اور ادب کو دنیاوی مال و دولت سے بہتر سمجھتے تھے۔

درنظم و نثر نسخۂ رنگین و آبدار بہتر بود جمیل ز لعل و گہر مرا

وہ شاعری میں جمالی اور شوکت بخاری کے مداح نظر آتے ہیں۔

اگر حسن پری رویان معنی ہست منظورت

جمیل از شوق باید دید دیوان جمالی را

فکر شوکت می گذارد چون ز اقلیم جمیل
از طلا گشتن پشیمانیم ما را کس کنید

اب یہاں ان کے دیوان سے کچھ منتخب اشعار نقل کئے جا رہے ہیں۔

شب وصل است و می گردد دو چار م روز عید اینجا
بیک شامی نہان بوده است صد صبح امید اینجا

بادۂ عیش چو مستان تو در جام کنند
خون دلہا بکف آرند و میش نام کنند

نو بہار آمد و گل برگ تری می خواہم
غنچہ لب، لالہ رخی، سیم بری می خواہم

دل بہ محبت بدہ جلوۂ صد ناز بین
سینۂ خود کن ہدف ناوک انداز بین

آخر میں یہ رباعی بھی بطور نمونہ نقل کی جا رہی ہے۔

زین سالگرہ شد چو ز دل باز گرہ | تا حشر بہر رشتہ کند ناز گرہ
تا نام جہان است خدایا بہ جہان | ہر سال درین رشتہ بہ بند از گرہ

Former Head, Deptt. of Persian.
Delhi University, Delhi

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

ملّا محمد طاہر غنی کشمیری

(حیرت انگیز انکشاف)

راقم حروف نے کشمیر کے مقتدر اخبار 'سری نگر ٹائمز' مورخہ ۴/ جنوری ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں حکیم امتیاز حسین صاحب کا محققانہ اور فاضلانہ مضمون ''غنی کشمیری'' بغائرنظر پڑھا۔ ذیل میں ہم اسی تناظر میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

پروفیسر ایڈورڈ براؤن ماہر ادبیات فارسی کیمبرج یونیورسٹی (م- ۱۹۲۶ء) نے تاریخ ادبیات فارسی (A Literary History of Persia) کی جلد چہارم میں لکھا ہے کہ اہل ایران ہندوستانی فارسی شعرا میں امیر خسرو اور غنی کشمیری کو مستند شاعر مانتے ہیں۔ برصغیر کے عظیم فلسفی شاعر علامہ اقبال غنی کشمیری کو اپنا محبوب شاعر قرار دیتے تھے اور ان کے اشعار پر تضمین بھی لکھتے تھے۔ جاوید نامہ میں علامہ نے غنی کے عمل، کردار اور حسن سیرت کو سراہا اور حریت و آزادی کشمیر کے لئے غنی کو سالار سادات شاہ ہمدان کی طرف مخاطب کر کے کہلواتے ہیں ؎

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد ؟	صید را سودائے صیادی کہ داد ؟
آں برہمن زادگان زندہ دل	لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش	از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست	مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست

ایں دم باد بہاری از کجاست

مجھے بھی عرصۂ دراز سے غنی کے ساتھ دلچسپی ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دیوان غنی کے متعدد قلمی نسخوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ برصغیر کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں بھی نسخے موجود ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے کہ گذشتہ دسمبر میں دیوان غنی کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ مطبوعہ (مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خان لکھنو) ۱۲۶۱ ہجری (مطابق ۱۸۴۵ء) کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنؤ میں میری نظر سے گذرا۔ یہ نہایت ہی کمیاب نسخہ ہے۔ اور ۲۱/ مسطر میں ۱۴۴/ صفحوں پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۱۴۰ سے ۱۴۳ تک ''تمت'' کے تحت غنی کے مختصر حالات معاصرین کے تذکروں سے لکھے گئے ہیں۔ ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے کہ جب ہندوستان سے کوئی شخص ایران جاتا تھا تو میرزا صائب اس سے

دریافت کرتے تھے کہ ''برائے ما تحفہ از ہند آوردہ ؟ وآں عبارت است از اشعار غنیؔ''۔ یہ بھی مشہور ہے کہ صائب کہتے تھے کہ کاش غنی مجھے یہ شعر عنایت کرتے تو میں اس کے عوض اپنا پورا کلام ان کی نذر کرتا ۔

حسنِ سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

دیوان کے آخر میں مرزا محمد علی ماہرؔ اکبر آبادی کا وہ قطعۂ تاریخ بھی ہے جو غنیؔ کی وفات پر لکھا گیا۔ مادہ یہ ہے ''آگاہ سوئے دار بقا از دار فانی شد'' ۱۰۷۹ ہجری۔

آخر میں ''تتمہ'' (خاتمۃ الطبع) کے تحت ذیل کی مفید عبارت درج ہے :

''ایں احقر عباد اللہ الغفور، محمد مصطفیٰ خان ولد حاجی محمد روشن خان مبرور و مغفور ایں نسخۂ ناسخۂ دواوین معاصرین را از شرح عمدۂ شارحین خلیفہ عبدالرزاق یمینی ...... و دیگر نسخِ صحیحۂ قدیمہ و کتب اصطلحاتِ (کذا) لغات و تحشی میر ناصر علی متخلص بہ قیصر بپایۂ تصحیح رسانیدہ و اشعار شعری شعار و دیگر تصانیف لطیفش را بر طبق نسخۂ مرقومہ ۱۱۰۲ھ یکہزار و یک صد و دو بخط ولایت نہایت پسندیدۂ ارباب ایں فن منقول و مرتب کنانیدہ در مطبع مصطفائی واقع محلّہ محمود نگر زیرا کبری دروازہ من محلات بیت السلطنت لکھنو بتاریخ بست و ہفتم رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ پیرایہ طبع پوشانیدہ''۔

یہ نسخہ نہایت دیدہ ریزی اور ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا گیا۔ پورا دیوان متن میں لغات اور حواشی کے ساتھ آراستہ کیا گیا۔ اس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ غنیؔ کے حالات میں دو معاصر تذکروں سے استفادہ کیا گیا ہے :

(۱) تذکرۂ محمد بدیع الزمان نصر آبادی (سال تصنیف ۱۰۸۳ھ۔ مطابق ۱۶۷۲ء)

(۲) تذکرۂ کلمات الشعرا، از محمد افضل سرخوشؔ (سال تصنیف ۱۰۹۳ھ۔ مطابق ۱۶۸۲ء)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرخوش، ملّا طاہر غنی کشمیری کی حیات میں ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں بعہد شاہ جہاں کشمیر آئے تھے اور اغلب ہے کہ غنیؔ سے بھی ملاقات کی ہوگی۔ متذکرہ بالا غنیؔ کے اولین تذکرہ نگاروں نے غنیؔ کا نام ملّا محمد طاہر نمایاں طور پر درج کیا ہے۔ یہی نام غنیؔ کے شاگرد اور مرتب دیوان غنی مسلم نے بھی دیباچۂ دیوان میں لکھا ہے۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں :

''مرحومی مولانا طاہر غنی است کہ بشرفِ ودیعت ایں خزانہ رسیدہ، تخلص غنی ....''

معلوم نہیں کہ خواجہ اعظم دیدہ مری کی تاریخ ''واقعاتِ کشمیر'' کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں غنیؔ کو فرقۂ اشائی سے کیوں کر منسوب کیا گیا ہے۔ ان نسخوں میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ غنیؔ کا انتقال محسن فانی کی وفات کے آٹھ ماہ کے بعد ہوا، جو غلط

ہے۔ دیدہ مری کے الفاظ یہ ہیں :

''درکمال جوانی بعدازواقعہ شیخ محسن فانی بہ ہشت ماہ فوت شد''۔

دراصل فانی کا انتقال غنی کے تین سال کے بعد ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱-۱۶۷۲ء) میں ہوا تھا۔ دیدہ مری کے ایک اور قلمی نسخہ (مملوکہ نیشنل آرکایوز، دہلی) کے صفحہ ۳۹۳ میں غنی کا سال وفات ''درسال ہزار وہشتاد ونہ (۱۰۸۹ھ) لکھا گیا ہے۔

یہ واضح ہوگیا ہے کہ معاصر تذکروں میں غنی کے نام کے ساتھ لفظ ''اشائی'' یا ''عشائی'' درج نہیں ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ الفاظ کہاں سے آئے ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی نے اپنی کتاب ''غنی کشمیری'' (صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۵) مطبوعہ جموں وکشمیر اکادمی.... میں ''اَشائی'' اور ''عشائی'' کی بحث پر کئی صفحے لکھے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) آشائیوں کے مورث اعلیٰ سید علی ہمدانی (وفات ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۵عیسوی) کے ساتھ بخارا سے کشمیر آیا تھا۔ امیر کبیر شاہ ہمدان ہمیشہ اس کے پیچھے نماز عشا پڑھتے تھے۔ اس طرح اس کا لقب عشائی ہوگیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کیسے ''اشائی'' ہوگیا تھا۔ شیروانی صاحب کا (صفحہ ۱۰۷) یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان کے ایک رسالہ ''ہلال'' کراچی (صفحہ ۴۳ بابت جون ۱۹۶۳ء) میں درج ہے کہ غنی کشمیری کے جد بزرگوار کا نام خواجہ سنگین تھا۔ وہ ہر شام سید علی ہمدانی کے ساتھ گزارتے تھے۔ ایک دن وہ غیر حاضر رہے تو شاہ ہمدان نے فرمایا کہ ''عشائی ما کجاست'' (ہمارے عشائی کہاں ہیں؟) اس دن سے وہ عشائی ہوگئے۔

تاریخ حسن جلد اول صفحہ ۱۴۴ میں ''قوم اشائی'' کے عنوان کے تحت درج ہے کہ :

''درزمان سلاطین کشمیر دریں جا آمدہ اند۔ گویند جدِ آنہا از مقام عیشاور کہ دِہے است در ممالک خراسان، آمدہ در مصاحبت بڈشاہ (۸۲۴-۸۷۹ھ مطابق ۱۴۲۴-۱۴۷۴ء) سرفراز شدہ بود۔ حالا مردم کشمیر عیشاورا اشائی مخفف کردہ اند''۔

ترجمہ: ''اشائی قبیلہ سلاطین کشمیر کے زمانہ میں یہاں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اشائیوں کا جد خراسان کے ایک گاؤں عیشاور سے آکر بڈشاہ کی رفاقت میں سرفراز ہوا تھا۔ اب کشمیریوں نے اشائی کو عیشاور کا مخفف بنادیا ہے''۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ عیشاور یا ایشاور کے بارے میں میں نے دریافت کیا کہ کیا خراسان میں کوئی گاؤں یا قصبہ کبھی رہا ہے تو ایرانیوں سے نفی میں جواب ملا۔

جن ایام میں راقم حروف ڈائریکٹوریٹ آف لائبریریز اور ریسرچ سے وابستہ تھا تو اس کی نظر سے خاندان عیشائی کے بارے میں ایک مختصر رسالہ قلمی بیس صفحوں پر مشتمل گزرا تھا۔ رسالے پر کسی کاتب کا نام یا سال کتابت درج نہیں تھا۔ اس کا کاغذ ساٹھ ستر سال پرانا ہوگا۔ اس کی ابتدا میں جو عبارت تھی اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''عیشائیوں کے جد خواجہ سنگرام عشائی حضرت میر سید ہمدانی کے ہمراہ شالکوٹ سے کشمیر آئے اور قطب الدین پورہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ ان کے بیٹے خواجہ ابراہیم تھے اور اِن کے بیٹے خواجہ محمد طاہر رفیق تھے۔ رفیق صاحب کا انتقال ۱۰۰۱ ہجری (۱۵۹۳ء) میں ہوا۔ ان کی چار اولادیں تھیں۔ تین بیٹے اور ایک لڑکی۔ بیٹوں کے نام تھے: (۱) شیخ محمد (۲) شیخ قاسم (۳) شیخ محمد صالح۔ لڑکی کا نام مریم بی بی تھا۔ رسالے میں غنی کشمیری کا نام ونشان نہیں ملتا ہے۔

مشہور مورخ کشمیر محمد الدین فوق کی کتاب ''تاریخ اقوام کشمیر'' مطبوعہ ظفر برادرس لاہور جون ۱۹۳۴ء نہایت کمیاب ہے۔ میرے کتب خانے میں اس کا ایک مکمل نسخہ موجود ہے۔ فوق نے عشائی خاندان اور اس کے مورث اعلیٰ کا ذکر (صفحہ ۲۳۱-۲۳۷) تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ذیل میں انہی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

''عشائی فرقہ موضع عشورہ واقعۂ خراسان (موجودہ مزار شریف افغانستان جہاں حضرت علی کا روضہ ہے۔ فوق) سے کشمیر آیا۔ اصل نام عشاوری تھا۔ عشاوری سے عشائی ہوگیا۔ جد اعلیٰ اس فرقہ کا خواجہ سنگین نماز عصر سے تا نماز عشا مسجد میں ہی رہا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا نام عشائی ہوگیا۔ فوق ایک دوسری روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ خواجہ سنگین رات کا کھانا لازمی طور پر حضرت امیر کبیر کے دسترخوان پر کھایا کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ سنگین عشا کے وقت حاضر نہ ہو سکے۔ حضرت نے پوچھا ہمارا عشائی کہاں گیا۔ ساڑھے چھ سو سال گزر جانے پر بھی عشائی کا لفظ آج تک موجود ہے۔ فوق یہ بھی لکھتے ہیں کہ کسی عشائی نے ان سے کہا تھا کہ ان کے جد خواجہ سنگین کشمیری الاصل تھے اور میر سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ صفحہ ۲۳۸ میں مزید لکھتے ہیں کہ :

''خواجہ رفیق عشائی اولاد نرینہ سے محروم تھے''۔

خواجہ اعظم دیدہ مری اور دوسرے لوگوں کے ان مبہم، غیر واضح اور متضاد بیانات سے کسی مربوط نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ ان بے سروپا اور من گھڑت افسانوں کے تراشنے سے غنی کا آشائی یا عشائی ہونا ثابت نہیں ہے۔ اس پیچیدہ عقدہ کو خود ان کے شعر نے صدیوں کے بعد حل کر دیا ہے کہ خاندانی مسلک بوترابی تھا۔ یعنی انہیں آل محمدؐ سے والہانہ محبت وعقیدت تھی۔ نیز یہ شعر اسلامی کردار اور اُسوۂ محمدی کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

زیباست خوئے آتشی اولاد بولہب را
تو ابن بوترابی باید کہ خاک باشد

غنی کے شعر کا مفہوم میر انیس کے اس شعر میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہے نہ کوئی غلام ابوتراب نہیں

ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی نے نہ معلوم کس بنیاد پر غنی کے اس بلند پایہ شعر کو اپنی کتاب ''غنی کشمیری'' صفحہ ۱۰۸ میں بے کار،

بے معنی اور تک بندی سے تعبیر کیا ہے۔ شاید شیروانی صاحب کی نظر سے اقبال کا یہ شعر نہیں گزرا ہے۔

پوچھتے کیا ہو مذہب اقبال

یہ گنہگار بوترابی ہے

یہ بات قابل غور ہے کہ فوق نے بھی غنی کا یہ پسندیدہ شعر "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم صفحہ ۱۹۵ میں "مولانا غنی اشائی کاشمیری" کے نام سے درج کیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے عشائی کے بدلے "اشائی" ہی لکھا ہے۔

غنی کے سوانح نگاروں نے کبھی یہ لکھنے کی زحمت نہیں کی کہ ملا غنی کی جائے ولادت، ان کا مکان اور مقبرہ کہاں ہے۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ بے بنیاد اور گمراہ کن ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ غنی خواجہ رفیق عشائی کے خاندان سے وابستہ تھے اس لئے وہ خاندانی قبرستان محلہ فتحکدل میں دفن ہیں۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنا ڈی-لٹ کا مقالہ بعنوان کشیر (KASHIR) لکھا جس کو پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۴۹ء میں دو جلدوں میں شائع کیا۔ صوفی صاحب نے غنی کا تذکرہ جلد دوم میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غنی قطب الدین پورہ (گرگاڑی محلہ زینہ کدل) میں رہتے تھے اور وہیں دفن ہیں۔ کشیر کے پہلے ایڈیشن میں غنی کے مکان یا ان کی قبر کی کوئی تصویر نہیں چھپی تھی۔ مسٹر جی-ایل تکو اپنی کتاب "پارسی سرایان کشمیر" (صفحہ ۳۶) میں لکھتے ہیں کہ غنی سری نگر میں پیدا ہوئے۔ اس پر شیروانی صاحب نے یہ اضافہ کیا کہ غنی کے مکان کی نشاندہی ڈائرکٹر آف لائبریریز کے ایک خط نمبر 2534/PR مورخہ ۲۵/نومبر ۱۹۶۴ء سے ہوتی ہے جو ڈائرکٹر صاحب نے درج ذیل الفاظ میں مسٹر تکو کو لکھا تھا:

"The photo of Mulla Ghani Kashmiri's house where he was born and lived for some times is published by G.M.D. Sufi in his book Kashir Vol. 11 P.364. Govtt. has preserved this as a protected monument "Ghanis' house".

یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ صوفی کی کشیر کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا اور ڈائرکٹر صاحب موصوف کی ترغیب پر غنی کے مکان اور قبر کی تصویریں محض اپنے دفتر کی شہرت کے لئے دوسری جلد میں شائع کرادیں۔

دراصل غنی کے مقبرے کا مسئلہ بھی ان کے مکان کی طرح معمہ بن گیا ہے۔ غنی کے تذکرہ نگاروں کے جتنے منھ اتنی ہی باتیں بھی ہیں، اور باتیں بھی ایسی جو محض غلط ہیں۔ شیروانی صاحب (غنی کشمیری صفحہ ۱۵۴) لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صوفی نے غنی کی قبر کا جو فوٹو اپنی کتاب میں شائع کیا ہے اس پر لکھا ہے کہ یہ قبر زینہ کدل سری نگر میں واقع ہے۔ لیکن جو تصویر تکو نے اپنی کتاب "پارسی سرایان کشمیر" (صفحہ ۴۰) میں چھاپی ہے اس سے ڈاکٹر صوفی کی تکذیب ہوتی ہے کہ غنی کی قبر زینہ کدل میں ہے۔ ڈائرکٹر لائبریریز اینڈ ریسرچ حکومت جموں و کشمیر نے ڈاکٹر تکو کو مطلع کیا تھا کہ غنی کی قبر اشائی خاندان کے مقبرے راجوری کدل میں موجود ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کے خط کے الفاظ جو شیروانی نے صفحہ ۱۵۴ میں

درج کئے ہیں، یہ ہیں :

"The photo of the grave of Ghani published by Sufi in KASHIR is doubtful, but according to the local tradition there is a grave in Ashai graveyard situated as mohalla Syed Sahib Rajware Kadal, Srinagar, just a few Chains from Ghani's house which is called Ghani's grave, but there is no inscription on the grave stone. Dr. G.L. Tikku has published the photo of that grave in his book".

غنی کے مکان اور آخری خواب گاہ کی تصویریں بھی ڈاکٹر شیروانی نے جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کے تعاون سے ''غنی کشمیری'' مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء کی ابتدا میں شائع کی ہیں۔ پہلی تصویر میں غنی کا بہت بڑا سہ منزلہ مکان ہے۔ اس کے نیچے درج ذیل عبارت ہے :

''رہائش گاہِ غنی (محلہ سید بلادوری) سری نگر''۔

مکان کی پشت پر قبرِ غنی کے نیچے یہ الفاظ مرقوم ہیں :

''مزارے نزدِ منزلِ غنی۔ محققین دعویٰ دارند کہ غنی درین مدفون ہست''۔

یعنی غنی کا مقبرہ غنی کے مکان کے متصل واقع ہے۔ محققین کا دعویٰ ہے کہ غنی یہاں دفن ہیں۔

ڈاکٹر صوفی، ڈاکٹر ٹکو، ڈاکٹر شیروانی اور دوسرے لوگوں کا یہ کہنا لغو اور نقش بر آب ہے کہ غنی راجوری کدل میں اتنے بلند و بالا مکان میں آج سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے رہائش پذیر تھے۔ ان نام نہاد محققین کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ غنی کا مقبرہ ان کے مکان کے چند قدم پر ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خود غنی کے کلام سے ثابت ہے کہ وہ ایسے مفلس اور قانع تھے کہ ٹوٹے پھوٹے حجرے میں رہتے تھے۔ ان کے پاس سوائے کاغذ اور قلمدان کے اور کوئی مال واسباب نہیں تھا۔ خود غنی کا شاگرد دیباچۂ غنی میں لکھتا ہے :

''واز اسباب ایں جہانش کاغذے وقلمدانے از عزلت وانزوائی ذاتی بغیر از غزالانِ وحشی رام نمی شد''۔

غنی نے اپنے چھوٹے سے مکان کی شکستگی اور تنگی وتاریکی کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

(۱) دیوار و در خانۂ ما گرچہ زہم ریخت — صد شکر کہ در خانۂ ما نیست غبارے

یعنی ہمارے گھر کے در و دیوار بھی گر گئے ہیں۔ شکر ہے کہ اب جھاڑو دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

(۲) تنگ وتاریک است ہمچو لغمہ نے خانہ ام — رخنۂ دیوار، باشد روزنِ کاشانہ ام

اس شعر میں غنی نے اپنے حجرے کو بانسری کے کھوکھلا پن اور اس کی تنگی و تاریکی سے تشبیہ دی ہے۔ بانسری میں جو چھوٹے چھید ہوتے ہیں ان کو روشندانوں سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) خانہ ام راعاقبت گردید بام و در یکے بسکہ ہمچو مور گشتم پائمالِ روزگار

آخر کار میرا حجرہ شکستگی کی وجہ سے زمین بوس ہو گیا اور میں چیونٹی کی طرح زمانہ کے ہاتھوں روندا گیا۔

فوق نے اپنی کتاب ''مشاہیرِ کشمیر'' میں ایک روایت بیان کی ہے کہ غنی ایک حجرے میں رہتے تھے۔ جب کمرے میں ہوتے تھے تو اندر سے دروازہ بند کرتے تھے اور جب باہر نکلتے تھے تو دروازہ کھلا رکھتے تھے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا کہ ''دکان کا اصلی مال تو میں ہوں، جب میں ہی نہیں ہوں تو دروازہ بند چہ معنی دارد''۔ علامہ اقبال کو فوق کی یہ روایت پسند آئی اور انہوں نے اسے پیامِ مشرق میں یوں نظم فرمایا۔

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر نوا سنجِ کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت چو رفت از سرا، تختہ را وا گذاشت
یکے گفتش اے شاعرے دل رسے عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر فقیر و بہ اقلیمِ معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش متاعِ گراں است در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

نیا انکشاف :- کتب تواریخ میں مرقوم ہے کہ میر محمد ہمدانی (فرزند میر سید علی ہمدانی) جب وارد کشمیر ہوئے تو اور لوگوں کے علاوہ ملا سعید الدین بھی ان کے ہمرکاب تھے اور یہی ملا محمد طاہر غنی کے جدِ اعلیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔ میر محمد ہمدانی نے اپنے والد بزرگوار کی ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی جو خانقاہِ معلّٰی کے نام سے آج تک مرجع خلائق ہے۔ اس زمانے میں خانقاہ کی اراضی کوسوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ملا سعید ہمدانی بھی خانقاہ کے متصل ہی قیام پذیر تھے۔ اور ان کی قبر آج سے ستر اسّی سال قبل احاطۂ خانقاہ میں موجود تھی۔ جب میر شمس الدین عراقی (متوفی ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء) خانقاہ معلّٰی کے مختار کل اور متولی مقرر کیئے گئے تو انہوں نے زائرین کے لئے اقامت گاہ اور لنگر خانہ بنوایا جو آج تک محلہ شمس واری کے نام سے موجود ہے۔ ملا سعید کی اولادیں یہیں رہتی تھیں۔

کشمیری امرا کے تعاون سے بابر کے خالہ زاد بھائی مرزا حیدر کاشغری نے ۹۴۷ ہجری (۱۵۴۰ء) میں کشمیر کو فتح کیا۔ اُس نے اپنے حواریوں کی مدد سے شیعوں، ہمدانیوں، نوربخشیوں اور شافعیوں کا قتل عام کر کے ان کو

صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ بڑے بڑے علمائے دین مثل میر سید دانیال (فرزند میر شمس الدین عراقی) باباعلی درویش مرید بابا اسماعیل شیخ الاسلام وغیرہ کو جھوٹے مقدموں میں ملوث کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ انسانیت اتنی گر چکی تھی اور انسان اس قدر درندہ ہوگیا تھا کہ میر شمس الدین کے عقیدت مندوں کا صفایا کر کے ان کی میت کے ساتھ انتہائی بے ادبی کی اور حکم دیا تھا کہ ان کی قبر میں روزانہ ایک ہزار حطب نذر آتش کی جائے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ اور کتب تواریخ میں ان سانحات کی تاریخ ''دشتِ کربلا'' یعنی ۹۵۷ھ مطابق ۱۵۵۰ء لکھی گئی ہے۔ جو بچے کھچے لوگ رہ گئے وہ اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔ ایک شجرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دار و گیر اور رست خیز کے عالم میں ملاّ سعید کی اولادیں نقل مکانی کر کے محلہ باباپورہ متصل باباڈیم ہجرت کر گئیں۔ ایک مرتبہ ملاّ محمد طاہر غنی کشمیری کے زمانے میں باباڈیم میں ایسا سیلاب رونما ہوا کہ پانی سر سے گزرنے لگا۔ اس موقعہ پر غنی کا حجرہ بھی زیرِ آب آگیا۔ وہ نہایت خوفزدہ اور پریشان ہو گئے کہ کشتی میں پناہ لے لی۔ اور بے ساختہ یہ رباعی منہ سے نکلی ؎

سیل است زشوقِ کلبۂ ام گرم شتاب　　آرام بباد دادہ ایں خانہ خراب
تا بر لب کشتیم زند بوسہ ہنوز　　می گردد آب در دہانِ گرداب

مقبرۂ غنی واقع حسن آباد کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مرزا حیدر (متوفی ۹۵۷ھ) کے انتقال کے بعد جب دولت خان چک نے کشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے اُن تمام فرقوں کو پھر سے بسایا جو مرزا حیدر کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے تھے۔ موصوف نے میر دانیال کے اجزائے میت سمیٹ کر اپنے والد بزرگوار میر شمس الدین کے پہلو میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ عالم دین اور بزرگ ترین درویش باباعلی کی لاش کو حسن آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔ دولت چک نے ہی باباعلی کے صاحبزادے بابا حسن کے نام محلہ حسن آباد کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہاں ایک بڑی خانقاہ اور باغات تعمیر کئے گئے تھے۔ مقبرے میں بڑے بڑے بلند قامت کتبے نصب کئے گئے تھے۔ جن پر آیاتِ قرآنی کے علاوہ چہاردہ معصومین کے اسمائے گرامی کندہ تھے۔ ان میں سے کچھ فسادات میں چرائے گئے اور باقی ویران پڑے ہیں وہ ورثا اور ان کی اَسلاف فراموشی پر گریہ کناں ہیں۔ خواجہ دیدہ مری کا یہ کہنا غلط ہے کہ باباپور میں باباعلی کی اولادیں آباد ہیں۔

یہ کہنا مناسب ہے کہ غنی گوناگوں بیماریوں کی وجہ سے آخرِ عمر میں ضعیف اور لاغر ہو گئے تھے۔ تذکرۂ نصر آبادی میں لکھا ہے کہ بادشاہ اورنگ زیب نے سیف خان (متوفی ۱۰۹۵ھ مطابق ۱۶۸۴ء) حاکم کشمیر کو لکھا تھا کہ غنی کو دارالخلافہ میں حاضر ہونے کے لئے کہا جائے۔ سیف خان نے غنی کو بلایا اور ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ غنی نے انکار کیا اور کہا کہ بادشاہ سے کہا جائے کہ وہ دیوانہ ہے۔ خان نے کہا کہ ایک فرزانہ کو میں دیوانہ کیسے کہوں۔ غنی نے فوراً اپنا گریبان چاک کیا اور دیوانوں کی طرح اپنے گھر کو چلے گئے۔ اس کے تین دن کے بعد انتقال کر گئے۔ خاندانی روایت کے مطابق وہ اپنے بھائیوں کے پہلو میں دفن ہیں۔

ایران کے ایک عالمِ جید، فاضل یکتا اور بے مثال محقق و دانشور آقائی بزرگ الطہرانی نے ایک کتاب بنام: '' الذریة الیٰ تصانیف الشیعة '' کئی جلدوں میں تالیف کی۔ ہندوستان وغیرہ میں یہ تمام جلدیں نہایت کم یاب اور کشمیر میں عنقا ہیں۔ الذریعہ میں شیعہ عالم دین، اہل قلم اور شعرا وغیرہ کے تذکرے ہیں۔ الذریعہ مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ تمام جلدیں عربی میں ہیں۔ جلد نہم حصہ سوم، مطبوعہ تہران صفحہ ۷۹۳ میں ملا محمد طاہر غنی کشمیری کو شیعہ قرار دیا گیا ہے۔ غنی کے آخر میں مسلم کی وہ رباعی بھی درج ہے جو غنی کی وفات پر کہی گئی تھی اور یہ ہے۔

از فوتِ غنی گشت یکہ ومہ غمگین　　　　ہر کس شدہ در ماتم او خانہ نشین

تاریخ وفاتش ار پرسند بگو　　　　''پنہاں شد گنج ہنرے زیر زمین'' ۱۰۷۹ھ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ غنی کشمیری کا آخری زمانہ کشمیر میں انتہائی پُر آشوب اور پریشان کن تھا۔ سیف خان رسوائی زمانہ ظالم اور جابر حکمران تھا۔ لوگوں کو جھوٹے مقدموں میں پابند سلاسل کر کے تہِ تیغ کرتا تھا۔ جو بھی اس کے حکم کی نافرمانی یا تاخیر کرتا تھا اُسے موت کے گھاٹ اُتارتا تھا۔ مشہور مورخ کشمیر ملک حیدر چاڈورہ کے بیٹے ملک حسین کو محض تعصب کی بنا پر قتل کیا۔ تاریخ میں اس قتل کا ذکر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

شد از ظلم و بیداد قوم یزید

حسین ابن حیدر دوبارہ شہید

ہوسکتا ہے کہ غنی نے اسی لئے دہلی جانے سے انکار کیا ہوگا۔

مشہور مورخ کشمیر مولوی محمد الدین فوق (م - ۱۹۵۴ء) اپنی نادر و نایاب کتاب '' تاریخ اقوام کشمیر'' جلد دوم صفحہ ۲۹، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء میں '' رسالۂ خانقاہ معلیٰ صفحہ ۲۰، مرتبہ سعد الدین تارہ بلی مطبوعہ بروکا پریس سری نگر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

مولانا سعید الدین حضرت شاہ ہمدان کے ساتھ ہی کشمیر آئے تھے اور یہیں اقامت گزین ہوگئے تھے۔ ان کا مقبرہ اب تک زیارت شاہ ہمدانی کے متصل موجود ہے۔ مولانا محمد سعید الدین حضرت شاہ ہمدان کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ میر سعید ہمدانی نے جو وقف نامہ زیارت شاہ ہمدان کی آمدنی کے اخراجات کے متعلق لکھا ہے اس میں بھی محمد سعید کا نام آتا ہے۔ چنانچہ یہ الفاظ وہاں درج ہیں۔

'' برادر امجد مولانا محمد سعید طال اللہ عمرہ۔ تادراں بقعہ متصرف باشد و بر احوال اعمال سکنان و مسافران باخبر باشد۔ بزرگان را خادم، کہتران را برادر و یتیماں را پدر باشد''۔

ترجمہ:- بزرگ ترین اور ہدایت یافتہ بھائی۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ جب تک یہ خانقاہ آپ کے تصرف میں رہے گی لوگوں کی اور زائرین کی دیکھ بھال کرنا۔ اپنے کو بزرگوں کا خادم، چھوٹوں کا بھائی اور یتیموں کا باپ سمجھنا۔

مولانا محمد سعید الدین کی ذریات چونکہ نقل سکونت کر کے سری نگر کے اور مقامات پر بھی رہی ہے، اس لئے اس کی بزرگی وعظمت کی وجہ سے جہاں جہاں اس نے قیام کیا وہ اسی جگہ اسی خاندان کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ جیسے بابا ڈیم اور بابا پورہ۔ بابا عزت واحترام کا لفظ ہے جو ہر بزرگ کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اب یہ خاندان بابا پورہ میں ہی رہتا ہے۔

میرے سامنے آقائے سید علی موسوی مرحوم کے ایک انتہائی نادرالوجود رسالے کا عکس ہے جو میری رائے میں غالباً واحد نسخہ ہے اور جسے میری نظر میں ایک بیش بہا غیر مطبوعہ مخطوطے کی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا نام ''کحل الجواہر'' ہے جو قم (ایران) میں آج سے تقریباً ایک سو نوے (۱۹۰) سال قبل مرتب کیا گیا تھا۔ اس کے مستند اور معتبر ہونے کے بارے میں مصنف لکھتا ہے :

''آنچہ مرا ابہم شداز مشجرات وکتب وتواریخ وذرائع موثقۂ معتبرہ خاصۂ وقت تحصیل در معصومۂ قم وبلاد مقدسہ بعد جمع آوری دریں وجیزہ نامیدم اور الکحل الجواہر''۔

کتاب کے آخر میں کئی علمائے عالم کے تبصرے، مہریں اور دستخط ثبت ہیں۔ پہلا تبصرہ مجتہد اعظم آقا محمد شریف مازندرانی حائری طاب ثراہ نے ۷/شوال ۱۲۳۸ ہجری (جون ۱۸۲۳ء) کو لکھا ہے۔ رسالہ کی کتابت محمد صادق انصاری نے ۱۵/ جمادی الآخر ۱۲۶۴ھ (مئی ۱۸۴۸ء) کو ختم کی۔ بعد میں رسالہ سید رسول رضوی کشمیری کے اہتمام سے شعبان المعظم ۱۲۶۴ھ (مئی ۱۸۴۸ء) میں مطبع اسلامی لاہور میں شائع ہوا۔ صفحہ ۵ میں مولانا ملا محمد طاہر غنی کشمیری کو ملا محمد سعید ہمدانی کے اخلاف میں اثناعشریہ قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں پہلے مصنف کتاب کا اردو خلاصہ پھر اصل الفاظ فارسی درج کئے جاتے ہیں :

میرے یعنی صاحب کتاب میر سید علی موسوی کے جد بزرگوار میر سید سلطان حیدر موسوی اردبیلی کبروی حضرت امام موسیٰ کاظم باب الحوائج علیہ السلام کی بائیسویں پشت سے تھے۔ وہ سید شرف الدین بلبل شاہ ابن سید امین الدین جبرئیل کے ورود کشمیر کے بعد اپنے ماموں میر سید علی ہمدانی کے حکم سے اسلام کی نشر واشاعت کے لئے کشمیر آئے اور یہاں حیدر پورہ میں اسی مقام پر سکونت پذیر ہوئے جہاں سید علی ہمدانی کی صاحبزادی بی بی بارعہ دفن ہیں۔ حیدر پورہ میر سلطان حیدر موسوی اردبیلی کے نام سے منسوب ہے۔

ملا محمد سعید ہمدانی ۷۹۶ھ (مطابق ۱۳۹۳ء - ۱۳۹۴ء) میں میر محمد ہمدانی اور میر محمد مدنی کے ساتھ کشمیر آئے۔ ان کے علاوہ سید باقر مؤلف کتاب ''نور'' سید محمد اردبیلی (برادر میر سلطان حیدر اردبیلی) بھی تشریف لائے۔

ان کا مقبرہ مولہ شلہ ہیک (ٹینگن) میں ہے۔ میر سید حسین قمی سلطان سکندر بت شکن کے عہد سلطنت (۷۹۶-۸۲۰ھ/ ۱۳۹۴-۱۴۱۷ء) میں واردِ کشمیر ہوئے۔ اور یہاں سیدہ پورہ (زینہ گیر) میں سکونت اختیار کی۔ بڈشاہ زین العابدین نے موصوف کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ سید قمی صاحب نے ''حقیقت اسلام'' پر ایک کتاب ''صراط'' کے نام سے تصنیف کی۔ ملاّ احمد (اولین مورخ وقائع کشمیر) نے اس کا ترجمہ کشمیری زبان میں کیا تھا۔ ایک اور عالم زمانہ ملاّ عالم انصاری جو میر حسین قمی کے رفقا میں تھے ان کو سلطان بڈشاہ نے مدرسۂ عالیہ کا ناظم مقرر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ میر سید حسین قمی کی ہدایت پر ملاّ انصاری نے امامیہ مذہب کے عقاید پر ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ ملاّ انصاری نے ملاّ محمد سعید ہمدانی فاضلِ دہر، عالمِ متبحر اور میر محمد ہمدانی کے رفیقِ کار وتقویٰ شعار کی کتاب کی شرح لکھی۔ ایسی بے مثل کتاب چشم عالم نے نہیں دیکھی ہے۔ بزرگوں سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مولانا ملاّ محمد طاہر غنی شاعر بے نظیر ملاّ سعید کی اولاد وں میں تھے۔ انہوں نے اپنے جدّ بزرگوار (ملاّ سعید ہمدانی) کی کتاب کی تفصیلی شرح بھی لکھی جو میری یعنی مصنفِ رسالہ سید علی موسوی کی نظر سے بھی گزری ہے۔

ملاّ محمد طاہر غنی کشمیری کے بارے میں سید علی موسوی کے الفاظ درج ذیل ہیں :

''می گویند کہ آں موصوف (یعنی ملا انصاری) ہم رسالہ مشتمل بر عقاید ناجیۂ اثنا عشریہ بامرِ مرشدِ بزرگوار میر حسین قمی جمع آوردہ و بر کتابِ ملاّ سعید ہمدانی کہ از نوادر روزگار و افاضل اقطار و رفقائے میر ہمدانی تقویٰ شعار بود۔ شرحے بکمالِ ایضاح نوشتہ کہ چشمِ عالم مثلِ آں ندیدہ۔ چنانچہ اَلسنۂ بزرگاں چنیں شنیدہ کہ مولانا ملاّ محمد طاہر غنی شاعر بے مثل کہ از احفادِ آں ذاتِ والا صفات است۔ توضیح آں شرح فرمودہ کہ بہ نظر قاصر ہم رسیدہ کہ در مسلکِ اثنا عشری کتابے است دلپذیر......''۔

غنی کا کیا مسلک تھا اس بارے اور پر معتبر شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اثنا عشریہ عقائد رکھتے تھے۔ اس کی مزید تائید ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ وہ آلِ محمد کی معرفت وعقیدت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ غنی عالم تھے، فلسفی تھے، اور تاریخِ اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں آئینۂ اخلاق محمدیؐ میں علی ابن ابی طالب شرافت انسانی کا بہترین نمونہ نظر آتے ہیں۔ جتنی ذلت آمیز برائیاں یعنی اللہ کی نافرمانی کرنا، پیغمبری شریعت کو پس پشت ڈالنا، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کرنا، جہاد، شجاعت اور سخاوت سے گریز کرنا، اولادِ ابولہب کے انسان کش حربے ہیں۔ ایسے انسانوں پر قرآن نفرت کرتا ہے اور لعنت بھیجتا ہے۔ اس کی گواہی سورۂ لہب دیتا ہے۔ برعکس اس کے ابوترابی یعنی خاکساری انسانیت کی بقا کے لئے جوہرِ اخلاق کا بیش بہا نمونہ ہے۔

غنی کا یہ شعر اسوۂ محمدی کا آئینہ دار ہے اور پوری تاریخ اسلام دعوت ذوالعشیر ہ سے لے کر کربلا تک اس

میں بہترین انداز سے سموئی گئی ہے۔ اس شعر پہ نثر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

زیبا ست خوئے آتشی اولادِ بولہب را
تو ابنِ بوترابی باید کہ خاک باشی

حدیث رسول ہے: ''مَن مَاتَ وَ لَم یَعرِف اِمَامَ زَمَانِہٖ فَقَدْ مَاتَ مِیتَۃَ الْجَاھِلِیَۃِ '' (جس نے امام زمانہ کونہیں پہچانا اور مرگیا وہ جاہلیت کی موت مشرک یا منافق مرا)۔ مقصد حدیث یہ ہے کہ بلامعرفتِ امام نہ توحید درست ہے اور نہ اعتقاد نبوّت ہی۔ اسی لئے از روئے قرآن روزِ جزا ہر ایک شخص اپنے امام کے ساتھ محشور ہوگا۔ غرض کہ اللہ اور رسولؐ کے بعد اولی الامر کی اطاعت واجب ولازم ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ ''مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ الْحُسَیْنؑ مَاتَ شَھِیْدًا (جو امام کی معرفت ومحبت میں مرتا ہے وہ شہید ہوتا ہے)۔ اس حدیث کا اشارہ غنی کے اس شعر میں ملتا ہے ۔

کے بروزِ جزا سرخرو تواند شد
کہ خاکِ پائے شہیدانِ کربلا باشد

غنی کا ایک اور شعر ہے اس کا مفہوم ہے کہ مسلمان اسی وقت پیر دستگیر کے راہ یقین یعنی عقیدت مندی پر چل سکتا ہے جب اس کی تسبیح کا امام خاک کربلا سے بنا ہو۔ مقصد شعر یہ ہے کہ جب تک کہ مسلمان کے دل میں آلِ محمدؐ کی معرفت نہ ہو اس کی تمام عبادتیں بے کار ہیں۔ ذیل کا شعر بھی قابلِ غور ہے۔ ''خاکِ غم'' اور ''ایامِ ماتم'' سے ذہن انسانی واقعۂ کربلا کی طرف منتقل ہوجاتا ہے ۔

چشم تا واکردہ ام بر خاکِ غم افتادہ ام
ہمچو طفلِ اشک در ایام ماتم زادہ ام

ملا محمد طاہر غنی کے ایک بھائی ملا عبدالغنی علم وحکمت میں گوہر نایاب تھے۔ ان کے حالات کم ملتے ہیں۔ ''نجوم السما'' (صفحہ ۲۲۵) از مرزا محمد علی لکھنوی اور ماہر غالبیات مولانا سید مرتضی حسین فاضل اپنی کتاب ''مطلع انوار'' صفحہ ۳۱۵ میں لکھتے ہیں کہ مولانائے موصوف علوم دینیہ کے فاضل وعالم صاحب تصانیف تھے۔ وہ ملا محمد صالح مازندرانی (شاگرد ملا محمد تقی مجلسی اول) کے شاگرد تھے۔ ملا عبدالغنی نے علی رضا بن افراسیاب خان صوبہ دار کشمیر کی فرمائش سے شرائع الاسلام (شیعی دنیا کے معروف عالم متبحر اور مجتہد اعظم شیخ نجم الدین ابوالقاسم معروف بہ شیخ حلی متوفی ۶۷۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء کی تصنیف ہے) کا عربی سے فارسی میں شرح کے ساتھ ترجمہ کیا۔ اس کا تاریخی نام'' جامع الرضوان'' (سال تالیف ۱۱۶۱ھ) ہے۔ مطبع نولکشور لکھنو سے اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے

عربی کالجوں میں شامل نصاب ہے۔ ملا عبدالغنی کا انتقال ۱۱۶۶ھ میں ہوا۔ حسن آباد میں دفن ہیں۔

ملا ساطع - ملا غنی کشمیری کے بھتیجے تھے۔ خان آرزو مجمع النفائس میں ساطع کا نام ملا عبدالحکیم لکھتے ہیں۔ وہ فارسی کے باکمال شاعر اور نثر نگار تھے۔ ساطع نے نثر میں ''گلشن اسلام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بقول خان آرزو :

''ساطع در فن نثر خیلے قدرت داشت۔ وبسیار رنگین و پختہ می نوشت''۔

ساطع فن لغت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ''حجت ساطع'' مشہور فرہنگ ''برہان قاطع'' کا انتخاب بھی کیا ہے۔ ان کا انتقال ۱۱۴۳ھ میں ہوا۔ اعظم دیدہ مری نے تاریخ کہی: ''نور ایماں بہر قدش ساطع''۔

ساطع اپنے آبائی مقبرہ حسن آباد سری نگر میں دفن ہیں۔

کتابیات

مقالہ کی تیاری کے لئے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ جاوید نامہ۔ از ڈاکٹر اقبال۔ مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور۔

۲۔ تذکرہ نصر آبادی۔ ٹیگور لائبریری، لکھنو یونیورسٹی۔

۳۔ تذکرہ کلمات الشعرا۔ محمد افضل سرخوش۔ ٹیگور لائبریری لکھنو یونیورسٹی۔

۴۔ دیوان غنی مطبوعہ مطبع مصطفائی۔ لکھنو، کتب خانہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنو۔

۵۔ واقعات کشمیر۔ اعظم دیدہ مری قلمی محکمہ آرکایوز، دہلی۔

۶۔ واقعات کشمیر۔ مترجم اقبال اکادمی لاہور 1995ء۔

۷۔ دیوان غنی (قلمی)۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ قیصر باغ لکھنو۔

۸۔ اودھ کیٹلاگ (شاہان اودھ لکھنو)۔ مطبوعہ ۱۸۵۴ء، کلکتہ۔

۹۔ غنی کشمیری (فارسی)۔ ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی، سری نگر ۱۹۷۲ء۔

۱۰۔ تاریخ حسن حصہ اول و دوم۔ مطبوعہ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ، سری نگر۔

۱۱۔ بہارستان شاہی۔ مرتبہ اکبر حیدری کشمیری، مطبوعہ انجمن شرعی شیعان کشمیر 1981ء۔

۱۲۔ رسالہ (قلمی)۔ متعلقہ بہ خاندان عشائی۔ محکمہ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ، سری نگر۔

۱۳۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد اول (۱۹۳۴ء) و جلد دوم (۱۹۴۳ء)۔ محمد الدین فوق، مطبوعہ لاہور۔

۱۴۔ تحفۃ الاحباب (قلمی)۔ سال تصنیف ۹۵۹ ہجری۔ مصنف نامعلوم۔

۱۵۔ کشیر، جلداول و دوم۔ غلام محی الدین صوفی، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۴۹ء۔
۱۶۔ تاریخ شیعان کشمیر۔ حکیم غلام صفدر، مطبوعہ ۱۹۷۰ء۔
۱۷۔ مشاہیر کشمیر۔ از محمد الدین فوق ۱۹۳۰ء۔
۱۸۔ پیام مشرق۔ از علامہ اقبال۔
۱۹۔ الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ۔ آقا بزرگ طہرانی۔ جلد نہم، حصہ سوم۔ تنظیم المکاتب لکھنو۔
۲۰۔ تکمل الجواہر۔ از سید علی موسوی، مطبع اسلامی لاہور ۱۲۶۴ھ۔
۲۱۔ نجوم السما (تذکرہ علمائے شیعان)۔ از مرزا محمد علی لکھنوی۔
۲۲۔ مطلع انوار (تذکرہ علمائے شیعان)۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔
۲۳۔ جامع الرضوان۔ از ملا عبدالغنی، مطبوعہ نولکشور لکھنو، طبع پنجم، ۱۹۱۵ء۔
۲۴۔ خدابخش جرنل، پٹنہ۔ شمارہ ۲،۳۔ بابت ۱۹۷۷ء
۲۵۔ فرہنگ ادبیات فارسی دری۔ مولفہ دکتر زہرائی خانلری کیا۔

Hamadania Colony, Bimna
Srinagar, Kashmir

ڈاکٹر قمر رئیس

ڈاکٹر عبدالکلام

(صدر جمہوریۂ ہند) بہ حیثیت شاعر

حال ہی میں ڈاکٹر اے-پی-جے-عبدالکلام کو صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز ہوئے ایک سال کی مدت پوری ہوئی۔ اس موقع پر قومی میڈیا نے ان کو پہلے عوامی صدر (Peoples President) کے خطاب سے نوازا اور واضح طور پر لکھا کہ سابقہ روایات سے گریز کر کے ڈاکٹر عبدالکلام نے ملک کے عوام سے گہرے اور آزادانہ رشتے قائم کئے۔ لاکھوں بچوں سے ایسے شوق اور شفقت سے گھلے ملے جیسے ان کے اپنے کنبے یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ملک کے جن علاقوں میں عام لوگوں کو کسی بحران یا پریشانیوں کا سامنا رہا وہاں کے دورے کئے۔ نوجوان پیڑھی کو قومی آدرش یاد دلائے اور دیار وطن کو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بہ دوش کھڑا کرنے کے لئے ان کی ذمہ داریوں اور عزم و یقین کو مستحکم بنایا۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی شخصیت کی بے مثل سادگی، خلوص، علم دوستی اور وطن پرستانہ جذبات نے بلاشبہ ملک کے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا۔ اس طرح عوام و خواص میں ان کی مقبولیت کے نئے باب کھلے۔

ڈاکٹر عبدالکلام ہندستان کے ایسے سائنس داں ہیں جو عہد حاضر میں دنیا کے دفاعی سائنس دانوں اور ایجادکاروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ سائنسی تحقیق کے دشوار اور پیچیدہ کاموں میں گزرا لیکن ان کی دلچسپیاں صرف سائنس کے دائرہ تک محدود نہیں رہیں۔ وہ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور شاعری سے عملی طور پر جڑے رہے۔ نہ صرف یہ کہ اعلا شاعری کا مطالعہ کر کے انھوں نے اپنے شعری ذوق کو زندہ رکھا بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر شعر گوئی کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ وہ گاہے گاہے اپنی مادری زبان تامل میں نظمیں لکھتے رہے۔ ان کی منتخب نظموں کا ترجمہ انگریزی زبان میں MY JOURNEY کے نام سے شائع ہوا۔

نظموں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ان میں ان کی داخلی اور جذباتی زندگی کے منظر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ تخلیقات ہیں جہاں اُن کے بچپن کی سُہانی یادیں پختہ عمر کی سنجیدگی کو دکھاتی ہیں۔ جہاں نت نئی مسرتیں اور وجد آفریں کامیابیاں، نامرادیوں اور محرومیوں سے گلے ملتی ہیں۔ تہذیبی ورثہ میں ملے روحانی کرشمے جہاں ان کی روح کو رفعت اور بالیدگی عطا کرتے ہیں۔ گرد و پیش پھیلے فطرت کے لازوال منظر آسودگی بخشتے ہیں اور جہاں بنی نوع انسان کے تئیں

ان کی تشویش اور دردمندی اور علم و دانش کے تئیں ان کی کامل سپردگی انھیں اندر ہی اندر انسانی مقدر سے پوری طرح جوڑے رکھتی ہے۔ الغرض ان کی شعری تخلیقات ایک سائنس داں سے زیادہ فطرت اور عام انسانوں سے والہانہ محبت کرنے والے ایک حساس انسان کی زندگی کے نازک تجربات کی روداد ہے۔

ڈاکٹر عبد الکلام نے اپنی خودنوشت (WINGS OF FIRE) میں اپنے آبائی وطن رامیشورم کا ذکر والہانہ عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ یہ چھوٹا سا تاریخی شہر جنوب کے ایک شاداب جزیرے پر آباد ہے۔ ان کے والد زین العابدین متوسط طبقہ کے ایک کاروباری اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی سادگی، نیکی اور ایمان داری کے علاوہ اپنی پرہیزگاری کے لئے بھی علاقے میں مشہور تھے۔ جب وہ اپنی گلی کی مسجد سے نماز پڑھ کر نکلتے تو مسجد کے باہر ہر فرقہ کے لوگ ان کے انتظار میں بیٹھے ہوتے۔ ان کے ہاتھوں میں پانی سے بھرے برتن ہوتے۔ زین العابدین کوئی آیت پڑھ کر پانی میں اپنی انگلیاں ڈبو دیتے۔ یہ پانی شفا کے لئے مریضوں اور اپاہج لوگوں کو پلایا جاتا۔

ان کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر شیو کا قدیم مندر ہے جس کی زیارت کے لئے دور دور سے ہزاروں عقیدت مند آتے۔ ڈاکٹر عبد الکلام لکھتے ہیں کہ مندر کا پجاری پاکشی لکشمن ان کے والد کے خاص دوستوں میں تھا۔ دونوں بیٹھ کر پہروں گفتگو کرتے۔ عبد الکلام بھی اکثر اپنے دوست جمال الدین کے ساتھ شیو مندر کی رونق دیکھنے جاتے۔ کبھی کبھی والد مغرب کی نماز کے لئے اُن کو مسجد بھی لے جاتے۔

بچپن کی یادوں میں ڈاکٹر عبد الکلام اسکول کے ساتھیوں، استادوں اور اُن عزیزوں کا ذکر بھی بڑی عقیدت سے کرتے ہیں جن کا ان کی تربیت میں گہرا حصہ رہا ہے۔ مثلاً سوا سبرامنیا آئر جیسے نیک، فراخ دل اور مثالی استاد جو عبد الکلام کو ہمیشہ مثبت انداز سے سوچنے (Positive Thinking) کی تلقین کرتے۔ اپنی تعلیمی زندگی کے ایک واقعہ کو وہ خصوصیت سے یاد کرتے ہیں۔ جب مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی جیسے اعلا تعلیمی ادارہ میں داخلہ کے لئے ان کا انتخاب ہو گیا تو داخلہ کی فیس ادا کرنے کے لئے ان کے والد کے پاس ایک ہزار روپے کی رقم نہیں تھی۔ تب ان کی بہن زہرہ نے اپنی طلائی چوڑیاں اور ہار گرو رکھ کر یہ رقم عبد الکلام کو دی۔ بعد میں زیور چھڑا کر انھوں نے یہ رقم واپس کی۔

بچپن میں عبد الکلام کو جو ماحول میسر آیا اس نے ایک طرف انھیں ایسی با مقصد اور بامعنی لیکن سادہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا جو ہر طرح کی نمائش، خود پرستی، خود بینی اور حرص و ہوس سے پاک ہو۔ دوسری جانب اس عہد کے روحانی ماحول نے، جیسا کہ ڈاکٹر عبد الکلام نے لکھا ہے ایک ایسی ربانی قوت پر ان کے عقیدہ کو مستحکم کیا جو زندگی کی الجھنوں، اداسیوں اور ناکامیوں کے کرب سے نکال کر ایک ارفع سطح تک پہنچنے میں رہنمائی کر سکے۔

ڈاکٹر عبدالکلام کی شاعری میں بھی اسی کتاب زندگی کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اپنی کئی نظموں میں وہ اپنے بچپن کی سہانی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ جب ان کا دل محبت، دوستی اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے معمور تھا۔ ایسی ہی ایک نظم ہے ''اخوت''۔ مکتب کے ایک ہم جماعت راما سوامی سے ان کی دوستی یک جان و دو قالب جیسی تھی۔ دونوں جماعت میں ہمیشہ پاس پاس بیٹھتے تھے۔ لیکن ایک تنگ نظر استاد نے راما سوامی کو کلاس میں ایک مسلمان لڑکے سے دور بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ کی اذیت سے عبدالکلام ہمیشہ تڑپتے رہے۔ یہ بند دیکھیے ؎

یہ بحری بگلے، یہ سارس، یہ جھومتے بادل
یہ ہنستی کھیلتی باہم سمندری موجیں
پچاس سال پرانا جھروکہ یادوں کا
کھلا تو، مجھ کو دکھائی دیا ہے رامیشورم
اور اُس کا چھوٹا سا مکتب
ہوں محوِ گفتگو میں اپنے راما سوامی سے
مرے رفیق، مرے ہم نشین و حامی سے

ہمارے درمیاں تھا اتحاد اس درجہ
کہ جیسے جسم کا ہوتا ہے روح سے رشتہ
ہماری بھولی سی پاکیزہ اس محبت سے
خدا کی ذات بھی لیتی تھی سانس راحت سے

پھر ایک روز
اچانک بغیر سان و گماں
گُرو کی شکل میں نازل ہوا تھا
اک طوفاں
نہ جانے اُس کا وہ جاہ و جلال تھا کہ غرور
نہ جانے اپنی روایات سے تھا وہ مجبور
اُسے پسند نہ آیا کہ مجھ مسلماں کی

نشست ایک برہمن کے آس پاس جو تھی

لہذا اُس نے ہمیں

دور دور بٹھلا کر

سکون پالیا شاید یہ ڈھونگ دکھلا کر

مگر

ہمارا کوئی حالِ زار کیا جانے

گلوں کا درد بھلا ایک خار کیا جانے

ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان 'خدا' ہے شاعر اپنے اس باطنی کرب کا اظہار کرتا ہے جو رام اور رحیم کے نام پر دونوں فرقوں میں ہونے والے خونی فساد کے نتیجہ میں وہ محسوس کرتا ہے۔ اس نظم کا فنی نشو ونما بھی بعض دوسری نظموں کی طرح ڈرامائی اور موثر پیکروں کی شکل میں ہوتا ہے۔ نظم اپنے عروج کی طرف اس وقت بڑھتی ہے جب خدا غیظ میں آکر اپنے بندوں سے مخاطب ہوتا ہے۔

نہیں، کسی کا نہیں میں، کہ تم درندے ہو

مجھے ہی رام، رحیم اور خدا میں بانٹ دیا

مرا سکون مرا چین تم نے چھین لیا

کیا ہے قید مجھے دھرم کے شکنجے میں

تو پھر رہو یوں ہی بربادیوں کے پنجے میں

کہا تھا میں نے کہ خیمے لگاؤ اُلفت کے

پڑاؤ ڈال دیئے تم نے جا کے نفرت کے

بنایا میں نے ہے اور آج کہہ رہے ہو تم

کہ وہ رحیم کے ہیں

ہم ہیں رام کے بندے

مرے بنائے ہوئے بھی نہیں رہے میرے

ایک دوسری نظم 'بادل' میں بھی شاعر کائنات اور انسان کی تخلیق کے حوالے سے سوالوں کے گرداب میں

ڈوبتا اُبھرتا نظر آتا ہے۔ وہ انسانوں کی غیر فطری تقسیم سے پیدا ہونے والی نفرت اور فتنہ وفساد کے مظاہر دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ بادل کی طرح اس زمین سے فضا کی بلندیوں کے اُس پار اُڑنے اور یہ دعا مانگنے کی آرزو کرتا ہے کہ یہ زمین ہوسِ اقتدار کے فتنہ وفساد سے پاک ہو۔ عصر حاضر میں انسان کی خود پرستی اور ہوسِ مال وزر کے خلاف شاعر کے احتجاج کی آواز بھی اس نظم میں سنائی دیتی ہے۔

بادلوں سی آزادی
کاش مجھ کو مل جائے
اور میں پہنچ جاؤں
لاحدود اُفق کے پار
اور پھر دعا مانگوں
بے نیاز ہستی سے
'ختم کر تماشا' یہ
اقتدار و دولت کی
چھین لے ہوس، ہم سے
امن و آشتی دے دے
بخش نوعِ انساں کو
پیار نوعِ انساں کا

ایک دلکش تمثیلی نظم 'تلاش مسرت' میں شاعر فطرت سے انسان کے پُر اسرار رشتوں کا انکشاف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ فطرت کے حسن کی نرمی اور معصومیت انسان کو انسان بننے میں کیونکر مدد کرتی ہے۔ انسانی وجود میں لطیف اور نازک احساس کو بیدار کرنے میں فطرت کیا رول ادا کرتی ہے اور اس کے لیے وہ خود کتنا ایثار کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی ان نظموں میں ڈرامائی تدبیر کاری نمایاں نظر آتی ہے۔ یہاں دل کے تاروں کو چھونے والے ایسے واقعات ہیں جن میں نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ فطری ماحول سے اخذ کیے ہوئے کردار ہیں۔ ان کی باہمی تکرار ایک دلچسپ ڈسکورس کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو معنی خیز مکالموں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ بزرگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے کنبے میں ان کے وارث پیدا ہوں تاکہ وہ کنبے کا نام روشن کریں اور آگے بڑھائیں۔ اس خواہش کے پیچھے قبائلی اور جاگیرداری عہد کی قدریں کارفرما رہی ہیں۔ حقیقت میں کنبہ کا نام اولاد سے نہیں انسان کے اپنے

کارناموں سے زندہ رہتا ہے۔ عبدالکلام کے خاندان کا نام بھی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ان کی ایجادکاری سے ہی روشن رہے گا۔ ایسی انھیں امید ہے۔ 'خواہشِ اجداد' کا یہ بند دیکھیے جہاں خواب میں آکر والدین سوال کرتے ہیں :

پھر وہی نیند، وہی خواب
وہی ایک سوال
میرے ماں باپ کو جس کا تھا ملال
جھانک کر باغِ ارم سے جو کیا کرتے تھے
بس وہی ایک سوال
کون وارث ہے ترا
نام لیوا ہے بھلا کون ہمارا ترے بعد

اور جب شاعر نے شب و روز کی محنت اور اختراعی قوت سے 'اَگنی' تیار کرلی تو اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے والدین کے خواب کو پورا کر دکھایا ہے۔

اور پھر ہوگئی 'اَگنی' تیار
میرے کنبے کا وقار
یہ تھی اولاد مری نازشِ تخلیق مری
کر دیا میں نے جسے خواہشِ اجداد کی نذر

ڈاکٹر عبدالکلام کی شاعری میں فطرت ایک جاندار (ANIMATE) کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندستان میں ابتدائی ویدک عہد سے عہد حاضر تک فطرت، رشیوں اور مفکروں کے غور و خوض کا مستقل موضوع رہی ہے۔ ایک TROPICAL ملک ہونے کی وجہ سے فطرت کے شاداب اور رنگین مظاہر شمال سے جنوب تک انسانی زندگی اور اس کی تہذیب پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ابتدائی ویدک عہد میں اَگنی، ہوا، پانی جیسے مظاہر فطرت کو انسان نے ارضی دیوتاؤں کی شکل دے دی تھی۔ بعد میں سانکھیہ کے مادی فلسفہ میں بھی یہ 'پرکرتی' ہے جو اپنے لذت و الم کے تجربات سے مکتی کی جانب مرد کی رہنمائی کرتی ہے۔ الغرض یورپ کے فلسفہ کے برعکس جہاں (ورڈس ورتھ کی فکر سے قطع نظر) انسان اور اس کے مفادات ہی ساری کائنات کی میزان قدر رہیں ہندستانی تہذیب میں فطرت کبھی انسان کی رفیق اور دوست ہے، کبھی دلبر محبوبہ اور اکثر وہ مادر مہربان کے روپ میں جانی جاتی ہے۔ وہ ذی حس، ذی فہم اور

ذی حیات ہے۔ انسان جب چاہے اس سے مکالمہ کر سکتا ہے۔ اس کی رفاقت سے فیض اٹھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی شاعری میں فطرت کا یہی متحرک اور جاندار کردار ہے جو اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے اور جو اُن کے نظامِ فکر سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ 'دیوارِ سنگ' کا یہ بند دیکھیے :

سوال یہ ہے کہ دیوارِ سنگ کیوں اٹھے ؟
جہاں پہ خدمت انسانیت کا جذبہ ہو
جہاں پہ قالبِ فطرت بچا کے رکھنا ہو
جہاں پہ سود و زیاں کا نہ کوئی خدشہ ہو
جہاں نہ حاصل و محرومیوں کا جھگڑا ہو
کھلی فضا میں جہاں سبزہ زار کھلتے ہوں
ندی پہ، جھیل پہ، سوسن کے پھول اُگتے ہوں
جہاں درخت اُگانے کا ایک مقصد ہو
پرند گھونسلے رکھیں
وہ چہچہاتے رہیں
ہَوا کے لمس سے شاخوں سے
چَھن کے آتی رہے دھوپ
ان درختوں سے
فضا میں اڑتے ہوئے طائرانِ خوش انداز
جو بخشتے ہیں خوشی اور شعورِ آزادی
جہاں گُلوں کی مہک ہے پیامِ ربّانی
یہاں بتاؤ کہ دیوارِ سنگ کیوں اٹھے ؟

ایک دوسری نظم میں شاعر اس المیہ پر اظہارِ تاسف کرتا ہے کہ آج ٹکنالوجی کی ترقی سے انسان مہربان فطرت کے گہوارہ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مصنوعی اور میکانکی طریقوں سے زندگی کو پُر آسایش بنانے کی تگ و دو میں فطرت کے اُن معبدوں کو مسمار کر رہا ہے جو اُس کے جذبۂ انسانیت اور فطرت سے اس کے احساسِ یگانگت کی پرورش کرتے رہے ہیں اور جہاں اُسے محنت اور آزمائشوں کی کڑی دھوپ میں سکون و راحت کی ٹھنڈی چھاوں ملتی

رہی ہے۔

نظم 'حافظ' میں شاعر بچپن کی سہانی یادوں کے سہارے اُس واقعہ کو یاد کرتا ہے جب اُس کے باپ نے رامیشورم کے ساحل پر، مسافروں کو لانے لے جانے کے لیے ایک چوبی کشتی بنائی تھی۔ اس کی فنی تعمیر کے عمل میں شاعر کو مقدس اور اُلوہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

پھر تخلیق ہوئی جو کشتی
موج و ہوا کی تھی وہ سہیلی
قدرت کی ہم جولی بن کر
ناچ رہی تھی وہ پانی پر
کشتی، موج، سمندر، امبر
سب مل جل کر
کھیل رہے تھے بالک بن کر
پانی کی مخلوق نے آ کر
گھیر لیا تھا کشتی کو

یہاں شاعر نے انسان کے دست کاری کے ایک شاہکار کی، فطرت کی طاقتوں سے ہم آہنگی کے منظر کو کیسی دلفریب تمثالوں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ لیکن نصف صدی کے بعد جب اسی ساحلی سمندر میں موٹر کشتی اُترتی ہے تو شاعر بالکل ایک دوسرا منظر دیکھتا ہے۔

صناعی کی روح سے عاری
جذباتِ تخلیق سے خالی
کل پُرزوں کو ڈھال لیا ہے
اور مشینی طاقت سے وہ
چل پڑتے ہیں
فطرت سے انسان کا رشتہ
ٹوٹ گیا ہے
اب جب انجن والی کشتی

چیرتی ہے پانی کا سینہ

بھاگتی ہے ڈر ڈر کر مچھلی

دھواں دھار ضربوں سے پانی

دھند بنا تا رہتا ہے

نظم کے آخر میں فطرت سے انسان کی دوری ایک المیہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

آج ہمارا ملک بلکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ روہنی، اگنی، پرتھوی، آکاش اور ناگ جیسے دور مار میزائلوں کی ایجاد اور تعمیر میں ڈاکٹر عبدالکلام کا کیا حصہ رہا ہے؟ کس طرح شب و روز کی محنت اور کامل یکسوئی سے کام لے کر انھوں نے دفاعی ٹکنالوجی کے میدان میں اپنے ملک کو خود کفیل بنانے کی مسلسل جد و جہد کی ہے۔ ایک ایسی جد و جہد جو ان کے لئے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ لیکن ایک حساس اور باضمیر انسان کی حیثیت سے وہ کبھی کبھی خود احتسابی کے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔ اپنے اس کارنامے کے حوالے سے خود ان کے دل میں بھی سوال اٹھتے رہے ہیں۔ کئی طرح کے ہیجان اور اضطراب نے ان کے وجود کو گھیرے رکھا ہے۔ نظم 'اضطراب' کا یہ بند دیکھیے :

کیا یہ سب اسباب خوشی تھے ؟

فیصلہ اس کا کون کرے گا ؟

کوئی مورخ ؟

سائنس داں ؟

یا میں خود ؟

کیا میرے یہ کام بڑے تھے ؟

میں نے فضا کی کھوج سنبھالی

علم و ہنر کی قدر بڑھائی

یا ایسے ہتھیار بنائے

جو بربادی ساتھ میں لائے ؟

دل میں عجب ہیجان بپا ہے*

فطری طور پر ایک حساس دانشور کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالکلام کی شاعری میں اس طرح کے سوال اور

وسوسے بھی سر اٹھاتے ہیں۔ تاہم تشکیک اور سوالوں کی اس دھند کو نظم میں ان کی خود اعتمادی اور مثبت سوچ ہی تحلیل کرتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں تنہائی، تذبذب، خوف، اندیشے اور چنوتیاں راستہ کاٹتی ضرور ہیں لیکن یہی سب انسان کی قوتِ عمل کو مہمیز کرتے اور مقصد آفرینی پر اکساتے ہیں۔ صرف یہی نہیں، سوالات کی چبھن اور نت نئی مشکلات کا احساس ہی انسان کو نئے جہانوں کی کھوج پر آمادہ کرتا ہے۔ یعنی بقول اقبال: ''تو شب آفریدی، چراغ آفریدم'' کا سلسلہ ازل سے جاری ہے۔

بے شک ان شعری تخلیقات میں ڈاکٹر عبدالکلام کی ہمہ گیر اور تہہ دار شخصیت کے صرف چند پہلو ہی سامنے آسکے ہیں لیکن وہ بھی ان کے خوابوں، خواہشوں اور ان آرزومندیوں کی روشن جھلکیاں دکھاتے ہیں جن کی اپنے وطن اور انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے بچپن سے انھوں نے پرورش کی تھی جو انھیں آج بھی عزیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی اختراعی سرگرمیوں اور تخلیقی کاوشوں کے حوالے سے ہی وہ اپنے وطن کے عوام کی زندگی اور ان کی ہمہ جہت تعمیری تگ و دو سے جڑے ہوئے ہیں۔

C-166, Vivek Vihar, Phase-I, DELHI - 110095

---

* مضمون میں نظموں کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ ممتاز شاعر شکیل شفائی کے اردو ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی نظموں کا یہ ترجمہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ (ق۔ر)

ہلال احمد قادری

فارسی و اردو ادب پھلواری شریف میں

پھلواری شریف کی اسلامی آبادی آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہاں سب سے پہلے آنے والا خاندان، مخدوم سید منہاج الدین راستی کا خاندان ہے، اس خاندان میں بڑے ذی علم افراد پیدا ہوئے۔ ۱۳۰۴ھ تک حکومت قائمہ اسی خاندان سے قاضی منتخب کرتی رہی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذی علم خانوادے نے علما اور قضاۃ کے علاوہ شعرا، اُدبا اور مصنفین و مؤرخین بھی پیدا کئے ہوں گے، لیکن تذکرہ نگاروں کی نارسائی اور خاندان کی بدمذاقی کا یہ حال ہے کہ نہ اس عہد کی کوئی تاریخ مرتب کی گئی اور نہ خاندان کے ممتاز علما و اہل فن کا کہیں کوئی ذکر ملتا ہے، آج ہم اُس خانوادے کی علمی عظمت کا تحریری ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

امیر عطاء اللہ جعفری زینبی کا خانوادہ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں آباد ہوا۔ اس خانوادے کے علمی اثاثے بہت حد تک محفوظ رہے۔ اس لئے پھلواری کے علمی و ادبی دور کے آغاز و ارتقا کو اسی خانوادے کا مرہونِ منت سمجھنا چاہئے۔

عام رجحان یہ ہے کہ پھلواری شریف کے خانوادے نے صرف فارسی ہی سے تعلق رکھا، اردو ادب کے ارتقا میں ان کا حصہ برائے نام ہے، جیسا کہ پروفیسر اختر اورینوی کی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' کے مطالعہ سے عام قارئین کو یہی محسوس ہوتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی مرحوم کی کتاب میں شعرائے پھلواری کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے، صرف سات یا آٹھ اردو شاعروں کا ذکر ہے۔ بعد کے تذکرہ نگار جب ان کی کتاب کو ماخذ بناتے ہیں تو پھلواری کی ادبی تاریخ کے معاملے میں اتنی ہی واقفیت کو حاصل تحقیق سمجھ لیتے ہیں۔

اولادِ امیر عطاء اللہ میں نظم و نثر کا آغاز کس سے ہوا؟ اس میں اختلاف ہے، اگر بغور دیکھا جائے تو اختلاف کچھ بھی نہیں، بات واضح ہے اور اختلاف کی عمارت کمزور بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ عماد الدین قلندر پھلواروی قدس سرہ متوفی ۱۱۲۵ھ اردو کے پہلے نثر نگار ہیں۔ اس نکتے کا انکشاف سب سے پہلے مولانا تمنا عمادی نے کیا اور اس مفروضے کو اس شد و مد سے حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کی کہ بعض اردو کے محقق بھی اس خیال سے متفق ہو گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی تحقیقی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا'' میں حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قدس سرہ کو اردو کا پہلا نثر نگار اور شاعر تسلیم کیا ہے۔ نثر نگاری پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے، پہلے حضرت کی شاعری پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ حضرت خواجہ کے شاعر

ہونے کا دعوا بھی سب سے پہلے مولانا تمنا عمادی نے کیا تھا اور اس مسئلے میں بھی ڈاکٹر اختر اورینوی کی تحقیق کا مآخذ مولانا تمنا عمادی ہیں۔

حضرت خواجہ قلندر قدس سرہ کی شاعری کی بات اگر متحقق ہوتی تو ہمارے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ خانوادے کی کلاہ افتخار کچھ اور اونچی ہو جاتی لیکن ایک غیر متحقق بات کو بلا دلیل قبول کر لینا اہل دیانت کا شیوہ نہیں۔

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں مخطوطات، بزرگوں کی بیاضیں اور یادداشتیں اور دوسری بہت سی اہم تحریریں موجود ہیں، ان میں حضرت تاج العارفین، حضرت خواجہ عماد الدین قلندر، حضرت مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی، مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری، حضرت شاہ نور الحق تپاں، حضرت شاہ ابوالحسن فرد رحمہم اللہ کے دست ہائے مبارک کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ خانقاہ مجیبیہ کے یہ عظیم ذخائر مخطوطات اور قدیم تحریریں حضرت خواجہ قلندر قدس سرہ کی شاعری کے متعلق بالکل خموش ہیں۔ جبکہ خانقاہ مجیبیہ کی قدیم تحریروں سے پھلواری کی تاریخ پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔

مولانا حکیم محمد شعیب رضوی علیہ الرحمۃ نہ صرف پھلواری بلکہ صوبۂ بہار کی علمی و ادبی تاریخ، شجرہ ہائے نسب، طریقت کے سلسلوں اور صوفی خانوادوں کے نسبی روابط پر گہری اور مؤرخانہ نگاہ رکھتے تھے۔ اس کا اعتراف قاضی عبد الودود، پروفیسر سید حسن عسکری اور خود اختر اورینوی کو بھی تھا۔ حکیم صاحب موصوف کی تصانیف ''آثارات پھلواری''، ''تذکرہ شیوخ بہار''، ''تذکرہ علمائے بہار''، ''تذکرہ شعرائے پھلواری وغیرہ ان کی وسعت معلومات اور دقت نظری کی دلیل ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ حضرت خواجہ قلندر کے اشعار دریافت کرنے سے قاصر رہے، جب کہ حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری کے اردو اور فارسی اشعار تذکرہ شعرائے پھلواری میں موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خاندان میں بہت سی باتیں زبانی روایت پر مبنی ہوتی ہیں اور روایت کا تواتر تحریر سے کم نہیں ہوتا، لیکن اس سلسلے میں یہاں کوئی زبانی روایت بھی موجود نہیں ہے۔

مولانا تمنا عمادی کی شخصیت کے اس رخ سے کم لوگ واقف ہیں کہ وہ خاندان کے ترفُّع اور تعلّی کی غرض سے بہت سی باتیں از خود تصنیف فرمادیا کرتے تھے۔ جو لوگ ان کے اس وصف سے واقف ہیں ان کے لئے مولانا تمنا کا یہ دعوا کہ حضرت خواجہ قلندر نثر نگار اور شاعر تھے، امر حیرت نہیں۔ باعثِ استعجاب یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے مولانا تمنا عمادی کے اس مفروضے کو بلا تحقیق تسلیم کر لیا۔ ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' میں انہوں نے حضرت خواجہ عماد الدین قلندر کے کلام کا نمونہ پروفیسر معین الدین دردائی کے حوالے سے دیا ہے اور حاشیے میں لکھا ہے ''دردائی نے کوئی حوالہ نہیں دیا، میرے خیال میں پھلواری شریف کے کسی مخطوطے سے حضرت عماد کا کلام حاصل ہوا ہے [1]'' ظن و تخمین کی بات کسی محقق کو

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص ۲۰۲ (حاشیہ)

زیب نہیں دیتی۔ ان کی تحریر سے یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ کلام کا اصل نسخہ یا کوئی نوشتہ بھی ان کی نگاہوں سے گذرا ہے۔ انہوں نے بس اسی قدر زحمتِ تحقیق گوارا کی کہ دردائی کی کتاب ''بہار میں اردو شاعری'' اور رسالہ معیار پٹنہ کا اقتباس اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔ صفحہ ۱۷۱ میں حضرت شاہ غلام نقشبند قدس سرہ کے ذکر میں لکھتے ہیں ''بعض افراد سجّاد اور عماد کے کلام کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے، لیکن میرے نزدیک وہ سب اصلی ہیں۔ حکیم شعیب مرحوم کا بیان ہے کہ حضرت نور الحق تپاںؔ پھلواروی نے حضرت سجّادؔ کے کلام کی نقل کی تھی۔ تپاں شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے پوتے اور حضرت سجّادؔ کے داماد تھے۔ نور الحق تپاںؔ کی تحریریں خاندانی دستاویزات میں ملتی ہیں اور پھلواری کے شاہ صاحبان میں معروف ہیں۔ میں اور پروفیسر حسن عسکری صاحب نے تپاںؔ کی تحریریں حکیم شعیب صاحب مرحوم کے پاس دیکھی ہیں۔ تپاںؔ کے بہت سے خودنوشت مرثیے پھلواری میں موجود ہیں اور ہم نے دیکھے ہیں۔ پھلواری کے صوفیا کے کلام ہرگز الحاقی نہیں، اگر تذکروں میں ان میں سے بیشتر کا ذکر نہیں تو یہ تذکرہ نگاروں کی نارسائی ہے۔ اب جو مخطوطات و مسودات ہمارے سامنے آرہے ہیں تو حقائق پر سے پردے اٹھ رہے ہیں۔ داخلی شہادت بھی کوئی ایسی نہیں جس کی وجہ سے ہم انہیں جعلی یا الحاقی سمجھیں۔ بزرگوں کے کلام کو شاہ نعمت اللہ پھلواروی (۱۱۶۰ھ-۱۲۴۵ھ) نے بھی مرتب کیا ہے۔ قدیم منقولات بھی موجود ہیں اور بعد میں ان قدیم منقولات سے نقلیں ہوئی ہیں۔ حکیم شعیب مرحوم نے شواہد کی ساتھ میرے اور پروفیسر حسن عسکری صاحب کے سامنے اس مسئلہ پر تشفی بخش روشنی ڈالی تھی۔ اور ہم مطمئن ہو گئے تھے۔ حضرت عمادؔ اور حضرت سجّادؔ کے کلام کے مخطوطات یا منقولات پھلواری سے باہر اب تک دستیاب نہیں ہوئے''۔ [1]

اردو کے مایۂ ناز محقق اور نقاد قاضی عبدالودود مرحوم، مولانا تمنا عمادی کو ثقہ اور قابل اعتماد راوی نہیں سمجھتے اس لئے ان کے توسط سے جو چیزیں سامنے آئیں وہ قاضی صاحب کے نزدیک مشکوک ٹھہرتی ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ عمادالدین قلندر کی شاعری اور نثر نگاری کو وہ بالکل جعلی قرار دیتے تھے۔ حضرت شاہ غلام نقشبند سجاد اور حضرت تپاںؔ کے اردو اشعار بھی ان کے خیال میں الحاقی ہیں کیونکہ وہ بھی مولانا عمادی کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے سطور بالا میں رفع اعتراض کر کے بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی یہ عبارت الجھی ہوئی اور تضاد بیانی کا شکار ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس پر جو تعاقب کیا ہے ''مقالات قاضی عبدالودود'' میں اس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

محل اعتراض اوّلاً تو یہ ہے کہ بات شروع کی ہے سجاد اور عماد کے کلام سے متعلق اور ثبوت پیش کر رہے ہیں صرف تپاںؔ اور سجّادؔ کے کلام کا۔ حضرت عماد کے کلام کا ثبوت پیش کرنے سے انہوں نے گریز کیوں کیا؟ حضرت عماد کے متعلق بھی

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء۔ ص ۲۲۱

ان کو حکیم صاحب علیہ الرحمۃ کی رائے نقل کرنی ضروری تھی، ڈاکٹر اختر اور رینوی کے اس گریز سے کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ وہ حضرت خواجہ عمادالدین قلندر کے کلام کا قابل اطمینان ثبوت فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں، دلیل و برہان کے بغیر حقیقت بھی بے وزن ہو جاتی ہے کجا کہ ایک تشنۂ تحقیق بات۔

ثانیاً یہ کہ جب حضرت عماد کا کلام پھلواری سے باہر دستیاب نہیں ہے تو پھر وہ کون سے مخطوطات و مسودات ہیں جن کے سامنے آنے سے حقایق آشکارا ہو رہے ہیں؟ ڈاکٹر اختر اور رینوی نے جن مسودات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دراصل مولانا تمنا عمادی کی دریافت بلکہ ایجاد ہیں۔ ماہرین مخطوطات کی تحقیق و تفتیش کے اندیشے سے تمام وضعی شواہد وہ اپنے ساتھ لیتے گئے اور خانقاہ عمادیہ میں ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جو حضرت خواجہ قلندر قدس سرہ کی شاعری کے ثبوت فراہم کرنے میں مؤید ہو سکے۔

مولانا تمنا عمادی کے متعلق قاضی عبدالودود کے شکوک و شبہات بے بنیاد نہیں ہیں۔ مولانا تمنا نے جس وقت اس کا دعوا کیا تھا اس وقت بھی کوئی قدیم تحریر نہیں دکھائی تھی۔ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے تھے تو جو تحریر بھی ان کو دستیاب ہوئی تھی اس کو ماہرین مخطوطات کے سامنے پیش کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ جن اشعار کو حضرت خواجہ قلندر قدس سرہ کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مولانا کو کہاں سے ملے تھے اور کس کے ہیں؟ ممکن ہے بعض حضرات جو مولانا تمنا عمادی کے "خبر واحد" کو "روایت متواترہ" کا درجہ دیتے ہیں میری بات کو قابل اعتنا نہ سمجھیں۔ لیکن حضرت خواجہ قلندر قدس سرہ کی طرف منسوب اشعار واقعی حضرت ہی کے ہیں؟ اس کے ثبوت کی فراہمی کا مسئلہ اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ یہاں پر ہم "تذکرہ شعرائے پھلواری" سے مولانا حکیم محمد شعیب نیر رضوی پھلواروی کی تحریر نقل کرتے ہیں۔ اقتباس ذیل سے پھلواری شریف میں آغاز شعر و سخن کا دور بھی متعین ہو جاتا ہے اور ترویج و ارتقا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حضرت نیر لکھتے ہیں :-

> "گیارھویں صدی ہجری کے وسط سے ریختہ زبان میں نظم لکھنے کی طرف جب شعرا کی توجہ ہوئی تو پھلواری میں بھی جو کہ صوبہ بہار کا ایک [illegible] ہے، جہاں موزوں طبع علما و فضلا، مشائخ، درویش تقریباً آٹھویں صدی سے رہتے [illegible] ہیں، ہر شعبۂ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فارسی نظم گوئی میں کمال پیدا کرتے تھے۔ ریختہ زبان میں بھی انہیں نظم لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔
>
> ۱۱۵۰ھ کی ریختہ زبان میں پہلی نظم جو نظر سے گذری ہے وہ حضرت مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قادری قدس سرہ کی ہے۔ اس سے پہلے کوئی کلام ریختہ زبان میں میری نظر سے نہیں گذرا۔ ریختہ زبان میں نظم لکھنے کا اس وقت رواج بھی کم تھا۔ مگر اس زبان میں نئی روح

پھونکنے والے اور بزبان ریختہ شعر وسخن کا رواج دینے والے پھلواری میں حضرت شمس العارفین شاہ غلام نقشبند سجاؔد قدس سرہ ہوئے۔ آپ کے وسط زمانۂ حیات میں حضرت شاہ محمد آیت اللہ شورش ہیں جنہوں نے ۱۱۶۱ھ میں ایک مبسوط مثنوی ''گوہر جوہری'' کے نام سے لکھی اور قدر دانوں میں پیش کی۔ گوہر شناسوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس کے بعد دیگر شعرا کو بھی ریختہ میں طبیعت آزمائی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ فارسی نظم کے ساتھ ریختہ میں بھی نظم کرنے کا رواج ہوا۔ تیرھویں صدی کے شعرا کے کلام تقریباً فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں برابر دیکھے جاتے ہیں اور کلام میں صفائی بھی سابق سے زیادہ دیکھی جاتی ہے۔'' [1]

اقتباس بالا سے واضح ہوا کہ پھلواری میں حضرت تاج العارفین مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری قدس سرہ سے پہلے کسی کا اردو کلام دستیاب نہیں ہوا۔ حضرت نیؔر نے تذکرہ شعرائے پھلواری میں سب سے پہلے حضرت تاج العارفین کے ریختہ کے چند اشعار کو جگہ دی ہے، جس میں ایک نعتیہ قطعہ حضرت کے سفینے سے نقل کیا ہے جو دست خاص سے لکھا ہوا ہے، اس میں سات اشعار ہیں، باقی اشعار پڑھے نہیں جا سکے۔ حکیم صاحب نے بھی دو ہی شعر نقل کئے ہیں، وہ یہ ہیں ؎

کیا جیو فدا ایا حیات النبی — نہ کر یو جدا ایا حیات النبی
تمہارے جو درگاہ آیا فقیر — درس مانگے بھیکھ یا حیات النبی [2]

ریختہ کی ایک اور غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

اٹھ جا پھرے کس فکر میں آخر بسیرا گور ہے — رہتا نہیں کیوں ذکر میں آخر بسیرا گور ہے
ساتھی جو تیرے چل بسے تجھ لوبھ کے پھندے پھنسے — تجھ دیکھ کے مورکھ ہنسے آخر بسیرا گور ہے
دھرتی کہے تو پاؤں ناں تجھ کو مجھ میں آؤں ناں — بھولا جو میں سمجھاؤں ناں آخر بسیرا گور ہے
جگ میں ہے تم آئی کر من کو رکھا بھولا مگر — کیسے کہوں سمجھا مگر آخر بسیرا گور ہے [3]

تذکرۂ شعرائے پھلواری کے مطابق یہ غزل ۱۱۷۰ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کے [illegible] حضرت کے سفینے میں درج ہیں اور راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں ان پر کوئی تاریخ نہیں لکھی [illegible] صاحب کی ولادت ۱۶۸۵ء میں اور وفات ۱۷۷۵ء میں ہے۔ اس سے پھلواری شریف [illegible]

[1] تذکرہ شعرائے پھلواری، ص ۹ [2] سفینہ تاج العارفین [3] تذکرۂ شعرائے [illegible] ص ۹

جاسکتا ہے۔

جو لوگ اس کے مدعی ہیں کہ آپ سے پہلے پھلواری میں ذوقِ شعر وسخن کا آغاز ہو چکا تھا اُن کے زرے دعوے اہلِ تحقیق وانتقاد کے نزدیک مسموع نہیں ہیں۔

تذکرہ شعرائے پھلواری میں حضرت تاج العارفین کے فارسی اشعار بھی ہیں جن کے متعلق مصنف کا دعوا ہے کہ یہ اشعار انہوں نے حضرت شاہ غلام حسین بن شاہ غلام سرور جعفری کے سفینے میں دیکھے ہیں۔" آثارات پھلواری" میں شاہ غلام حسین کی شادی کا ذکر ہے، لیکن خود ان کی ولادت و وفات کا مصنف نے ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ ان کے والد شاہ غلام سرور کی تاریخ وفات ۶ / رجب ۱۲۴۰ھ لکھی ہے، اور حضرت تاج العارفین سے بیعت کی تاریخ ۱۱۷۴ھ لکھی ہے۔ ان کی شادی ملاّ مبین بن قاضی حیات مزید جعفری پھلواروی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی [1]۔ شاہ غلام حسین کی ولادت کا سنہ متعین نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کے عہد کا تعین مشکل نہیں، اور وہ اس طور پر کہ ملاّ مبین نے ۱۱۵۴ھ میں وفات پائی۔ ان کے تین صاحبزادے تھے۔ (۱) مولوی عبد العلی (۲) مولوی احمد علی (۳) مولوی اسد علی اور دو صاحبزادیاں۔ تینوں بھائی حضرت ملاّ وحید الحق ابدالی پھلواروی (متوفی ۱۲۰۰ھ) کے شاگرد تھے۔ مولوی عبد العلی نے ۱۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ مولوی عبد العلی اور ان کے بھائیوں اور بہنوں کی عمر میں چند سال کا فرق ہوگا۔ ملاّ مبین کی دختر دوم کی شادی مولانا عبد المغنی جعفری سے ہوئی۔ مولانا عبد المغنی کی ولادت ۱۱۵۰ھ میں اور وفات ۱۲۲۳ھ میں ہوئی۔ شاہ غلام حسین مولانا عبد المغنی کے ہم زلف تھے۔ ظاہر ہے کہ دونوں معاصر تھے۔ اس لئے شاہ غلام حسین نے مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری، مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری کا زمانہ یقینی طور پر پایا، بایں سبب شاہ غلام حسین کے سفینے میں حضرت تاج العارفین کے فارسی اشعار کا موجود ہونا ان کے صحت کی قوی اور مستند دلیل ہے۔ حضرت کے چند فارسی اشعار ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

شد اسیرِ غمزۂ چشمِ محمد جانِ من لطف فرما کن تبسّم اے دل وایمانِ من

قدسیاں بر آستانت جبہ سائی می کنند چیست عالی رتبہ یارب منزلِ سلطانِ من

کلبۂ احزانِ مارا رشکِ صد جنت کند گر شود آں خسرو خوبی شبے مہمانِ من

پہلے شعر "شد اسیر غمزۂ............" کو حضرت کے پرپوتے حضرت نصؔر نے اپنی ایک غزل کا مطلع بنایا ہے۔ حکیم شعیب صاحب کے مطابق خاندانی روایت یہی تھی کہ حضرت نے یہی ایک مطلع نظم فرمایا تھا مگر حکیم صاحب کو شاہ غلام حسین کے سفینے میں دو شعر اور بھی ملے۔ اس بحر اور ردیف میں یہی تین اشعار ہیں۔

زدستِ عشق بے صبرم بکن خود انچہ می خواہی

زدین و کفر بے خبرم بکن خود انچہ می خواہی

---

[1] آثارات پھلواری ص ۱۱۷

بہشتِ مااست کوئے تو دلم مدہوشِ بوئے تو

سرم قربانِ روئے تو بکن خود انچہ می خواہی

اشعار میں تخلص استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ صاحب تذکرۂ شعرائے پھلواری کی تحقیق کے مطابق یہ غزل ۱۱۰۷ھ میں لکھی گئی ہے [۱]، اور حضرت نے ۱۱۹۱ھ میں وصال فرمایا [۲]۔ قرینہ غالب ہے کہ شاہ غلام حسین نے حضرت کی حیات ہی میں ان متبرک کلام کو اپنے سفینے میں محفوظ کر لیا ہو۔

حضرت کی ذات فیوض و برکات کا سرچشمہ تھی۔ ایک طرف آپ نے دنیائے ولایت کو تابانی بخشی اور فقر و معرفت کے معیار کو بلند سے بلند تر کر دیا تو دوسری طرف خاکِ پاکِ پھلواری میں شعر و سخن کی گویا تخم ریزی کی۔ آپ کے بعد ہی ریختہ گوئی اور فارسی شاعری اور فارسی نثر نگاری نے ترویج و ارتقا کی طرف پیش رفت کی۔ تعجب ہے کہ پروفیسر اختر اورینوی نے ''بہار میں اردو..........'' میں حضرت شاہ مجیب اللہ صاحب کے اشعار پیش نہیں کئے۔ اگر وہ حکیم صاحب سے استفادہ کرتے تو ان کو یہ مل سکتے تھے۔

جن شعرا کے دم سے پھلواری، علم و ادب اور شعر و سخن کی پھلواری بنی ان میں حضرت تاج العارفین کے بعد حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قدس سرہ کے صاحبزادے حضرت شاہ غلام نقشبند سجاؔد کا نام آتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۱۱۶ھ مطابق ۱۷۰۴ء میں ہوئی۔ آپ فارغ التحصیل عالم تھے۔ درسیات کی تکمیل تمام و کمال حضرت تاج العارفین سے کی۔ بیعت اور تعلیم باطنی بھی کچھ حضرت تاج العارفین سے پائی تھی۔ آپ کی شاعری بھی غلبۂ حال و مستی کے موقع پر واردات قلبی کے اظہار اور اسرار طریقت کے بیان کا ذریعہ تھی۔ آپ نے شاعری کی طرف اہل فن شعرا کی طرح توجہ نہیں کی۔ آپ مشہور شاعر ولؔی دکنی کے معاصر تھے۔ ولؔی دکنی کی وفات کے وقت آپ کی عمر اکتالیس سال تھی۔ ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں انتقال فرمایا۔ [۳]

تذکرہ شعرائے پھلواری میں آپ کی آٹھ فارسی غزلیں اور تیرہ ریختہ کی غزلیں ہیں۔ اردو کلام کی وقعت اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سجاؔد نے کبھی وطن سے باہر قدم نہیں نکالا۔ حضرت سجاؔد کے اردو اشعار ریختہ کا اچھا نمونہ ہیں۔ رہ گئے فارسی اشعار تو ان میں استادانہ رنگ نمایاں ہے۔ اردو کلام پر قاضی عبدالودود الحاقی ہونے کا شبہ کرتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اشعار حضرت سجاؔد کے نہیں ہیں۔ لیکن قاضی صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیوں کہ حضرت سجاؔد کے کلام کی دریافت مولانا تمنا عمادی ہی کے ذریعے نہیں ہوئی بلکہ مولانا حکیم شعیب رضوی کی نظر میں بھی یہ حضرت سجاؔد ہی کے اشعار ہیں۔ تذکرہ شعرائے پھلواری میں انہوں نے ان اشعار پر اپنے کسی شبہے کا اظہار نہیں

---

[۱] تذکرہ شعرائے پھلواری، ص ۹ — [۲] آثارات پھلواری، ص ۲۳۵

[۳] تذکرہ شعرائے پھلواری، ص ۱۰۔ آثارات پھلواری، ص ۱۳۱

کیا ہے۔

ریختہ گوشعرا میں حضرت ملا وحید الحق ابدال (۱۱۲۵ھ-۱۲۰۰ھ) کا نام بھی آتا ہے۔ ریختہ میں آپ کے کچھ اشعار ملتے ہیں۔ فارسی کلام دستیاب نہیں، بعض غزل اردو اور فارسی فقروں اور مصرعوں کا امتزاج ہے۔ مثلاً

یا نبی دل کوں بیقراری ہے — چشم گریاں سوں اشکباری ہے
گرچہ من از گنہ سیہ رویم — عفو کرنا صفت تمہاری ہے
قبلۂ حاجتم توئی جاناں — مجھ کو تم سے امیدواری ہے
کب تلک یہ امید برآوے — ہائے کیا سخت انتظاری ہے
سوز عشق تو مو بمو دارم — تن جلے جی میں سوگواری ہے
بے وصال جمال مہہ رویت — نالہ و درد و آہ و زاری ہے [1]

اسی عہد میں پھلواری کی خاک سے ایک اور شاعر اٹھا جس نے فارسی اور اردو شاعری کو کمال تک پہنچایا اور وہ حضرت شاہ آیت اللہ جعفری ہیں۔ ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا [2]۔ فارسی میں شورش اردو میں جوہری اور ہندی میں مذاقی تخلص کرتے تھے۔ اردو فارسی میں باقاعدہ شاعری آپ ہی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ آپ کی حیات وخدمات پر ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر صدرالدین احمد فضا شمسی، تحقیقی مقالہ ''حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری'' کے عنوان سے لکھ چکے ہیں، یہ کتاب پٹنہ یونیورسیٹی سے ۱۹۶۴ء میں چھپی ہے۔ ڈاکٹر صدرالدین مرحوم نے اس کتاب میں شاہ آیت اللہ جوہری کے مکمل اردو و فارسی کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ آپ کی مشہور مثنوی ''گوہر جوہری'' بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوہری ایک بلند مرتبہ شاعر تھے۔ ان سے پہلے پھلواری میں اتنا عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔

ان کے گھر میں ان کی والدہ خود شاعرہ تھیں۔ فارسی شاعری کی ترقی میں بہار میں جوہری کا بہت اہم حصہ ہے۔ جوہری کی اردو مثنوی کا جہاں تک سوال ہے جو ۱۱۶۱ھ میں لکھی گئی اس وقت تک سوائے دکن کے ہندوستان کے کسی حصے میں مکمل طویل مثنوی کا لکھا جانا ثابت نہیں ہے۔ [3]

اٹھارہویں صدی میں ہمیں بہت سے فارسی گوشعرا کے نام ملتے ہیں، جس وقت یہ چمنستان شورش کی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا تھا، شورش کے تلامذہ بھی شعر وسخن میں ناموری حاصل کر چکے تھے ان میں غلام مخدوم ثروت، غلام جیلانی

---

[1] تذکرہ شعرائے پھلواری، ص ۲۵ — [2] آثارات پھلواری، ص ۶۰

[3] ''حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، ان کی حیات اور شاعری'' ص ۱

سرشارؔ اور امان علیؔ ترقی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

سرشارؔ کا سال ولادت ۱۱۳۸ھ ہے۔ امیر عطاء اللہ جعفری کی اولاد میں ہیں۔ علوم دینیہ میں اپنے والد مولانا سلیح الدین سے تلمذ تھا۔ مولانا حکیم شعیب رضوی نے سرشارؔ کے کچھ حالات اور کلام "تذکرہ شعرائے پھلواری" میں یکجا کر دیے ہیں۔ کلام صرف فارسی میں دستیاب ہے۔ سرشار کا فارسی کلام ان کو ایک قادر الکلام شاعر ثابت کرتے ہیں۔ غزلوں میں صائبؔ اور حافظؔ کا رنگ پایا جاتا ہے اور وہ اکثر انہیں دونوں کی پیروی کرتے ہیں۔ جا بجا حافظؔ کے مصرعوں پر مصرعہ چسپاں کیا ہے اور حافظ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، کہتے ہیں ؎

بفیض حافظؔ شیراز مے سرشار می خواہد   الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

۱۲۰۲ھ میں انتقال کیا۔ دیوان کتب خانہ مجیبیہ بدریہ پھلواری شریف میں موجود ہے۔ ثروتؔ کا دیوان بھی کتب خانہ مجیبیہ بدریہ میں موجود ہے۔ وہ بھی فارسی کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں دو ایسے باکمال شاعر پیدا ہوئے جن کو فارسی شاعری کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب کہنا چاہیے، وہ حضرت مولانا شاہ نور الحق تپاںؔ اور حضرت مولانا شاہ شمس الدین ابو الفرح طلعتؔ ہیں۔ دونوں حضرات حضرت تاج العارفین کے حقیقی پوتے، تربیت یافتہ اور مرید و مجاز اور ایک دوسرے کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت تپاںؔ کی ولادت ۱۱۵۶ھ میں ہوئی۔ تعلیم حضرت ملا وحید الحق ابدال سے پائی۔ حضرت سجادؔ کے بعد خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشیں بنائے گئے، کیوں کہ آپ حضرت سجاد کے داماد تھے، اور ان کو کوئی اولاد ذکور نہ تھی۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔ آپ فارسی کے بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان دو ضخیم جلدوں میں غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے اردو کلام میں صرف مراثی نظر سے گذرے ہیں۔ رسالہ معیار پٹنہ میں چند اردو غزلیں مولانا تمنا عمادی نے چھپوائی تھیں۔ مراثی کی زبان اور غزلوں کی زبان میں بہت نمایاں فرق ہے۔ مراثی میں اگر قدامت کا رنگ ہے تو غزلیں دور جدید کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی لئے قاضی عبد الودود ان غزلوں کی نسبت حضرت تپاںؔ کی طرف صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں وہ تمنا عمادی کی تصنیفات سے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت تپاںؔ کی غزلوں کی صحت اور عدم صحت پر گفتگو کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ فارسی نثر میں بھی آپ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ہم اس کو نثری خدمات کے ضمن میں پیش کریں گے۔ حضرت تپاںؔ کی شاعری پر تحقیقی مقالہ ترتیب پا چکا ہے۔

حضرت شاہ شمس الدین ابو الفرح طلعتؔ (۱۱۶۳ھ - ۱۲۲۸ھ) کے متعلق صاحب تذکرۃ الکرام مولانا شاہ ابو الخیرۃ پھلواروی لکھتے ہیں :

"یگانۂ عصر در علم عروض و حق آنست کہ در علم عروض نظیر نداشت۔ یک شعر از مطلع غزلیات وے

یادداشتم ثبت ایں تالیف کردہ می آید [1]

زوصف آں قدر عنا چہ گویم   خبر از عالم بالا چہ گویم

فن شاعری میں آپ کو حضرت تپاںؔ اور شورشؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ [2]

آپ کا فارسی دیوان دست خاص کا تحریر کردہ کتب خانہ مجیبیہ بدریہ میں موجود ہے۔ آپ کی حیات اور شاعری پر تحقیقی مقالہ حال ہی میں مرتب ہو چکا ہے۔ آپ کا مزار شہر کلکتہ کے مصری گنج محلہ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

شعر و سخن کے دور ارتقا میں جبکہ اٹھارہویں صدی تمام ہو رہی تھی، کچھ ایسے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے فارسی و اردو میں شعر تو کہے باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ ان میں ایک اہم نام حضرت مولانا شاہ احمدی پھلواروی کا ہے۔ آپ کے چند فارسی قطعات اور اردو مراثی موجود ہیں جو آپ کی سخن سنجی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری میں بھی پھلواری سے نامی گرامی شعرا اٹھے۔ ان میں مولانا امان علی ترقیؔ ہیں ان کی ولادت ۱۱۸۰ھ اور وفات ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔

ترقیؔ ملا فصیح الدین جعفری کی اولاد میں ہیں۔ ثروتؔ اور شورشؔ کے شاگرد ہیں۔ ترقیؔ کا کلام نہایت پاکیزہ ہوتا ہے اور طرز ادا دلچسپ۔ حضرت تپاںؔ آپ کے کلام کے مداح تھے۔ ترقیؔ کو حضرت فردؔ کا کلام بہت پسند تھا، گرچہ حضرت فردؔ ان سے عمر میں گیارہ سال چھوٹے تھے۔ ترقیؔ کلام فردؔ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

مطبوع دل ما است ترقیؔ سخن فردؔ   ما میل بجز فردؔ بافراد نکردیم

غزل گفتم چہ در سفتم بزیر خاک در خفتم   ترقیؔ خواہ فردم من کہ دارد یادگار من

ترقیؔ کا کلام اردو میں مراثی کی شکل میں ہے۔ فارسی دیوان پھلواری خانقاہ میں محفوظ ہے۔ ترقیؔ کی غزلوں میں حافظؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ترقیؔ کی مثنویاں زیادہ مشہور ہوئیں [3]۔ جو پھلواری کی تاریخ اور بزرگان پھلواری کے حالات میں ہیں اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ترقیؔ کے کلام کا کچھ حصہ تذکرہ شعرائے پھلواری میں شامل ہے۔

مولانا حافظ شاہ عبدالغنی منعمی پھلواروی بھی شعر و سخن کی اس بزم میں ترقیؔ کے معاصر گذرے ہیں۔ آپ بھی امیر عطاء اللہ جعفری کی اولاد میں تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا جمال الدین ڈھبری سے تعلیم پائی۔ شعر و سخن میں مفتی غلام مخدوم ثروتؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ علمی تبحر کے ساتھ شاعری میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ کا دیوان فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں تھا [4]۔ حضرت شعیب نیرؔ رضوی نے بڑا احسان کیا کہ تذکرہ شعرائے پھلواری میں فارسی کی چند غزلیں

---

[1] تذکرۃ الکرام، ص ۳۱۶   [2] تذکرہ شعرائے پھلواری، ص ۸۲

[3] امان علی ترقی کے تفصیلی حالات تذکرۃ الکرام اور تذکرہ شعرائے پھلواری میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

[4] آثارات پھلواری۔ ص ۲

اور اردو کلام کا کچھ زیادہ حصہ محفوظ کرلیا [1]۔ ضرورت ہے کہ ان کے اردو کلام کے محاسن کا جائزہ لیا جائے اور معاصر شعرا کے کلام سے موازنہ کیا جائے۔ چند شعر بطور نمونہ اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں ؎

رہنے دو اس نقاب کو چہرہ کے رو برو　　　کیا جانے کون دیکھے اور کس کی نظر لگے

پڑا ہے عشق کے دریا میں لنگر کشتیِ دل کا　　　خدا حافظ ہے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

تارِ زلفوں کا ترے مضمون پریشاں ہوگیا　　　بیت ابرو سے ترے ایک جمع دیواں ہوگیا

کیا کرے بخیہ گری اس عقلِ ناقص کی مدد　　　چاک اس دستِ جنوں سے جیب و داماں ہوگیا [2]

تیرھویں صدی کی ابتدا میں جبکہ ہماری ''پھلواری'' عندلیبانِ خوش نوا کی نغمہ سنجیوں سے زمزمہ بار ہو رہی تھی۔ شعر و سخن اور علم و ادب کے افق سے ایک اور ستارہ طلوع ہوا یعنی، حضرت ملک الشعرا مولانا شاہ ابوالحسن فرد کا آفتابِ اقبال آسمانِ عظمت و سعادت پر جلوہ گر ہوا۔

فرد اپنی خوش بیانی و نوا سنجی سے تمام بلبلانِ خوش الحانِ پھلواری پر غالب آ گئے ؎

بلبل آمد بفغان گل زگریبان بگذشت
فرد شوریست بہ گلشن زغزل خوانی من

حضرت فرد کی غزل سرائی نے صوفیانہ شاعری کو نئی آب و تاب اور نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ فرد کا عہد نہ صرف پھلواری میں بلکہ صوبہ بہار میں فارسی شاعری کے عروج اور کمال کا عہد ہے۔ حضرت فرد نے غزل گوئی کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ آپ کے ایک معاصر مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کو غزل گوئی میں آپ کی عالمگیر شہرت کا اعتراف کرنا پڑا۔

؎ درزمین ہند حسرت بعد خسرو ہمچوں فرد　　　درگمان ما نشد پیدا غزل خوانے دگر [3]

فرد کا سال ولادت ۱۱۹۱ھ اور سن وفات ۱۲۶۵ھ ہے۔ ''طوطیٔ شکر شکنِ فارس'' سے سال وفات نکلتا ہے۔ اپنے والد ماجد شیخ العالمین مخدوم شاہ نعمت اللہ ولی قدس سرہ کے مرید و مجاز اور جانشین تھے۔ علم ظاہری کی تحصیل اپنے ماموں زاد بھائی مولانا شاہ احمدی قادری سے کی۔ شعر و سخن میں کسی سے تلمذ ثابت نہیں [4]۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت تپاں کو کلام

---

[1] تذکرہ شعرائے پھلواری۔ ص

[2] حضرت غنی پھلواری کا اردو و فارسی دیوان موجود ہے جو ان کے خاندان والوں کی تحویل میں ہے۔ اس کا علم بعد کو ہوا۔

[3] قسطاس البلاغہ (دیوان حسرت)۔ ص　　　[4] حیات فرد۔ ص

دکھایا تھا، لیکن اس کی حیثیت مشورۂ سخن سے زیادہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ فطری استعداد، طبیعت کی موزونی اور غیر معمولی ذکاوت خود رہنما ہوئی۔ اپنے والد ماجد کے ارشاد کے مطابق کلام حافظ کا مطالعہ شروع کیا[1]، اور بہت جلد اس فن میں کمال پیدا کرلیا۔ فن شاعری میں حضرت فرد قدس سرہ کا اگر استاد ہوسکتا ہے تو وہ لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کی روحانیت ہے۔ حضرت فرد کا کلام دو ضخیم جلدوں میں ہے اور دوبار زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ۱۲۶۸ھ میں پہلی بار دونوں حصے ایک مجلّد میں بڑی تقطیع پر طبع ہوئے۔ اس طباعت میں آپ کے اردو کلام بھی شامل کئے گئے ہیں۔ دوسری بار ۱۳۳۱ھ میں دونوں حصے الگ الگ جلدوں میں شائع ہوئے۔ دوسرے حصے کے آخر میں حکیم شعیب علیہ الرحمہ کی تالیف ''حیات فرد'' شامل ہے۔

حضرت فرد کی شاعری پر تحقیق و ریسرچ کا کام مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔

حضرت فرد کے چھے بھائی تھے۔ سبھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے اشعار اردو میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی۔ ان میں مولانا ابوتراب آشنا، مولانا محمد امام جنوں، مولانا علی سجاد نعمتی، مولانا ابوالحیوٰۃ عجز رحمہم اللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت نعمتی صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ کا اردو اور فارسی دیوان کتب خانہ مجیبیہ میں موجود ہے۔

حضرت فرد کے صاحبزادگان بھی شاعر تھے، بالخصوص تیسرے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر قدس سرہ علاوہ اپنے جملہ کمالات علمیہ و عرفانیہ کے فارسی شاعری میں بھی ہم عصر شعراسے ممتاز اور فائق تھے۔ آپ کا کلام بلاغت نظام تمام تر واردات قلبی پر مبنی ہے۔ صوفیانہ مضامین بڑے بلیغ و لطیف انداز میں ادا فرماتے ہیں۔ آپ کی غزلیں بڑی مرصع ہوتی ہیں۔ دیوان میں نعتیں بکثرت ہیں اور اعلا پایہ کی ہیں۔ آپ کے بعض کلام حقیقت و معرفت کے اسرار و نکات اور طریقت کی ایسی تعلیمات پر مشتمل ہیں کہ عوام کا فہم ان کے مطالب تک نہیں پہنچ سکتا۔ تاریخ ولادت ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) اور وفات ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) ہے۔ آپ کا دیوان، وفات کے بعد ''دیوانِ معجز بیان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نعتیہ کلام کا انتخاب علاحدہ بھی طبع ہوا ہے۔

یہ ''پھلواری'' گلہائے رنگارنگ سے اس قدر معمور ہے کہ مقالہ نگار کو کہنا پڑ رہا ہے

؎ دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

مقالے کی تنگ دامانی چونکہ اختصار کی مقتضی ہے اور تفصیل کا موقع نہیں اس لئے اب ہم صرف شعرا کے ناموں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

ھادیؔ۔ مولانا شاہ محمد ہادیؒ بن مولانا احمدیؒ   ۱۱۹۹ھ - ۱۲۷۱ھ

جوشؔ۔ شاہ مصطفےٰ ابوالقاسم بن حضرت طلعتؔ   ۱۱۹۹ھ - ۱۲۴۹ھ

---

[1] حیات فرد۔ ص

ولی۔	شاہ محمد ولی بن شاہ وجیہ اللہ پھلواروی	۱۲۰۰ھ - ۱۲۲۱ھ
تَوَدُّد۔	مفتی احسان علی بن امان علی ترقی	۱۲۰۲ھ - ۱۲۶۴ھ
حسن۔	مولانا شاہ علی حسن بن حضرت فرد	۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) - ۱۲۳۳ھ (۱۸۲۰ء)
مخدوم۔	قاضی مخدوم عالم بن سلطان عالم راسخ	۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) - ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء)
وصی [1]۔	مولانا شاہ وصی احمد بن شاہ مصطفےٰ ابوالقاسم	۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) - ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء)
رونق۔	سید آل علی بن سید باقر	۱۲۳۳ھ - ۱۳۲۲ھ
قیصر۔	مولانا محمود علی بن مولانا محمد عیسیٰ پھلواروی	۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) - ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء)
شرف۔	مولانا شاہ شرف الدین بن مولانا ہادی	۱۲۵۳ھ (۱۸۱۹ء) - ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء)
نور۔	مولانا شاہ نورالعین بن حضرت فرد قدس سرہ	۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ء) - ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء)
اعظم۔	مولانا علی اعظم بن مولانا افضل علی پھلواروی	۱۲۳۶ھ - ۱۲۹۸ھ
حیرت۔	مولانا احمد کبیر حیرت بن مولانا محمد فرید پھلواروی	۱۲۴۰ھ - ۱۳۲۱ھ [2]
علم۔	مولانا شاہ وحید الحق بن حکیم محمد وجیہ بن حکیم احمد اشرف پھلواروی	۱۲۳۵ھ (۱۸۳۷ء) - ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء)
فائز۔	شاہ نذیر الحق بن شاہ سفیر الحق بن شاہ ظہور الحق پھلواروی	۱۲۵۹ھ - ۱۳۲۴ھ
بدر۔	حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری بن حضرت شرف قدس سرہما	۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) - ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء)
حاذق۔	مولانا شاہ سلیمان قادری چشتی بن حکیم محمد داؤد حکیم آبادی	۱۲۷۶ھ - ۱۳۵۴ھ
عبد۔	حضرت مولانا شاہ عبدالحق بن حضرت نصر قدس سرہما	۱۲۸۳ھ - ۱۳۰۲ھ
محی۔	حضرت مولانا شاہ محی الدین قادری بن حضرت بدر قدس سرہما	۱۲۹۲ھ - ۱۳۶۶ھ
نیر۔	مولانا حکیم محمد شعیب رضوی پھلواروی	م ۱۳۷۵ھ
تمنا۔	شاہ محی الدین بن شاہ نذیر الحق فائز [3]	۱۳۰۵ھ - ۱۳ھ (؟)
قمر۔	حضرت مولانا شاہ قمر الدین بن حضرت بدر قدس سرہما	۱۳۱۲ھ - ۱۳۷۶ھ
ثاقب۔	حضرت مولانا حافظ شہاب الدین بن حضرت بدر قدس سرہما	۱۳۱۶ھ - ۱۴۰۴ھ
صبیح۔	مولانا شاہ صبیح الحق عمادی پھلواروی ثم عظیم آبادی علیہ الرحمۃ	

---

[1] آپ کا مجموعۂ کلام طبع ہو چکا ہے۔

[2] شعرائے پھلواری کے متعلق یہ تفصیلات تذکرہ شعرائے پھلواری سے حاصل کی گئی ہیں۔

[3] تذکرہ شعرائے پھلواری، نیز اعیان وطن (آثارات پھلواری)

شعرائے پھلواری کی مذکورہ فہرست میں شعرا کے ناموں کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے، بہت سے نام بخوف طوالت قلم انداز کر دیے گئے ہیں۔ چودہویں صدی کے چند بزرگ شعرا کا ذکر مذکورہ فہرست میں آچکا ہے۔ سب کے ناموں کو تحریر کرنا اس جگہ مشکل ہے۔ اس کے لئے ایک الگ فہرست مرتب کرنی ہوگی۔ یہ مقالہ اس کا متحمل نہیں ہے۔

پھلواری میں فارسی و اُردو نثر نگاری

پھلواری میں اردو و فارسی نثر نگاری کی تاریخ قدیم نہیں ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں یہاں کسی اردو نثر کا پتا نہیں ملتا۔ اس وقت تک تحریر کی زبان فارسی تھی۔ چودھویں صدی میں اردو نثر نے یہاں بہت تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ چودھویں کی تیسری دہائی میں مولانا حکیم شعیب رضوی کی ادارت میں ''معارف'' نامی رسالہ جاری ہوا۔ پھلواری کے اکابر اہل قلم کی اردو تحریریں ''معارف'' میں کثرت سے شایع ہوئیں ''معارف'' کی دو نثر نگار شخصیتوں کا ذکر خاصی اہمیت رکھتا ہے ایک حضرت اقدس مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری قدس سرہ اور دوسرے حضرت مولانا شاہ محمد معشوق کششؔ پھلواروی قدس سرہ۔ ان دونوں بزرگوں کی اردو نثر سادگی، سلاست و شگفتگی کا نمونہ ہیں۔ موخرالذکر بزرگ اردو کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔

پھلواری میں اردو نثر نگاری کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہاں ادبی ذوق اس حد تک پیدا ہو چکا تھا کہ اردو میں کتابیں لکھی گئیں، گرچہ وہ کتابیں اردو ادب سے متعلق نہیں، البتہ زبان اور اس کا ذکر مقصود ہے۔ سب سے پہلے نثر نگار علامہ ظہور الحق عمادی پھلواروی تھے۔ ان کی ولادت ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں اور وفات ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۲ء) میں ہوئی۔ اردو میں ان کے کئی رسالے ہیں ان کے نام یہ ہیں: ''رسالہ کسب النبی''، ''رسالہ نماز''، ''فضائلِ رمضان''، ''فیض عام کبیر''۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہار کے اردو نثر نگاروں میں علامہ شاہ ظہور الحق سر فہرست ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے ''بہار میں اردو......'' میں حضرت خواجہ عمادالدین قلندر کے بعد بحیثیت نثر نگار حضرت ظہور کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ظہور ہی کو بہار کا پہلا اردو نثر نگار تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں، البتہ حضرت خواجہ عمادالدین، قلندر قدس سرہ کی نثر نگاری پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷۳ پر لکھتے ہیں:

> '' 'سیدھارستہ' دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہ حضرت عمادالدین قلندر کی تصنیف ہے۔ جناب تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کو رسالۂ مذکور خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے کتب خانے سے ملا تھا۔ رسالہ از ابتدا تا انتہا خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس رسالہ کا ایک نسخہ حضرت مصنف کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ مگر باوجود تلاش

جناب تمنا یا اور کسی کو اب تک نہیں مل سکا۔ ''سیدھا رستہ'' کا دریافت شدہ نسخہ غالباً جناب تمنا کے ساتھ ڈھاکہ جا چکا۔ آپ وہاں ہجرت فرما گئے ہیں''۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے جس طرح حضرت خواجہ کی طرف منسوب اردو اشعار کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا۔ رسالۂ مذکورہ کے متعلق بھی تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور ''تقلید محض'' پر اکتفا کیا۔ تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ تمنا عمادی کی روایت پر ایمان لا کر بیٹھ نہ رہتے۔ خانوادے کے دوسرے مستند لوگوں سے دریافت کرتے۔ اقتباس مذکور میں ''کہا جاتا ہے'' اور ''کہیں نہ کہیں موجود ہے'' کے جملے ان کے دعوے کے ضعف پر دلالت کرتے ہیں۔ لطف یہ کہ دریافت شدہ نسخہ بھی اس وقت موجود نہیں۔ اختر اورینوی صاحب نے اس کو دیکھا تھا یا نہیں؟ کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

قاضی عبدالودود نے اس رسالہ کو ''معیار'' میں ایک مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا جس میں انہوں نے اپنے شکوک ظاہر کئے تھے۔ قاضی صاحب نے ''مقالات قاضی عبدالودود'' (مرتبہ کلیم الدین احمد) میں ڈاکٹر اختر اورینوی پر سخت تنقید کی ہے۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق میں یہ رسالہ حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قدس سرہ کا لکھا ہوا ہرگز نہیں ہے۔ ان کے اعتراضات کی بنیاد باوزن دلائل پر ہے۔ پوری بحث نقل کرنا مشکل ہے۔ تاہم سب سے اہم اور بنیادی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر رسالہ ''سیدھا رستہ'' کا سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ مان لیا جائے جیسا کہ رسالہ پر درج ہے، تو حضرت خواجہ عماد الدین قلندر کی عمر اس وقت سولہ برس ٹھہرتی ہے کیوں کہ آپ کی تاریخ ولادت ۱۰۶۵ھ ہے۔ یہ بالکل قرین قیاس نہیں ہے کہ گیارھویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لئے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی [۱]۔ مولانا تمنا عمادی نے اس اعتراض پر کہا تھا کہ سال ولادت غلط مشہور ہو گیا ہے میں اس کا ثبوت دوں گا۔ قاضی صاحب کے بقول ''انہوں نے فراہم نہیں کیا''۔ [۲]

دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ رسالۂ مذکور تاہل کی زندگی اختیار کرنے کے بعد لکھا گیا ہے تو کیا سولہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی تھی؟ دوسری صورت میں سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ غلط ٹھہرتا ہے۔ اس اعتراض میں ڈاکٹر اختر اورینوی کا یہ دلچسپ جملہ ملاحظہ فرمایئے ''ہو سکتا ہے دو شادیاں ہوئی ہوں'' [۳]۔ کیا تاریخی حقائق اس طرح کے مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں؟ حضرت کی صرف ایک شادی ہوئی اور اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ عمادیہ دونوں جگہ کے لوگ ایک شادی ہونے پر متفق ہیں۔ سنہ ولادت میں کوئی اختلاف نہیں، ۱۰۶۵ھ محقق ہے۔ دیکھئے ''آثارات پھلواری''۔ قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں مولانا حکیم محمد شعیب رضوی علیہ الرحمۃ سے جو گفتگو کی وہ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ کی جائے:

۱۔ مقالات قاضی عبدالودود، مرتبہ کلیم الدین احمد۔ ص ۱۶ ۔ ۲۔ مقالات قاضی عبدالودود...... ص ۱۷

۳۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص ۲۷۶

''وہ عام طور پر پھلواری کے معاملات کے متعلق حکیم محمد شعیب مرحوم کے قول کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس رسالے کے بارے میں ان سے استفسار کیوں نہ کیا اور کیا تھا تو ان کی رائے کیوں نہ نقل کی؟ میں نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا تھا، انہوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ حضرت عماد الدین قلندر کی اردو نثر و نظم سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ''سید ھا رستہ'' کسی ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے جس کے عقائد ہمارے عقائد سے مختلف اور اس رسالہ کی مدد سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہے اور ہم بھٹک رہے ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کسی کتاب میں انھوں نے ان کی نظم و نثر کا ذکر نہیں کیا۔ [1]

''سیدھا رستہ'' میں جن معتقدات کا ذکر ہے اس کو پڑھ لیجئے تو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

حضرت مولانا شاہ ظہور الحق عمادی کے بعد پھلواری کے اردو نثر نگاروں میں دوسرا نام ہمیں قاضی مخدوم عالم راستی کا ملتا ہے۔ قاضی صاحب خانوادۂ مخدوم راستی گیلانی قدس سرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) میں اور وفات ۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں ہوئی۔ قاضی مخدوم عالم غالبؔ کے ہمعصر و ہم عمر تھے۔ اردو میں ان کی کتاب ''عمدۃ المجالس'' ہے۔ یہ نثر میں شہادت نامہ ہے جو انہوں نے اپنے ایک عزیز کی فرمائش پر مرثیے کی مجلسوں کے لئے لکھی تھی۔ قاضی صاحب کی نثر بہت شستہ اور سلیس ہوتی ہے۔ یہ کتاب عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی اب نایاب ہے۔

اسی عہد کے ایک اور نثر نگار مولوی شاہ محی الدین بن شاہ محمد علی پھلواروی ہیں جو امیر عطاء اللہی خانوادے کے فرد تھے۔ ان کا قیام زیادہ تر حیدر آباد میں رہا۔ حضرت تیرؔ پھلواروی نے آثارات پھلواری میں ان کی دو نثری کتابوں کا ذکر کیا ہے اور کتاب کے کچھ اقتباس بھی دیے ہیں۔ مولوی شاہ محی الدین نے علامہ ابن حجر مکی کی ''صواعق محرقہ'' کا اردو ترجمہ کیا تھا جو شرف الصحابہ سے موسوم ہے۔ دوسری کتاب قصہ حضرت تمیم انصاری (مدفون کولم مدراس) ہے۔ جو سلیس اردو زبان میں ہے۔

بعد کے دور میں جب ہماری زبان ترقی کی طرف گامزن ہوئی تو پھلواری میں بھی اردو ہی تحریر کی زبان بن گئی۔ تصنیف و تالیف مراسلت و مکاتبت، مضمون نگاری سب اردو ہی میں ہونے لگی۔ قاضی مخدوم عالم کی ''عمدۃ المجالس'' کے بعد حکیم شعیب تیرؔ [2] کی ''حیات فرد'' حضرت مولانا شاہ بدر الدین قادری کے مکتوبات ''لمعات بدریہ'' شاہ سلیمان پھلواروی کے مکتوبات ''شمس المعارف'' اور خانقاہ مجیبیہ کا ماہنامہ، ''معارف'' بیسویں صدی کی پہلی دوسری تیسری

---

[1] مقالات قاضی عبدالودود۔ ص ۲۰

[2] تیرؔ پھلواروی کی اردو میں بہت سی تصنیفات ہیں لیکن ہم نے ان کی پہلی تصنیف کا ذکر کیا ہے اور یہ مطبوعہ بھی ہے۔

دھائیوں تک کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس کے بعد نثری تاریخ تو سامنے کی بات ہے اس کا ذکر ضروری بھی نہیں ہے اور باعث تطویل بھی ہے۔ فارسی کا ذوق پھلواری میں عام رہا ہے۔ اس لئے بزرگان پھلواری کی زیادہ تر تصنیفات فارسی زبان میں ہیں۔

خانوادۂ امیر عطاء اللہ میں سب سے پہلی فارسی تصنیف مُلّا وجیہ الحق محدث پھلواروی کی کتاب ''نزلۃ السالکین'' ہے۔ یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے۔ بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی۔ حضرت مُلّا وجیہ الحق کا سنہ وفات ۱۱۵۰ھ ہے۔

تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں حضرت تاج العارفین کے پوتے حضرت شاہ نور الحق طپاں نے ''انوار الطریقہ'' لکھی۔ اس کتاب میں سلسلۂ مجیبیہ کے اوراد و اشغال جمع کئے گئے ہیں۔ ضمناً امیر عطاء اللہ جعفری زینبی کی پھلواری آمد، ان کا اور ان کے خانوادے کے بعض اکابر کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مصنف نے تمام باتیں اپنے جدّ و مرشد مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری کی روایت سے لکھی ہیں۔ بزرگانِ پھلواری کے حالات پہلی بار اسی کتاب کے ذریعہ قیدِ تحریر میں آئے۔ یہ مستند تذکرہ ہے۔

تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں ''تذکرۃ الکرام'' کے نام سے فارسی زبان میں ایک نہایت وقیع اور سیر حاصل تذکرہ مرتب ہوا۔ اس کتاب کے مصنف بھی حضرت تاج العارفین کے پوتے حضرت شاہ ابوالحیوٰۃ قادری بن مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری ہیں۔ پھلواری شریف کے صوفیا اور مشائخ کے حالات میں یہ مفصل اور مبسوط تذکرہ ہے۔ مصنف کی وفات کے کئی برسوں کے بعد ــــــ میں چھپا تھا۔ ہندوستان کی مشہور لائبریریوں میں اس کے مطبوعہ اور قلمی نسخے موجود ہیں۔ کتاب کا نصف حصہ مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری اور ان کے استاد و مرشد حضرت مولانا رسول نما بنارسی قدس سرہما کے حالاتِ زندگی اور ان کے خلفا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ آخر کے چند صفحات میں اکابر قصبہ پھلواری مخدوم منہاج الدین راستی، شاہ اسمٰعیل قمیصی، مخدوم جنید ثانی اولیا اور حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قادری قدس اسرارھم کے حالات و کرامات ہیں۔ مصنف کو اصلاً اپنے والد و مرشد حضرت شیخ العارفین مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری کا مبسوط تذکرہ لکھنا تھا اس لئے دوسرے اکابر کا تذکرہ ضمناً کیا ہے۔ کتاب کا زیادہ حصہ شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ کے احوال، کشف و کرامات اور اخلاق و عادات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

''تذکرۃ الکرام'' ایک اہم اور مستند ماخذ ہے۔ مصنف نے مختلف بزرگوں سے سن کر واقعات جمع کئے ہیں۔ بیشتر واقعات انہوں نے اپنے والد ماجد کی روایت سے لکھے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت شاہ ابوالحیوٰۃ قدس سرہ نے ''تذکرۃ الکرام'' لکھ کر پھلواری کی تاریخ کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا اور بزرگان پھلواری کے حالات و واقعات کو جو ایک عرصے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے، سفینے میں منتقل کر کے آنے والی نسل پر بڑا احسان کیا، ورنہ خانوادۂ امیر عطاء اللہ کی

تاریخ بھی ماضی کے گرد وغبار میں گم ہو جاتی۔ اس کتاب سے پھلواری کے علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی و اقتصادی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اسی عہد میں شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ قادری کے مرید شیخ طالب علی پھلواروی نے بھی حضرت موصوف کے مختصر حالات لکھے اور ملفوظات جمع کئے۔ یہ کتاب قلمی ہے اور مرتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

چودھویں صدی ہجری کی ابتدا میں حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری قدس سرہ نے نسب نامہ ترتیب دیا۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور تھوڑے تھوڑے تعارفی نوٹ کے ساتھ ہے۔

تاریخ و تذکرے کی ان اہم کتابوں کے علاوہ دینی موضوعات پر مشتمل فارسی نثر کا بہت بڑا ذخیرہ اب تک محفوظ ہے۔ فقہی موضوعات پر فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہر عہد میں جاری رہا ہے۔ ذیل میں ہم ان تصنیفات کی ایک اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں۔ اس سے تصنیفات کا احاطہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ فارسی نثر کی ترویج و اشاعت کی ایک جھلک دکھانی مقصود ہے۔

نعمت شامل شرح ماۃ عامل۔ زادالآخرۃ۔ قرۃ عین العاشقین فی حلیۃ سید المرسلین۔ تحقیق الایمان۔ شرح کلمۂ طیبہ۔ فوائد احمدی۔ ذکر الصلوٰۃ (حضرت ملا وحید الحق ابدال پھلواروی۔ م ۱۲۰۰ھ)۔ تفسیر بسم اللہ۔ رسالہ ما اُہلّ بہ لغیر اللہ۔ رسالہ مناسخہ۔ رسالہ حاشیہ امور عامہ بر شرح مواقف (حضرت مولانا شاہ احمدی قادری۔ م ۱۲ھ)۔ رسالہ حرمت متعہ۔ رسالہ تقبیل اظفار۔ رسالہ در جواز سماع۔ رسالہ امامت ائمہ اثنا عشر در رد عقائد اہل تشیع۔ رسالہ تمثال نعلین شریف۔ رسالہ در فن عروض (حضرت مولانا ابوالحسن فردؔ پھلواروی۔ م ۱۲۶۵ھ)۔ تعلیم الطہارت (حضرت مولانا شاہ ابوتراب آشنا پھلواروی ۱۲ھ)۔ نعمت عظمٰی۔ شواہد الجمعہ۔ اُسوۂ حسنہ۔ رسالہ حلت بقرۂ منذورہ۔ رسالہ درود خواندن در قعدۂ اولی۔ فضیلت سلام بقول السلام علیکم۔ رسالہ حلاوت قلوب در فضیلت شب برات (حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصرؔ پھلواروی۔ م ۱۲۹۵ھ)۔ معیار المذہب (حضرت مولانا علی اعظم پھلواروی۔ م ۱۲ھ)۔

تمنا مظفر پوری

آ گیا بزمِ عزا میں مدح خوانِ کربلا

(قمر سہسرامی ٹکاروی کا تذکرہ)

حکیم مظاہر قیوم صاحب قمر سہسرام کے رہنے والے تھے لیکن طبابت کے سلسلے میں مستقل طور پر ٹکاری (گیا) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تخلص قمر کے ساتھ ٹکاروی لکھ کر اپنے کو باضابطہ ٹکاری سے منسوب کرتے تھے۔

قمر صاحب ۱۳۰۲ھ میں سہسرام میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھے طبیب ہونے کے ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ شعر و شاعری کا پاک و صاف ذوق پایا تھا۔ اردو، فارسی اور عربی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی علمی قابلیت کا اندازہ ان کے کلام اور فن طب پر لکھی گئی متعدد کتابوں کے مطالعے سے ہوتا ہے جو فارسی میں ہیں۔ افسوس کہ ان کی علمی و ادبی دستاویزات اب تک منتشر اور غیر مطبوعہ ان کے صاحبزادے مولوی محمد محمود عالم صاحب سحر ٹکاروی کے پاس پڑی ہیں (پتا نہیں سحر صاحب ٹکاروی کے انتقال کے بعد کس حال میں ہیں)۔

قمر صاحب نے شاعری شروع کی تو اپنا کلام حضرت شمشاد لکھنوی کو دکھلایا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں علامہ شفق عماد پوری کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور اس طرح اپنا اور استادِ محترم کا نام روشن کرتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں انتقال کر گئے۔

قمر صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی تخلیقات پر کسی اور مضمون میں تفصیل سے لکھوں گا۔ آج کی صحبت میں صرف ان کی زیرِ نظر بیاض سے جو ان کے صاحبزادے مولوی سحر ٹکاروی کی نوازش سے مجھ تک پہنچی ہے، قمر صاحب کی شہدائے کربلا کے ساتھ عقیدت کا ذکر کیا جاتا ہے مگر یہ بات واضح رہے کہ قمر صاحب عقیدتاً سنی المذہب تھے۔

قمر صاحب شہدائے کربلا اور سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ اُن عربی اشعار کو جو امام حسینؑ سے منسوب کئے جاتے ہیں، اپنی مختصر سی بیاض میں نوٹ کر رکھا تھا۔ قمر صاحب نے اپنی عقیدت اور جذبات کا اظہار اردو اور فارسی دونوں زبان میں کیا ہے۔ ان کے بہت سے قطعات اردو اور فارسی میں ملتے ہیں۔ دو قطعات ملاحظہ ہوں ۔

یا حسین ابن علی افتادہَ در دامِ عشق

بر ود بر گردنِ دل روز و شب صمصامِ عشق

از شرابِ ارغوانِ دہر بیزار آمدم

تا ز خونِ دل پُر است از عشق تو این جامِ عشق

اے آن کہ دلم در ہجرت چون است

چشم بہ فراق، عبرتِ جیحون است

یا سبطِ رسول راکبِ دوشِ رسول

اک بار پرس این کہ عالم چون است

اردو میں ان کے بہت سارے رباعیات وقطعات ہیں جن میں چند پیش خدمت ہیں۔

حیدر کی رسول ذوالمنن کی الفت زہرا کی حسین کی حسن کی الفت

اللہ نے پنج روزہ دنیا میں قمرؔ ہے شکر کہ دی ہے پنجتن کی الفت

ایک رباعی میں پنجتن پاک کے سایہ کی آرزو کی گئی ہے۔

حیدر کا رسول ذوالمنن کا سایہ زہرا کا حسین کا حسن کا سایہ

کچھ ڈر نہیں تابش قیامت سے قمرؔ سر پر مرے ہوگا پنجتن کا سایہ

محرم کے بارے میں ان کا یہ قطعہ قابل مطالعہ ہے:

غنچے جو ہیں خاموش تو گل چاک بداماں

جس سمت نظر ڈالئے اک غم کا ہے ساماں

پھرتی ہے وہاں خاک بسر باد بہاری

ماتم کدہ بنتا ہے محرم میں گلستاں

قمرؔ صاحب ماہ محرم میں تاریخ وار مرثیئے اور سلام کہا کرتے تھے اور نواب ٹکاروی کے یہاں مجلس میں پڑھا کرتے تھے۔ انیس و دبیر اور مونس کے دواوین سے مصرعہ طرح لے کر ان کی زمین میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ میر انیس کے ایک مشہور سلام کا مصرعہ ہے:

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

قمرؔ صاحب نے بھی اس زمین میں بارہ اشعار کہے تھے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

سلام ان شہدائے ستم گزینوں کو جو کربلا کی مقدس کیا زمینوں کو

خدا کی راہ میں مرنے سے کچھ کیا نہ دریغ سنان و نیزوں سے چھلنی کرایا سینوں کو

ستایا شامیوں نے آل مصطفٰے کو بہت نہ آیا رحم ذرا بھی ان کمینوں کو

قمرؔ، انیسؔ کا نازک ہے مصرعہ مقطع ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

قمرؔ صاحب نے اپنے سلام میں مختلف طریقے سے شہدائے کربلا کے لئے عقیدت مندانہ جذبے کا اظہار کیا

ہے۔ بارہ اشعار کے ایک سلام سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

کھلی زباں جو مری عرض مدعا کے لیے　　　قدم قبول نے مرضیٔ حق کے آ کے لیے

قضا ادا کے لئے ہے ادا قضا کے لیے　　　جفا وفا کے لئے ہے وفا جفا کے لیے

غم امام جو لیتا ہے چٹکیاں ہردم　　　ہے ایک لطف دل درد آشنا کے لیے

دوسرے سلام کے چند اشعار میں قمر صاحب کے جذبات کی شدت ملاحظہ ہو۔

غم جدائی نے کر ڈالا ہے نڈھال مجھے　　　علی کا صدقہ ملے شربت وصال مجھے

غم حسین میں ہے زندگی وبال مجھے　　　بلاوے روضۂ حضرت پہ ذوالجلال مجھے

سنبھال لوں گا میں ہر وار یا علی کہہ کر　　　زمانہ لاکھ ہو دشمن نہیں خیال مجھے

فلک نہ دیکھ سکا ایک شب کا اوج قمرؔ

گھٹا گھٹا کے کیا بدر سے ہلال مجھے

ایک اور سلام ملاحظہ ہو جس میں قمر صاحب نے دل پرسوز کے واسطے ہزار غم سمو کر رکھ دیا ہے۔ پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسو اس طرح رواں ہو جاتے ہیں کہ روکے نہیں رکتے۔

دل میں داغ الفت شبیر و شبر لے چلے

باغ مصطفوی سے ہم دو پھول چن کر لے چلے

کوئی اک دل پر اٹھا سکتا نہیں ہے ایک داغ

اور حسین ابن علی دل میں بہتر لے چلے

جب اٹھایا لاشہ عباس کو بولے امام

بھائی اس ٹوٹی کمر پر بوجھ کیوں کر لے چلے

ہے امام دیں کے یہ صبر و رضا کی انتہا

لاشہ غربت میں برادر کا برادر لے چلے

اک قیامت پر قیامت تھی بپا اس دم قمرؔ

قید میں اہل حرم کو جب ستمگر لے چلے

ماہ محرم کے آتے ہی قمر صاحب مضطرب ہو جاتے تھے۔ ان کے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی اور وہ غم حسین میں نوحہ خوانی کرنے لگتے۔ محرم آنے پر ان کے دل کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

آ گیا ماہ محرم انقلاب آنے کو ہے　　　صبر جانے کو ہے دل سے اضطراب آنے کو ہے

مر گیا مداح حیدر جب تو بولی یوں لحد
میرے گھر مہماں غلام بوتراب آنے کو ہے

دھوپ میں عریاں شہید کربلا کو دیکھ کر
لے کے چادر اپنی خود ظل سحاب آنے کو ہے

کیا سوال قبر کا ڈر ہو قمرؔ لب پر مرے
یا علی مشکل کشا بہر جواب آنے کو ہے

قمرؔ صاحب کہتے ہیں کہ سید الشہدا اور پنجتن پاک کی کوئی کیا مدح کر سکتا ہے۔ مدح کرنے والے کے لیے حشر کے روز جنت سے رضوان دوڑ کر خود خیر مقدم کو آئے گا۔

غیر حق کوئی نہیں جب قدر دان پنجتن
مدح کیا لکھے بھلا پھر مدح خوان پنجتن

خلد سے دوڑے گا رضواں خیر مقدم کیلئے
حشر میں پہنچیں گے جس دم میہمان پنجتن

بچ گا نہ حق تعالی سے وہی وقف دعا
امت عاصی کی خاطر تھی زبان پنجتن

امت عاصی کی بخشش اے قمرؔ دشوار تھی
حق تعالیٰ گر نہ لیتا امتحان پنجتن

اس مختصر اور تقریباً نصف رف (Raugh) بیاض میں بہت سے سلام کے آخر میں تاریخ، ماہ اور سال درج ہیں کہ کب اور کس موقع پر کہا گیا۔ کچھ سلام انیس اور مونس کی طرح میں بھی ہیں۔ آخر میں ایک سلام پیش خدمت ہے۔

سلام

باعث تخلیقِ عامِ وبہ امکاں کو سلام
مہبطِ جبریل، منزل گاہ قرآں کو سلام

مجرئی مظلوم ابن شیر مرداں کو سلام
یعنی سبطِ مصطفیٰ شاہِ شہیداں کو سلام

ہر پرندے سایہ افگن بھیجتے تھے بار بار
کشتگانِ کربلا کے جسمِ عریاں کو سلام

جانے والا ہو ادھر جاتا تو پہنچا نا مرا
اس شہید بے نوائے ساز و ساماں کو سلام

صدد رود اے عابد شب زندہ دار کربلا
روز عاشورہ وہ با حال پریشاں کو سلام

درگزر کرنا خطا کاروں سے جس کا کام تھا
اس اسیر بے خطا شام غریباں کو سلام

غیرت بلقیس جس کی شہر بانو زوج تھیں
وارثِ تختِ امامت اُس سلیماں کو سلام

ہے مبارک ماتم حسنین میں جامہ دری
چاکِ داماں کو مرا چاکِ گریباں کو سلام

جس نے برج صبر کے سارے منازل طے کئے
اس سریع السیر رشک ماہ تاباں کو سلام

ساکنان حلقۂ بیت الحرم ہیں خوش نصیب
دور ہی سے کرتے ہیں فردوس رضواں کو سلام

Jamil Compound. Samanpura
P.O B.V. College. Patna - 800014

ڈاکٹر ظفر کمالی

احوالِ پاشا

(احمد جمال پاشا کی سوانح)

سوانحی حالات: احمد جمال پاشا نے اپنی تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ یکم جون ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے [۱] لیکن دوسری جگہ اس کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''یہ دراصل سرکاری تاریخ پیدائش ہے میں اس سے چار سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ پیدا ہو چکا تھا''۔ [۲]

لیکن ان دونوں تاریخوں میں کوئی صحیح نہیں۔ راقمِ حروف کے پاس جمال صاحب کی بہن ثریا خاتون کے دو خطوط موجود ہیں جو ۱۹۳۱ء میں الہ آباد سے انھوں نے اپنی نانی کو بریلی کے پتے پر لکھے تھے۔ ان دونوں خطوط میں جمال صاحب کا ذکر ہے۔ پہلا خط گیارہ جون ۱۹۳۱ء کا لکھا ہوا ہے جس کا ایک جملہ یوں ہے:

''...... جمال کا سلام...... ثر تاج (کذا) کو لیلی، سروت (کذا) جمال سلام کہتے ہیں''۔

دوسرا خط ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء کا تحریر کردہ ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ موصوفہ لکھتی ہیں:

''ابا میاں...... بی اما (ں)، سروت (ثروت) میاں، نسرت (نصرت) میاں سب...... زکام ہرارت (حرارت میں) مبتالا (مبتلا) ہیں۔ جمال کا اسلی (اصلی) نام نسرت (نصرت) پاشا ہے''۔

اس سلسلے میں سب سے اہم خط جمال صاحب کے سب سے بڑے بھائی محمد عزت پاشا کا ہے۔ پانچ مئی ۱۹۳۱ء کا لکھا ہوا یہ خط بھی ان کی نانی کے نام ہے۔ لکھتے ہیں:

''...... جمال پاشا کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ زانو کی پھڑیاں صاف ہوگئی ہیں صرف پنڈلی کی پھڑیا پر کھرنٹ باقی ہے...... جمال سب کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں''۔ [۳]

جمال صاحب اور ان کی بہن زبیدہ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں کی پیٹھ کمر کے پاس سے جڑی ہوئی تھی جسے ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسپتال میں نشتر دے کر علاحدہ کیا تھا۔ ان دونوں بھائی بہنوں کی عادتیں یکساں تھیں۔ زبیدہ کی پانو کی انگلی میں چوہے نے کاٹ لیا اس کو طاعون ہوا اور وہ مرگئی۔ اس کے اثر سے جمال صاحب کو لال بخار ہوگیا اور پورے جسم

میں بتیس پھوڑے نکل آئے۔ اس وقت ان کی عمر فقط چھے ماہ تھی۔ ڈیڑھ برسوں تک پھوڑوں کے پکنے، سڑنے، مواد اور خون آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے ان کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے دونوں پانو کاٹ دینے کا مشورہ دیا مگر ان کے والد تیار نہیں ہوئے اور ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھایا جس نے پانو کاٹنے کے بجائے ہڈیاں کھرچ کر صاف کرنے کا فیصلہ کیا اور یہی ہوا۔ دو سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پھوڑے خشک ہو کر بھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ بالکل تندرست ہو گئے اور گھٹنوں گھٹنوں چلنے لگے۔ ان میں اتنی تیزی اور پھرتی آگئی کہ ایک دن مسالا پیسنے کی سل اپنے اوپر گرالی جس کے نتیجے میں بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کچل کر قیمہ ہو گئی جس کا نشان عمر بھر باقی رہا۔ ؎[۴]

عزت پاشا کے مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ پانچ مئی ۱۹۳۱ء تک جمال صاحب کے زانو کی پھڑیاں صاف ہو چکی تھیں صرف پنڈلی کی پھڑیا پر کھرنٹ باقی تھی۔ یہ تسلیم شدہ ہے کہ وہ چھے مہینے کی عمر میں زخموں میں مبتلا ہوئے اور ڈیڑھ برسوں تک زخموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر مذکورہ تاریخ تک جمال صاحب کی عمر دو برس تسلیم کرتے ہوئے ۳۱ء میں سے دو حذف کر لیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی۔ مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کی محدود عمر اور دفتروں میں سرکاری نوکری کے پیش نظر اصل عمر پانچ چھے سال کم کر کے لکھائی گئی ہوگی۔ جمال صاحب کی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے ان کے والدین نے دور اندیشی کے تحت ایسا کیا ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پاشا صاحب کی ایک تحریر سے بھی ان کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''یادوں کی دھندلی وادی میں جن پر ماضی کا کہرہ بڑھتا ہی جا رہا ہے جب جھانکتا ہوں تو ایک دل ہلا دینے والا منظر دکھائی دیتا ہے۔ ایمان والو تم بھی سن لو۔ ایک باغ میں خاں صاحب ؎[۵] مجھے بار بار لاحول پڑھوا رہے ہیں۔ جیسا کہ گھر میں ہونے والی روزانہ باتوں سے مجھے یاد ہو گیا بھائی صاحب مرحوم میرے بڑے اور چھوٹے بھائی کو اپنی دونوں بغلوں میں دبائے، سینے پر قرآن شریف لٹکائے، زبان پر کلمۂ طیب، ان کے چاروں طرف گھیرا بنائے والدین، بھائی، بہن اور ملازمین کھڑے ہوئے قرآن شریف بلند کئے اللہ کے غضب سے پناہ مانگ رہے تھے اور تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف تھے۔ لوگ گھروں سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ زمین پھٹتی ہے۔ برابر کے مکان کا سامنا (کذا) والا حصہ دھنس جاتا ہے۔ پیچھے کے مکان کے دھڑام دھڑام گرنے کے ساتھ خوفناک انسانی چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ برابر کا گھر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف گھر والوں کے اور ہمارے پوری پوری اینٹیں اور بڑے بڑے پتھر اولوں کی طرح گر رہے ہیں۔ آخر زلزلہ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر کے سامنے سڑک پر حواس باختہ انسانی سیلاب ہے۔ ۱۹۳۴ء کے اس قیامت خیز زلزلے میں اطراف کے مکانات کے اینٹ

پتھر برس رہے تھے مگر ہمارے بنگلے کی ایک اینٹ بھی نہ کھسکی تھی اور نہ سنگباری سے کوئی سنگسار ہوا تھا''۔ ۶

جمال صاحب اپنی پیدائش یکم جون ۱۹۳۲ء لکھتے ہیں۔ مذکورہ خوفناک ترین زلزلہ ۱۹۳۴ء میں آیا تھا اور یہ یادداشت ۱۹۸۲ء میں قلم بند کی گئی۔ دو برس کی عمر میں پیش آنے والے واقعات کا ۴۸ برس کی عمر تک یاد رہنا کیسے ممکن ہے۔ ۱۹۲۹ء کی پیدائش کے حساب سے دیکھا جائے تو ۳۴ء میں ان کی عمر چھے سال کی تھی اور چھے سال کی عمر کا کوئی خوفناک حادثہ ''یادوں کی دھند اور ماضی کے کہرے'' کے باوجود یاد رہنا ممکن ہے۔ مذکورہ بالا حقائق اور واقعات کی روشنی میں احمد جمال پاشا کا سنہ پیدائش ۱۹۲۹ء ہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ۷

جمال صاحب کے والد نے ان کا نام جمال، والدہ نے نصرت اور بڑے بھائی محمد عزت پاشا نے نزہت رکھا۔ ان کے عقیقے کا نام ''آغا محمد نصرت پاشا'' تھا۔ اسکول میں یہ ''آغا محمد نزہت پاشا'' کے نام سے داخل ہوئے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''میرا کالج کا نام آغا محمد نزہت پاشا تھا۔ جس میں سے آغا تو لڑکوں نے 'آغا مرغی لے کر بھاگا' چڑھا چڑھا کر چھڑوا دیا تھا مگر بقیہ نام میں بھی نزہت عجب سیتارام قسم کا تھا جو میں خود بتاتے ہوئے شرماتا تھا مگر گھر میں جمال کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی جمال پاشا بھی کہہ دیتا تھا''۔ ۸

ادبی میدان میں قدم رکھنے کے بعد پروفیسر سید احتشام حسین کے مشورے سے 'احمد جمال پاشا' کا قلمی نام اختیار کیا اور اسی نام سے خواص و عوام میں مشہور ہوئے۔ وہ جب تین سال کے ہوئے تو ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کی گئی۔ ان کے مطابق:

''ہماری بسم اللہ مولوی زکریا کے ہاتھوں الہ آباد ہائی کورٹ والے بنگلے میں ہوئی تھی۔ اس وقت ہم بالکل ایں قدر، مشکل سے کوئی تین سال کے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ میں بڑا خوفناک بید لرزتا رہتا۔ ادھر کتاب سے نظر ہٹی یا آواز بند ہوئی اور میز پر مارا سڑاک سے بید۔ مارے ڈر کے ہم اپنی چھوٹی سی کرسی سے چمٹ جاتے مگر انھوں نے اس کو ہم پر کبھی استعمال نہیں کیا لیکن گھور دیتے تو ہماری گھگھی بند ہو جاتی۔ وہ ہمارے اتالیق بھی تھے۔ کھیل کھیل میں تختی پوتنا، پہاڑا یاد کرانا، قلم بنانا، مولوی اسماعیل کی پہلی ریڈر پڑھانا، جب ہم پڑھنے میں لگ جاتے تو وہ ڈتونیں تیار کرتے یا چھیل چھیل کر اورک کھاتے۔ مولوی صاحب گورے چٹے، سینک سلائی، سر سے جوتے تک بالکل سفید تھے۔ کرتا، پاجامہ، شیروانی، رومال سب برف سے بھی سفید۔ وہ برف سے زیادہ ٹھنڈے تھے۔ نہ غصہ کرتے نہ ہنستے''۔ ۹

مولوی زکریا دینی تعلیم کے لئے مقرر تھے جو اس وقت اکبر پور کے ایک مڈل اسکول میں معلّم تھے۔ بچوں کی اعلا تعلیم کے لئے شجاعت حسین نے انگریزی پڑھانے کی خاطر ایک انگریز گورنس مس نیوٹن کو مقرر کیا جو آئرش تھی۔ جب تک وہ انگریزی پڑھانے نہ آجاتی گھر کے سارے بچوں پر مولوی زکریا نگاہ رکھتے۔ انگریزی گورنس کے بارے میں پاشا صاحب نے لکھا ہے کہ مس نیوٹن بہت مرکھنی اور بدمزاج بڑھیا تھی جو آزادی سے پہلے ولایت چلی گئی۔ [10]

مس نیوٹن اور مولوی زکریا دونوں بڑے سخت گیر تھے۔ چوں کہ ان کے والد ہر وقت ہجوم میں گھرے رہتے اس لئے اولاد کی تربیت کے لئے وقت نہ دے سکتے تھے۔ گھر میں روزانہ مہمانوں، ملاقاتیوں اور آئے دن کی دعوت پارٹیوں کی وجہ سے والدہ بھی بے حد مصروف رہتیں۔ والد ڈسپلن کے معاملے میں بے حد سخت تھے۔ اتالیق کے تقرر سے پہلے وعدہ لے لیتے کہ اس سلسلے میں کبھی کوئی لاپرواہی نہ ہوگی۔۔ بعد میں ایک دوسرے اتالیق پنڈت شیو شنکر کا تقرر ہوا۔ کچھ دنوں تک ماسٹر ذکی رسول پوری بھی گھر پر پڑھانے آتے رہے۔

جمال صاحب کی پیدائش کے بعد ان کے والد نے اس زمانے کے مشہور نجومی ڈاکٹر منجیت سنگھ سے ان کا زائچہ تیار کرایا تھا۔ منجیت سنگھ نے، جو شاہی نجومی کے نام سے مشہور تھے، یہ پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا بہت بڑا ڈاکو نکلے گا یا بڑا آدمی ہوگا مگر ہر حالت میں نام پیدا کرے گا۔

پاشا صاحب بچپن میں بے حد شریر تھے۔ مار پیٹ اور اچھل کود میں گھر کو الٹ کر رکھ دیتے۔ پورا گھر ان کی شرارتوں سے عاجز رہتا۔ والد اگر ذرا بھی شکایت سنتے تو فوراً پٹائی کرتے مگر ان کی والدہ سروری خاتون نہایت سیدھی، خاموش اور عبادت گزار قسم کی خاتون تھیں اس لئے سزا دینے سے احتراز کرتیں۔ ان کی شرارتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ یہ اپنے گھر میں چوریاں کرنے لگے۔ اپنے دوستوں کی چیزیں بھی زبردستی چھین لیتے۔ جب اس چھینا جھپٹی اور چوریوں کی اطلاع ان کے والد کو ملتی تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا، انھیں نجومی کی پیشین گوئی یاد آجاتی اور وہ انھیں ضرور سزا دیتے۔ جمال صاحب کے چھوٹے بھائی اقبال پاشا بڑے ڈرامائی انداز میں لکھتے ہیں:

> ''ارے جمال تجھ پر کڑکتی بجلی گرے، خدا تو خاموش کیوں ہے؟ اپنی بے آواز لاٹھی سے اس پر آسمان ڈھادے۔ اے ملک الموت تو کہاں ہے؟ جمال تجھ پر قہر خداوندی نازل ہو، تجھے ہیضہ لے جائے، تجھے طاعون کھالے، تجھے سانپ ڈس لے، پسر نوح تو غرق ہوجائے، تو ڈاکو بنے گا، ننگِ خاندان۔ اے اللہ! اس کو ڈاکو بننے سے پہلے ہی اٹھالے —— اللہ سے احمد جمال پاشا کے لئے ایک باپ کیا کیا مانگ رہا ہے۔ اپنے بیٹے کی موت، کیوں؟ ایک طرف باپ کی محبت دوسری طرف بیٹے کا مستقبل اور خطرہ کہ ایک جج کا بیٹا کہیں خطرناک مجرم نہ بن جائے''۔ [11]

احمد جمال پاشا نے مولوی زکریا سے اردو کا قاعدہ پڑھا۔ اس کے بعد اردو کی باقی تعلیم انھوں نے خود سے حاصل کی۔ ان کی اردو پڑھائی اور پٹائی دونوں کی جانکاری کے لئے اقبال پاشا کا ہی یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اردو کی پہلی کتاب کے بعد جمال بھائی کی اردو اور علم کا سفر فٹ پاتھ سے شروع ہوا۔ فٹ پاتھ پر بکنے والی ڈاکوؤں، چوروں، لٹیروں اور ٹھگوں کے قصوں کی کتابیں چُھپ چُھپ کر پڑھنے لگے۔ اس زمانے میں پیسہ کوڑی بچوں کو نہیں دیا جاتا تھا۔ چنانچہ موصوف نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے گھر ہی پر ہاتھ کی صفائی شروع کردی۔ گویا سنسنی خیز کتابیں بڑھتے اور بطور تجربہ گاہ گھر کو استعمال کرتے۔ علی گڑھ سے لے کر ولایت تک کے تالے ان کے لئے بازیچۂ اطفال تھے حالانکہ خود طفلِ مکتب تھے —— وہ وقت جب آیا جہاں سے میری یادداشت کام کرتی ہے، ہمارے گھر کے برآمدے کے بہت موٹے ستون ہیں جو قدیم مکان کا طرہ ہوتے ہیں۔ جمال بھائی کسی موٹے ستون سے بندھے ہیں اور باری باری ہر بزرگ ان کی لاتوں، گھونسوں اور بیدوں سے کٹائی کرتا تھا۔ زبان سے انگارہ لگایا جاتا تھا۔ ننھی منی ہتھیلیوں پر آگ رکھی جاتی تھی اور ان کی دل خراش چیخیں مجھے دہلاتی تھیں...... اماں بھی خاموشی سے آنسو بہاتی تھیں اور وہ منظر اس سے بھی زیادہ دل خراش ہوتا جب گھر بھر کی کمین گاہوں سے شب خوں مار کر ان کی کتابیں ڈھونڈ لی جاتیں اور ان کتابوں کے ڈھیر کو کوڑے خانے پر جمع کر کے آگ لگائی جاتی۔ اس وقت جمال بھائی کی چیخیں آسمانوں کو لرزاتی تھیں۔ 'ارے خدا کے لئے میری کتابوں کو مت جلایئے، مجھے مار ڈالئے، میری جان لے لیجئے'۔ زمین پر لوٹ جاتے، پچھاڑیں کھاتے، ہچکیاں بندھ جاتیں۔ 'انھیں مت جلایئے...... انھیں مت جلایئے'۔ یہ منظر مہینہ میں دو تین بار ضرور پیش آتا، کیوں کہ پٹائی کے اگلے ہی دن پھر وہی کتابیں حاصل کرنے کی مہم جوئی شروع ہو جاتی''۔ ۱۲

شجاعت حسین ۱۹۴۰ء میں جب الہ آباد کو خیر باد کہہ کر مستقل طور پر لکھنؤ آئے اس وقت احمد جمال پاشا کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ لکھنؤ آنے پر بھی ان کی شرارتوں میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ان میں گہرائی کے ساتھ پختگی آتی گئی۔ ان کی بعض شرارتیں نیکی اور بدی کا امتزاج ہوتی تھیں۔ مثلاً کبھی وہ بڑے بھائی کا جوتا کسی کو دے دیتے تو کبھی والدہ کے کپڑے یا والد کا کمبل کسی فقیر کو چپکے سے بخش دیتے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جب ان چیزوں کی ڈھونڈیا شروع ہوتی تو اس کی تلاش میں خود بھی شریک ہو جاتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھیں فلموں کا چسکا پڑ چکا تھا۔ جمال صاحب نے زندگی کے اس دور کا تذکرہ اپنے دوست اقبال مجید کے خاکے میں یوں کیا ہے:

''ہم رائل سنیما میں مار دھاڑ والی فلمیں دیکھا کرتے تھے اور پارک یا کسی سڑیل ہوٹل میں بیٹھ کر جان کاؤس اور ناڈیا کے اوپر بے لاگ فلمی تبصرے کیا کرتے تھے اور پٹائی کے خوف سے جلدی گھر واپس چلے جاتے تھے۔ گھر میں آزادی بھی اسی مناسب حد تک تھی کہ سگریٹ نوشی کے لئے ہر بار لوٹا اٹھانا پڑتا تھا...... غرض یہ عبوری دور تھا۔ دونوں اپنے اپنے گھر میں حد درجہ اَن پاپولر تھے۔ حیدر مہدی صاحب مجرم لکھنوی صاحب کو عاق کر دینے اور ہمارے والد مرحوم خدا بخشے بہ آواز بلند ہماری وفاتِ حسرت آیات کی دعائیں کیا کرتے''۔ ۱۳

احمد جمال پاشا نے ۱۹۵۰ء میں کوئنس ہائی اسکول سے میٹرک، ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ، ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی-اے اور ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم-اے کیا۔ اسکول سے یونیورسٹی تک یہ کبھی اچھے طالب علم ثابت نہیں ہوئے۔ میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی-اے کے امتحانات میں یہ تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔ صرف ایم-اے میں یہ سکنڈ کلاس لا سکے۔ انٹرمیڈیٹ میں یہ کامرس کے طالب علم تھے اس میں جب فیل ہوئے تو آرٹس میں داخلہ لے لیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد ایم-اے کرنے کی غرض سے احمد جمال پاشا علی گڑھ گئے اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک وہاں مقیم رہے۔ ان کا قیام ایس-ایم-ایسٹ سر سید ہال کے کمرہ نمبر ۱۴۳ میں تھا۔ روم پارٹنر سعید حسن تھے۔ جو جموں اور کشمیر کے سابق وزیر اعلا میر قاسم کے بڑے بھائی تھے اور بڑھاپے میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ ان کی وجہ سے زندگی بہت مزے میں گزری۔ ہم جماعتوں میں محمد مثنّٰی انور جو علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہوئے، عبد القیوم سابق وزیر تعلیم جموں اور کشمیر، گجرات کے احمد بھائی جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے، کیرل کے پی-کے محمد، حبیب احمد صدیقی، نیر اقبال، سیمینار سکریٹری احمد حسین، شیخ سلیم احمد، محمود ایوبی، روشن آرا (بیگم ڈاکٹر محمد حسن)، جمال آرا، ڈاکٹر عبد العلیم کی صاحب زادی شمیمہ علیگ، آل احمد سرور کی صاحب زادی مہ جبیں، شریف احمد، وقار مشرقی اور عبد الجلیل وغیرہ تھے۔

یونیورسٹی کے دیگر احباب میں قاضی عبد الستار، قمر رئیس، انور صدیقی، محمود الٰہی، راہی معصوم رضا، شہریار، سید امین اشرف، تنویر احمد علوی، رضوان حسین، ابن فرید، اقبال مجید، شہاب جعفری، مولانا شبلی کے نواسے احمد اسحاق نعمانی، سرور صاحب کے بڑے صاحب زادے محمد صدیق عثمان غنی، کاظم علی خاں، امیر عارفی، نجم الحسن، بلدیو مرزا، شاہد مہدی، قاضی غلام محمد اور تجمل حسین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

علی گڑھ کا قیام احمد جمال پاشا کے لئے بہت سود مند رہا۔ جید اور باصلاحیت اساتذہ کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھے لکھے اور بہترین احباب کی صحبت میسر آئی۔ قدرداں اور گوہر شناس اساتذہ نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارا اور چمکایا۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۸ء شمارہ ۱ کی مجلس ادارت میں شامل کیے گئے جس کے نگراں رشید احمد صدیقی اور ایڈیٹر انور صدیقی تھے۔

جامعہ اردو کے رسالے ''درس'' جو بعد میں 'ادیب' کے نام سے مشہور ہوا، کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں پیروڈی کانفرنس کی اور اپنی ادارت میں سرسید ہال میگزین ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر نکالا جو اردو کے مزاحیہ ادب میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ پیروڈی کانفرنس میں ''طرز نگارش میری'' نامی پیروڈی پڑھی جس میں رشید صاحب کے اسلوب کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ انعام کے طور پر رشید صاحب نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ دیا تھا۔ علی گڑھ میں ہی سب سے پہلے جھلک بک ڈپو نے ۱۹۵۷ء میں پاشا صاحب کی کتاب ''مجاز کے لطیفے'' شائع کی۔

علی گڑھ سے ایم-اے کرنے کے بعد یہ واپس لکھنؤ چلے آئے اور وہاں کے ادبی نشستوں کی روح و رواں بن گئے جس کے شاندار جلسوں میں بڑے بڑے ادیب شرکت کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے[14] تعلیم مکمل کرنے کے بعد آزاد پیشہ کے طور پر انھوں نے صحافت کو اختیار کیا اور اگست ۱۹۵۹ء میں قمر رئیس کے مشورے سے لکھنؤ سے ماہنامہ ''اودھ پنچ'' کا اجرا کیا۔ یہ اس کا تیسرا دور تھا۔ یہ پرچہ مقبول ہوا۔ بارہویں اور تیرہویں شمارے کے طور پر اس کا کنھیالال کپور نمبر شائع ہوا جس کی اہمیت تاریخی ہے۔ تیرہویں شمارے کے ساتھ ہی بعض وجوہات کے بنا پر یہ رسالہ بند ہوگیا۔ ۱۹۶۱ء میں حیات اللہ انصاری نے جو روزنامہ ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر تھے، انھیں اخبار کے شعبۂ ادارت میں شامل کرلیا جس سے وہ جولائی ۱۹۶۷ء تک وابستہ رہے۔

احمد جمال پاشا دو مرتبہ ازدواجی رشتے میں بندھے۔ پہلی شادی نکہت نامی خاتون سے ہوئی[15] لیکن بدقسمتی سے یہ رشتہ برقرار نہ رہ سکا اور دونوں میں علاحدگی ہوگئی۔ چونکہ یہ علاحدگی ان کی اہلیہ کی جانب سے ہوئی تھی اس لئے اس کا پاشا صاحب کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ وہ کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ شادی اور عورت کے نام سے انھیں چڑھ سی ہوگئی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب طبیعت کسی حد تک اعتدال پر آئی تو ان کی دوسری شادی سیوان کی ایک مقبول اور صاحب ثروت شخصیت حاجی محمد داؤد کی چھوٹی صاحبزادی سرور جہاں عرف بکاؤلی سے ہوئی جو آگے چل کر سرور جمال کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ شادی ۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کو عمل میں آئی۔ سیوان سے واپس جانے کے بعد پاشا صاحب نے اپنی بیگم کے نام سولہ مارچ ۱۹۶۶ء کو جو پہلا مکتوب ارسال کیا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے کئی اہم باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے:

> ''سرو میں چاہتا ہوں جلد از جلد ہماری ایک چھوٹی سی جنت تیار ہو جائے جس میں ہم دونوں اپنے بچوں کے ساتھ کھیلیں۔ بکاؤلی! مجھے تمھاری طرف سے کوئی بے اطمینانی نہیں بلکہ اس سے قبل میں زندگی کے جن ہولناک تجربات سے دوچار ہو چکا تھا اور شادی یا عورت کے نام سے کان پر ہاتھ رکھ کر بھاگتا تھا، جو کچھ مجھ پر گزری تھی اس سے کسی حد تک میرا ذہنی توازن اور نفسیات بگڑ گئی تھیں۔ گو کہ اس دل شکن موضوع پر اب تک تم سے کوئی بات نہ کی۔ اس لحاظ

سے نہیں کہ میں تم سے کچھ چھپانا چاہتا تھا بلکہ اس خیال سے کہ وصل کے پر کیف لمحات کو تکلیف دہ تجربات بتا کر اپنا اور تمھارا موڈ کیوں خراب کروں۔ تمھاری شرافت اور عظمت یہ ہے کہ تم نے اشارتاً بھی نہ پوچھا مگر تم نے جو خلوص، محبت اور پیار دیا اس سے میری زندگی میں پھر بہار آ گئی اور مجھ میں پھر جینے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تم نے ہر قسم کی بے اطمینانی دور کر کے مجھے نئی زندگی دوبارہ دے دی۔ سچ اگر تم مجھے اتنی پسند نہ آتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ تم نے میرے مزاج اور طبیعت کو پہچان لیا اور میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ اب مجھے نہ کوئی Complex ہے اور نہ کوئی الجھن.......... تمھیں پانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میں دنیا میں زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکوں گا''۔ ۱۶

اور واقعہ یہ ہے کہ سرور جمال سے شادی کے بعد ہی وہ ادبی کاموں میں زیادہ انہماک کے ساتھ مشغول ہو سکے۔ پاشا صاحب کے خسر حاجی محمد داؤد کو صرف دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی بلقیس جہاں کی شادی سیوان میں محمد شمیم سے ہوئی تھی۔ حاجی داؤد اور پاشا صاحب کے ہم زلف محمد شمیم کی وفات کے بعد سسرال کی دیکھ بھال کرنے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے دفتر سے طویل رخصت کی اجازت لی اور سیوان چلے آئے۔ سیوان آنے پر انھیں وہاں کے ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج میں اردو لکچرر کی جگہ مل گئی۔ یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو بہار کالج سروس کمیشن نے ان کی تقرری کی تصدیق کر دی لہذا ۵؍ جولائی ۱۹۷۶ء کو دفتر قومی آواز میں نائب مدیر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۳۱؍ جولائی ۱۹۷۶ء کو ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ اس طرح وہ صحافت سے درس و تدریس کے پیشے میں داخل ہوئے۔ یہ پیشہ ان کے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتا تھا اس لیے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ مشغول ہو گئے اور طلبہ و اساتذہ دونوں کے درمیان کافی مقبول ہوئے۔ کالج جوائن کرنے کے بعد روزانہ دو ایک لیکچر اور اس کے بعد ادب کا مطالعہ ان کے روز مرّہ کا معمول بن گیا۔

ادبی زندگی کا آغاز : احمد جمال پاشا کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ پاشا صاحب نے فقط آٹھویں کلاس تک اردو پڑھی تھی اور پھر کامرس میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایک مرتبہ انھیں اپنے بچپن کے دوست اقبال مجید کے ہمراہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہیں پہلی بار انجمن کے سکریٹری مسیح الحسن رضوی نے مختلف ادیبوں سے ان کا تعارف کرایا۔ جلسے کی کاروائی دیکھنے کے بعد پاشا صاحب کے دل میں ادیب بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے ''نمکین داروغہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور دوستوں کو سنایا۔ دوست بھی ایسے تھے جنھوں نے چن چن کر غلطیاں نکالنی شروع کیں۔ یہ مضمون پڑھتے جاتے اور دوست احباب بتاتے جاتے کہ اس کے بعد یہ ہوا پھر یہ ہوا، یہاں تک کہ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر انجام بھی سنا

دیا۔ دراصل ''نمکین داروغہ'' منشی پریم چند کے افسانے ''نمک کا داروغہ'' سے سرقہ کیا گیا تھا۔ یہ بہت شرمندہ ہوئے۔ آخر میں دوستوں نے سمجھایا کہ تم میں لکھنے کی صلاحیت ہے اس لئے خود سے لکھ کر سناؤ۔ دوسرے دن انھوں نے ''بڑے میاں'' کے عنوان سے دوسرا مضمون لکھا جسے احباب نے پسند کیا۔ انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مزاحیہ مضمون ہے۔ پھر انھوں نے ''سگریٹ نوشی'' اور ''من پخند بیابانم'' کے عنوان سے دو مضامین لکھے۔ ان میں دوسرا ''راہی'' جالندھر میں شائع ہوا جس کا تفصیلی ذکر پاشا صاحب نے بڑے پرلطف طریقہ سے اپنے مضمون'' ..... جب میرا پہلا مضمون چھپا'' میں کیا ہے۔

اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں احمد جمال پاشا کو ظرافت کے فن سے آشنا کرنے میں تین شخصیتوں کا اہم حصہ رہا جن میں دو ان کے اساتذہ پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن تھے۔ تیسری شخصیت پاشا صاحب کے دوست عابد سہیل کی تھی۔ عابد سہیل نے چائے اور سگار کی شرط پر انھیں طنز و مزاح کے معنی بتائے ۱۷۔ پروفیسر احتشام حسین نے حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ انھیں مختلف ظرافت نگاروں کی تخلیقات پڑھوائیں اور مختلف رسائل کے مطالعے کی تاکید کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ'' لکھتے وقت خوب سوچو کہ اور کون ایسا نکتہ لا سکتے ہو کہ پڑھنے والا پھڑک اٹھے بالکل نئی بات اور انتہائی مہذب طریقے سے کہو'' ۱۸۔ اور ڈاکٹر محمد حسن :

> ''دو مہینہ تک مسلسل ...... مضمون سننے کے بعد کہتے کہ بات بنی نہیں یا ہنسی نہیں آئی اسے جلا دیجئے اور ہمیں مضمون نذر آتش کرنا پڑتا۔ جن کتابوں کو پڑھتا ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو بتاتا۔ شام کو ڈاکٹر صاحب ٹہلنے نکلتے۔ مزاح، مزاح نگاری، کردار نگاری وغیرہ، کہاں اور کون سی کتابیں اس سلسلے میں پڑھی جائیں اس سب پر بحث کرتے اور مجھے ایک ایک بات سمجھاتے ہوئے اپنے گھر سے جوش میں عالم باغ تک نکل جاتے۔ وہاں سے کربلا، چوک، رکاب گنج ہوتے ہوئے امین آباد تک آتے۔ اکثر یہ چکر آٹھ نو میل کا ہو جاتا۔ ہم سے زبردست محنت کرانے اور ہم پر اس قدر ریاض کرنے کا یہ اثر ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے محض اپنی محنت اور کوششوں سے ہم کو مزاح نگار بنا دیا''۔ ۱۹

احتشام صاحب اور محمد حسن کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور نے مزاحیہ ادب پر تنقید اور انگریزی میں عالمی مزاحیہ ادب پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں مذکورہ اساتذۂ کرام کے علاوہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر یوسف حسین موسوی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر رضیہ سجاد ظہیر اور سید شبیہ الحسن نونہروی جیسے شفیق اور مہربان اساتذہ نے ان کی مزاح نگاری کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ لکھنؤ سے علی گڑھ پہنچنے پر ان کے فن کو اور جلا ملی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

علی گڑھ میں جمال صاحب کے قریبی دوستوں میں قمر رئیس تھے جو ''ادیب'' کے مدیر تھے۔ انھوں نے ہی پاشا صاحب کو سر سید ہال میگزین ''اسکالر'' کا ایڈیٹر بنوایا تھا ساتھ ہی ''ادیب'' کا مدیر معاون بھی۔ انھوں نے ہی پاشا صاحب کو تنقید اور تبصرے کی طرف مائل کیا۔ پاشا صاحب رقم طراز ہیں :

''(قمر رئیس) ورسؔ اور'ادیب' میں زبردستی تنقیدی مضامین لکھواتے جن میں ہمارے نام کے علاوہ بیش تر انھیں کا ہوتا''۔ ۲۰

علی گڑھ سے لکھنؤ واپس آنے پر یہ جب تک ''اودھ پنچ'' نکالتے رہے ادب سے ان کا رشتہ مضبوطی سے جڑا رہا لیکن قومی آواز میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد ان کی مزاح نگاری کو بہت نقصان پہنچا۔ ان کے پاس لکھنے پڑھنے کا وقت کم سے کم ہوتا گیا۔ اخباری زندگی کی بھاگ دوڑ، ہنگامی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی ہل چل، کالم نگاری اور صحافت سے ان کے ادبی مزاج اور ادبی ظرافت کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ لکھتے ہیں :

''میں روزنامہ 'قومی آواز' کے شعبۂ ادارت سے اس طرح وابستہ ہوا جیسے کہ بیل کولھو سے باندھ دیا جاتا ہے۔ صحافت کے آگے ادب، ظرافت سب ہوا ہوگیا۔ نہ پڑھنے کا موقع نہ لکھنے کی مہلت۔ اس زمانے کی تحریریں دیکھ کر اکثر سوچتا ہوں کہ دم بھر میں کیا ماجرا ہوگیا''۔ ۲۱

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ لکھنؤ سے مستقل طور پر سیوان آجانے کے بعد پاشا صاحب کا رشتہ ادب سے پھر مضبوط ہوگیا۔ انھوں نے اپنی دل چسپیاں پڑھنے پڑھانے یا ادبی سیمیناروں میں شرکت کرنے تک محدود کرلیں۔ اس عرصے میں ان کے مضامین کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع ہوتے رہے مگر ان کی بہت ساری تحریریں ایسی ہیں جو شائع نہیں ہوسکی ہیں۔ یہ سب زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں تبھی ان کے ادبی قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

اعزازات و انعامات: احمد جمال پاشا کو ان کی تصانیف پر مختلف اکادمیوں اور اداروں کی جانب سے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ''مضامینِ پاشا'' اور ''چشمِ حیراں'' پر انعامات دیے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے ''ظرافت اور تنقید'' پر انعام دیا۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ نے ''پتیوں پر چھڑکاؤ'' پر اختر اورینوی انعام (بعد از مرگ) عنایت کیا۔ ۱۹۸۴ء میں سیوان میں ہندی ادیبوں کی ایک تنظیم نے ''یوگ مایا ساہتیہ پُرسکار'' دیا۔ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع میں انھیں ''نشانِ سجاد ظہیر'' ملا۔ غالب اکیڈمی دہلی کی جانب سے ۱۹۸۶ء کا ساگر سوری غالب انعام برائے اردو طنز و مزاح (پس مرگ) دیا گیا۔

آخری سفر: سیوان جیسی چھوٹی جگہ رہنے کے باوجود احمد جمال پاشا کا رشتہ اردو دنیا سے برابر قائم رہا۔ ہندوستان پاکستان کے رسائل و جرائد میں پابندی سے لکھنے کے علاوہ وہ دلی، لکھنؤ اور پٹنہ کا سفر بھی برابر کیا کرتے تھے۔

خصوصاً مہینے دو مہینے میں پٹنہ کا ایک چکر ضرور لگاتے۔ کبھی ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں، کبھی خدا بخش لائبریری، بہار اردو اکادمی یا انجمن ترقی اردو بہار کی میٹنگ میں شرکت کے لیے۔ ۲۶ رستمبر ۱۹۸۷ء کو ریڈیو پروگرام کے تحت پٹنہ آئے اور راقم حروف کے یہاں (ڈولی گھاٹ پٹنہ سیٹی) قیام کیا۔ دوسرے دن ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے عنوان کے تحت مجاز لکھنوی کی شخصیت پر ریکارڈنگ کے لئے ریڈیو اسٹیشن گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ریکارڈنگ آج نہیں ۲۶ را کتوبر کو ہوگی لہٰذا اسٹیشن سے نکل کر خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار سے ملنے چلے گئے۔ وہاں باتیں کرتے کرتے یکا یک آرام کی خواہش ظاہر کی لیکن اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ شام میں خدا بخش میں پروفیسر سید حسن کے ساتھ ایک شام منائی جارہی تھی۔ اس میں شریک ہوئے، تقریر بھی کی۔ دورانِ تقریر ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش نظر آئے۔ آٹھ بجے شب میں لائبریری سے ٹہلتے ہوئے بک امپوریم گئے وہاں پھر انھوں نے تکان محسوس کی۔ وہاں سے جائے قیام پر واپس آئے۔ رات بڑے آرام سے گزری۔ دوسرے دن بیدار ہونے پر طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے یہاں گئے۔ وہاں بیٹھے خوش گپی میں مصروف تھے کہ اچانک انھیں دل کا زبردست دورہ پڑا۔ انھیں فوراً اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی کے آئی-سی-سی یونٹ میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے جانچ کے بعد بتایا کہ اس سے قبل انھیں دل کا معمولی دورہ پڑ چکا ہے۔ اڑتالیس گھنٹے تک ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔ ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کی حالت میں کافی سدھار آیا۔ رات میں انھیں دو تین مرتبہ قے ہوئی۔ دوسرے روز پونے نو بجے صبح کچھ بے چینی محسوس کی۔ نو بجے پھر انھیں دورہ پڑا۔ ہاتھ پانو ادھر ادھر پھینکنے لگے۔ ناک میں لگی آکسیجن کی نلی نوچ پھینکی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم نے انھیں بچانے کی سرتوڑ کوششیں کیں لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس طرح ۲۸ رستمبر بروز پیر (۴ رصفر المظفر ۱۴۰۸ھ) نو بج کر بیس منٹ پر پاشا صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اسی دن جسدِ خاکی بذریعہ کار سیوان لایا گیا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے ان کے انتقال کی خبر نے ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھا دی۔ سیوان شہر میں رات کے وقت ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے نماز جنازہ کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ ۲۹ رستمبر کو ساڑھے نو بجے دن میں جنازہ نشاط افزا کے لان میں رکھا گیا۔ مولانا اقبال احمد مظاہری نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر دوست احباب، شاگردوں اور عقیدت مندوں کے جمِ غفیر نے تلبۂ کے قبرستان میں انھیں بچشمِ تر سپرد خاک کیا۔ پاشا صاحب کے انتقال کے بعد مختلف اخبارات نے اداریے لکھے، ریڈیو سے خصوصی پروگرام نشر ہوئے۔ بی-بی-سی لندن نے انتقال کی خبر نشر کی، رسائل نے گوشے شائع کیے۔ ملک کے طول وعرض میں تعزیتی اور دعائیہ جلسے منعقد کیے گئے اور قراردادیں پاس کی گئیں۔ پروفیسر عطا کاکوی نے اس شعر سے تاریخ نکالی ؎

اس سانحے پہ خود ہی الم نے جھکا کے سر
''مرگِ ظریفِ ہند'' کہا سال فوت کا ۲۲

۱-۱۴۰۹ = ۱۴۰۸ھ۔

حواشی

۱۔ دستاویز (مصنفین کے اپنے قلم سے) ۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۱۱

۲۔ خودنوشت ۔احمد جمال پاشا ''شگوفہ'' حیدرآباد (ہندوستانی مزاح نمبر) جون ۱۹۸۵ء ص ۲۴۶

۳۔ یہ خطوط راقم حروف کے پاس موجود ہیں۔

۴۔ یہ تمام واقعات پاشا صاحب نے مجھے نجی ملاقاتوں میں بتائے تھے۔

۵۔ احمد جمال پاشا کے گھریلو ملازم

۶۔ وہ بھی کیا دن تھے ۔احمد جمال پاشا ۔پندرہ روزہ ''آواز'' دہلی سولہ ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۱۸

۷۔ یہاں اس واقعے کا ذکر ضروری ہے کہ ثریا خاتون اور عزت پاشا کے مذکورہ بالا خطوط پاشا صاحب ہی نے مجھے عنایت کیے تھے۔ ان خطوط اور زبانی بیانات کی روشنی میں جب میں نے ان کے سنہ پیدائش کا تعین کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔ اس وقت راقم حروف نے ان سے گزارش کی تھی اگر آئندہ انھیں کہیں اپنی عمر لکھنا ہو تو صحیح لکھیں۔ مسکراتے ہوئے بولے ''میاں اگر میں صحیح لکھ دوں تو پھر آخر تم تحقیق کیا کرو گے''؟ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کے بعد جب انھوں نے شیخ رحمٰن اکولوی کو انٹرویو دیا (شائع شدہ 'نیا دور' لکھنؤ جولائی ۱۹۹۰ء) تو اس میں اپنی تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۳۰ء بتائی۔

۸۔ استادوں کے استاد ۔احمد جمال پاشا ''فروغ اردو'' لکھنؤ (احتشام حسین نمبر) فروری ۱۹۷۴ء ص ۲۱۷

۹۔ میرے بھی استاد ۔احمد جمال پاشا ''آواز'' دہلی ۲۶؍اکتوبر ۱۹۷۷ء ص ۱۶

۱۰۔ وہ بھی کیا دن تھے (حوالہ سابق) ص ۱۹

۱۱۔ جمال کی چیخیں اور اردو ۔اقبال پاشا ''معلم اردو'' لکھنؤ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۱۰۱

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ اقبال مجید ۔احمد جمال پاشا ''مادر وطن'' لکھنؤ ۔۲؍فروری ۱۹۵۸ء ص ۱۰

۱۴۔ روپ بہروپ ۔محمد اسلام ''نگارش'' کراچی اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۹

۱۵۔ یہ اطلاع جناب عابد سہیل نے فراہم کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ یہ خط میرے پاس ہے۔

۱۷۔ استادوں کے استاد ۔احمد جمال پاشا ص ۲۱۸

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ذکر میرا ۔احمد جمال پاشا ۔سالنامہ ''نگارش'' کراچی ۱۹۶۲ء ص ۱۶۱

۲۰۔ قمر رئیس ۔احمد جمال پاشا ۔سہ ماہی ''راج بھاشا'' پٹنہ مارچ ۔مئی ۱۹۸۷ء ص ۳۲

۲۱۔ سید عطا حسین عطا ۔احمد جمال پاشا ''خبرنامہ'' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۔نومبر ۔دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۱-۳۲

۲۲۔ قطعۂ تاریخ رحلت، پروفیسر احمد جمال پاشا ۔عطا کاکوی ''کتاب نما'' دہلی جنوری ۱۹۸۹ء ص ۱۰۳

Ranipur, Barharia, Siwan (Bihar) - 481232

حسن مثنیٰ

مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ خاکہ نگاری

دنیا کا ہر فطین و ذہین ادیب تقلید سے احتراز کرتا ہے ساتھ ہی ساتھ اس امر سے بھی انحراف ممکن نہیں کہ ہر ادیب وقلمکار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن میں بالکل نیا رنگ ہو اور وہ خود ایک نئے طرز کا موجد بن جائے تاکہ قاری بغیر کسی ششں و پنج کے اس کی تحریر سے واقف ہو جائے۔ خواہ وہ نظم، غزل، قصیدہ، مرثیہ، مسدس، رباعی وغیرہ شعری اصناف کا خالق ہو یا اصناف نثر مثلاً ناول، افسانہ، مکتوب، سوانح، سفرنامہ، خاکہ نگاری جیسی نثری اصناف پر طبع آزمائی کرنے والے ادیب وقلمکار بھی اپنے اپنے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس عمل میں وہ اپنی جودت طبع، فطانت، ذہانت اور علمی لیاقت وبصیرت کا نہ صرف بھرپور استعمال کرتے ہیں بلکہ اس میں جدتیں پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین بھی اسی قبیل کے ادیب ہیں جنھوں نے اپنی مزاح نگاری سے برصغیر ہند و پاک میں منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی بلکہ یوں کہا جائے کہ اپنا ادبی سفر کالم نگاری سے شروع کیا تھا لیکن بہت جلد ان کے حلقۂ احباب میں یہ شہرہ ہوگیا کہ ان کے اندر ایک بہت بڑا مزاح نگار چھپا بیٹھا ہے۔ اس مزاح نگار کو کریدنے کے لئے انھیں ''کوہ پیا'' کا خطاب عطا کیا گیا اور ''شیشہ و تیشہ'' لکھنے کی زحمت دی گئی۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ ایک روز حکیم یوسف خاں نے انھیں خود پر خاکہ لکھنے کا حکم دے دیا جسے موصوف فرمائش کہا کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ۱۹۶۸ء میں پہلا خاکہ لکھا۔

اس سے قبل کہ مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ خاکہ نگاری سے بحث کی جائے، یہ جان لینا ضروری ہے کہ خاکہ نگاری کیا ہے اور اس کے لوازم کیا کیا ہیں اور مزید یہ کہ خاکہ نگاری کی ابتدا کب ہوئی وغیرہ۔ دراصل خاکہ نگاری کا فن نہایت ہی مشکل فن ہے۔ ایسا اس لئے کہ عام طور پر خاکوں میں مختصر الفاظ کے ذریعے پوری شخصیت پر اس قبیل سے روشنی ڈالنی پڑتی ہے کہ شخصیت بول پڑے اور اس کے جملہ اوصاف قاری کی نظروں کے سامنے آجائیں۔ خاکہ نگاری سے قطع نظر مزاحیہ خاکہ نگاری تو مزید مشکل اور کٹھن فن ثابت ہوتا ہے کیونکہ جس شخص کا خاکہ لکھنا مقصود ہوتا ہے، خاکہ نگار پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ متعلقہ شخص کی خوبیوں اور خامیوں سے نہ صرف پردہ اٹھائے بلکہ اسے مزاحیہ لہجہ بھی عطا کرے یعنی خاکہ نگاری بُت گری کے ایسے زمرے میں آتی ہے جس کے ذریعہ کسی شخص کی صورت و سیرت دونوں ہی ظاہر ہو جائے۔ شاید اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم خاکہ نگاری کے فن پر کچھ اس قسم کا تبصرہ کرتے ہیں :

> ''خاکہ نگاری ایک مشکل اور نازک فن ہے۔ اگر اسے نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے خوبصورت مورتی کس طرح تراش لیتے ہو، اس نے جواب دیا کہ مورتی خود اس پتھر میں موجود تھی، میں نے تو صرف زائد حصہ کو علاحدہ کیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ وہ سوانح عمری میں سے زائد حصے کو اس طرح الگ کر دیتا ہے کہ شخصیت اپنے اصل روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے''۔ (۱)

اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش میر کے ''نکات الشعراء''، قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعۂ نغز''، مصحفی کے ''تذکرہ ہندی''، شیفتہ کے ''گلشن بیخار'' اور مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' اور ''دربار اکبری'' وغیرہ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے بعد لکھے گئے تقریباً بھی تذکروں، ادبی تاریخوں کے علاوہ سوانحی کتب جیسے مولانا الطاف حسین حالی کی ''یادگار غالب، حیات جاوید، حیات سعدی''، مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان'' وغیرہ میں خاکہ نگاری کے نقوش کہیں روشن تو کہیں دھندلی شکل میں مل جاتے ہیں۔ لیکن اس صنف کو نقطۂ عروج تک پہنچانے میں فرحت اللہ بیگ کا نام نامی سرفہرست ہے جن کی تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' خاکہ نگاری کا نقشِ اول ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں مولوی عبدالحق، آغا حیدر حسن دہلوی، جوش ملیح آبادی، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریا آبادی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، اعجاز حسین، شاہد احمد دہلوی، طفیل احمد، مشتاق احمد یوسفی وغیرھم نے اہم کردار ادا کیا اور فکر ونظر کے نئے نئے زاویوں سے شخصیت کی پرکھ کرنے کی کوشش کی اور اس صنف کو وقار واعتبار بخشا۔ اور اسی نہج پر روبہ عمل رہتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے بھی اپنی راہ نکالی ہے اور موجودہ عہد میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ابھی تک ان کے ذریعہ تحریر کردہ خاکوں کے تین مجموعے ''سو ہے وہ بھی آدمی (۱)، آدمی نامہ (۲) اور چہرہ در چہرہ (۳)، وغیرہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کے کئی خاکے مجموعۂ مضامین مثلاً تکلف برطرف، بہر حال، قصہ مختصر اور قطع کلام وغیرہ میں بھی شامل ہیں۔ اور ہمیں اس بات کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے پیش رووں کی روایت کو آگے بڑھانے میں پیش پیش ہیں بلکہ اس میں نئے نئے گوشوں کا اضافہ بھی کرنے میں کامیاب ہیں جس سے قاری کی تسکین کا سامان بہم ہو سکے۔ ان کے خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تمام خاکوں میں اس شخص کی زندگی کے اچھے بُرے بھی پہلوؤں کو قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی بے جا تعریف کر کے نہ اسے فرشتہ ٹھہراتے ہیں اور نہ ہی تنقیص کے ذریعہ اسے وِلن (Villon) کی شکل میں پیش کرنے کی سعی

کرتے ہیں بلکہ وہ انسان کو انسان ہی رہنے دیتے ہیں جس سے اس شخص کا اصلی روپ ہمارے سامنے آسکے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ایک خاکہ نگار کا کام بُت گری یا بُت شکنی نہیں ہے، ملاحظہ فرمائیں ان کے ذریعہ تحریر کردہ اولین خاکہ کا ایک تراشہ۔

> ''میں نے سوچا تھا کہ حکیم صاحب کا مجموعہ دراصل طب اور شاعری کا مجموعہ ہوگا اس کی پیشانی پر''ھوالشافی'' کے الفاظ درج ہوں گے۔ پھر اس میں جو غزلیں ہوں گی تو ان کے آگے خوراکوں کے نشان ہوں گے اور پانچ اشعار کی غزل ہوگی تو پانچ نشان اور سات اشعار کی غزل ہوگی تو سات نشان۔ پھر ہر غزل یا نظم کے نیچے اس قسم کی ہدایات بھی درج ہوں گی کہ یہ غزل ناشتہ کے بعد پڑھی جائے۔ یہ غزل نہار پیٹ پڑھی جائے اس غزل کے دو اشعار ہر روز رات میں سونے سے پہلے پڑھے جائیں۔ یہ نظم چائے کے ساتھ پڑھی جائے، اس غزل کو پڑھنے کے بعد سات دنوں تک تیل کی چیزیں نہ کھائی جائیں اور پھر مجموعہ کے پہلے صفحہ پر نہایت جلی حروف میں یہ عبارت بھی درج ہوگی''۔
>
> (۳) '' SHAKE WELL BEFORE USE ''

یہ اقتباس حکیم یوسف خاں کے خاکے سے ماخوذ تھا جسے انھوں نے ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ تقریباً پانچ درجن سے زائد خاکے لکھ چکے ہیں جن میں فرمائشی اور غیر فرمائشی دونوں قسم کے خاکے شامل ہیں جو ان کے فن میں بتدریج ارتقاء کے شاہد ہیں۔ ان خاکوں میں وہ خاکے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جسے انھوں نے اپنی اندرونی تحریک سے لکھا ہے۔ مثلاً سجاد ظہیر، عمیق حنفی، کنہیالال کپور، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس وغیرہ کے خاکے جن میں ان کا فن پوری طرح عروج پر نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بقیہ خاکے یونہی لکھ دئے گئے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے سبھی خاکے انکشاف ذات وصفات کے عمل سے عبارت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے اشخاص کو ہی اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے جو کسی نہ کسی طرح علم وفن میں ایک مخصوص مقام پر فائز ہیں خواہ وہ خواجہ احمد عباس ہوں، اندر کمار گجرال ہوں، شہریار ہوں یا کہ فدا حسین اور خشونت سنگھ کے خاکے۔ سبھی خاکوں میں ان کے مزاحیہ اسلوب نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

یہ بات صد فی صد صداقت پر مبنی ہے کہ مجتبیٰ حسین کے سبھی خاکے مزاحیہ طرز ادا لئے ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی طنز کی نشتریت کا احساس نہیں ہوتا، اس وقت بھی نہیں جب وہ اس شخص سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جو ان کے خاکے کا موضوع ہوتے ہیں۔ ان کا فن یہ ہے کہ وہ ایسا طرز تحریر اختیار کر لیتے ہیں جس سے سنجیدگی پیدا ہو جائے۔ مگر اندر ہی اندر ایک نفنا بھی تخلیق ہوتی ہے جو اچانک کسی نوشتہ تحریر کی کے چھوٹنے کا سماں پیش کر دے۔ مثلاً کنہیالال کپور کے متعلق یہ جملے

دیکھیں جو ان کے فن پر دلالت کرتے ہیں :

''کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں قطب مینار کی یاد آتی ہے۔ مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے کہ ہوائی جہاز وغیرہ ادھر کا رُخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت حفاظتی انتظام نہیں ہوتا ہے جو خطرے سے خالی نہیں کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے''۔(۳)

مجتبیٰ حسین کے اس خاکے کو بہت سراہا گیا اور خود کنہیالال کپور نے بھی ان کی ثنا خوانی کچھ یوں کی :

''تم نے اس خاکسار کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اتنا دلآویز ہے کہ تمہارے قلم کی بلائیں لینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ اسے پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ بے اختیار منہ سے نکلا ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا　　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

''خاکہ نگاری میں تمہیں واقعی کمال حاصل ہے۔ خدا کرے تمہارا تخیل ہمیشہ جواں رہے''۔ (۴)

فی الواقع مجتبیٰ حسین کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ لکھ رہے ہوتے ہیں اس کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسا مزاحیہ پہلو تلاش کر لیتے ہیں جو بیشتر اوقات اس شخصیت کی شناخت بن جاتی ہے یعنی شخصیت کی تہذیب کاری کا عمل ان کے ہر خاکے میں موجود ہے۔ مثلاً، سجاد ظہیر کا خاکہ پڑھتے وقت ہم ان کی مسکراہٹ کے وسیلے سے ان کی شخصیت کی پرکھ کرتے ہیں۔ دیکھیے سجاد ظہیر یعنی بنے بھائی کی مسکراہٹ کی خوبیوں پر سے کس طرح پردہ اٹھایا گیا ہے :

''بنے بھائی کی مسکراہٹ کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بے شمار پہلو اور بے شمار رنگ تھے ایسا تنوع تھا کہ ہر بار ان کی مسکراہٹ پچھلی مسکراہٹوں سے الگ معلوم ہوتی تھی۔ کبھی یہ مسکراہٹ معصومیت کا لباس پہن لیتی، کبھی یہ سراسر شفقت بن جاتی، کبھی محبت، کبھی عزم، کبھی حوصلہ، کبھی نرمی، کبھی شائستگی، کبھی عقیدہ، کبھی طنز اور کبھی کبھی تو یہ مسکراہٹ سراسر درد و کرب تک کا روپ دھارن کر لیتی تھی''۔ (۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے بنے بھائی (سجاد ظہیر) کی شخصیت کو کچھ اس طرح نکھارا ہے کہ ہم ان کی شخصیت کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان خیالات و احساسات سے بھی دوچار ہو

جاتے ہیں جو خاکہ نگار کا مقصد ہے۔ دراصل یہ احساساتی اسلوب کا عمدہ نمونہ ہے جس میں مسکراہٹ ایک علامت بن کر ظاہر ہوتی ہے اور آخر آخر تک ہم اس مسکراہٹ کے سحر میں کھوئے رہتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے غیر شخصی خاکوں میں ''یونیسکو کی چھتری'' نہایت اہم ہے جو ان کے مشہور و معروف سفر نامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' میں شامل ہے۔ وہ فقرے جو انھوں نے اپنی شریک حیات کو لکھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں جن میں انھوں نے ''چھتری'' کا لفظ نہ لکھ کر غلط فہمی پیدا کر دی اور نتیجتاً بیوی سے خفگی ہوگئی۔

> ''وہ ہمیں ٹوکیو میں ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو لکھا۔ وہ ہمیں آج ملی ہے دیکھنے میں کچھ خاص نہیں پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں شب و روز گذارنے ہیں، اسی کے سائے میں رہنا ہے''۔(۶)

مجتبیٰ حسین نے چھتری کا جتنا عمدہ خاکہ کھینچا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس باب میں انھوں نے چھتری کے توسط سے جاپان اور جاپانیوں سے جس محبت کا اظہار کیا ہے وہ بھی لائق ستائش ہے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خاکوں میں خواہ وہ شخصی ہوں یا غیر شخصی، فرمائشی ہوں یا غیر فرمائشی، ذاتی پہلوؤں خصوصاً تاریک پہلوؤں کو نہیں چھیڑتے، کسی کا مذاق نہیں اڑاتے، برائی نہیں کرتے، دلآزاری نہیں کرتے۔ ان کے طنز میں اکبر الہ آبادی کی طرح جارحانہ انداز نہیں پایا جاتا بلکہ جارج برنارڈ شا کی طرح لطافت و نزاکت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا فن یہ ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ لکھتے ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے اوصاف کو بھی اپنے نرالے اور اچھوتے اسلوب کے سہارے ایسے سیاق و سباق میں پیش کر دیتے ہیں کہ وہ بڑا اور اہم وصف بن جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قاری ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان کے سبھی خاکے توصیف سے شروع ہو کر توصیف ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے اس لئے کہ درمیان میں وہ تمام خامیوں پر نظر ڈالتے چلتے ہیں لیکن وہ خامیاں شوگر کوٹڈ (Sugar coated) کونین کی شکل میں ہوتی ہیں نہ کہ کڑوی، کسیلی جسے نگلا نہ جا سکے۔ یہی ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔ وہ اپنے خاکوں کے عنوانات بھی بے حد پرکشش اور جاذب نظر رکھتے ہیں جس سے قاری پہلی نظر میں ہی اس شخص کی خوبیوں، خامیوں سے آشنا ہو جائے۔ مثلاً، حکیم یوسف خاں ''پتھر کا آدمی''، عزیز قیسی ''آخری شریف آدمی''، ابراہیم جلیس ''منظوم آدمی''، ''سلام مچھلی شہری''، بھارت چندر کھنہ ''کھویا ہوا آدمی'' وغیرہ وغیرہ۔ مدعا یہ ہے کہ انہیں اپنے خاکوں کے عناوین تراشنے کا فن بھی بخوبی معلوم ہے۔ جس کے ذریعہ وہ نہ صرف اپنے قاری کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں بلکہ ایک ایسی فضا بھی تخلیق کر دینے میں کامیاب رہتے ہیں جس کا احساس عنوان پڑھتے ہی ہو جاتا ہے۔ اگر مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس ناگزیر حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی تحریروں میں کرخت اور سخت الفاظ بہت کم لاتے ہیں بلکہ ایسی لفظوں کا استعمال کرتے ہیں

جو اتنے نرم، مدھم اور دلکش ہوتے ہیں کہ ان کی نشست و برخاست سے ساعت مسحور ہو کر رہ جاتی ہے اور ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ باتیں تو فلاں شخص کے متعلق کہی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس جو مندرجہ بالا حقائق پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔

> ''انگریزی کا مایہ ناز ادیب، صف اول کا دانشور، انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹر، بیباک صحافی، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار، جادو بیاں مقرر، پارلیامنٹ کا ممبر، اردو کا پرستار، اقبال کا عاشق، اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کا بہی خواہ، کردار و گفتار کا غازی..... گھبرایئے نہیں، ذکر شخصیتوں کا نہیں ایک ہی شخص کا ہے وہ شخصیت ہے خشونت سنگھ کی''۔ (۷)

حواشی

۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ عبدالحق کی خاکہ نگاری، صفحہ ۱۷-۳۷۔
۲۔ مجتبیٰ حسین۔ قطع کلام، صفحہ
۳۔ مجتبیٰ حسین۔ آدمی نامہ، صفحہ ۹
۴۔ ڈاکٹر اجمل اجملی۔ سوئینیر جشن مجتبیٰ شارجہ دبئی۔
۵۔ مجتبیٰ حسین۔ آدمی نامہ، صفحہ ۶۰-۵۹۔
۶۔ مجتبیٰ حسین۔ جاپان چلو جاپان چلو، صفحہ ۸۹
۷۔ مجتبیٰ حسین۔ سو ہے وہ بھی آدمی، صفحہ ۶۷۔

219-E, Barhamtera Hostel,
J.N.U. New Delhi - 67

محمود الحسن

ستیش بترا — اَحوال و آثار

خاندان: ستیش بترا کے خاندان میں کوئی مکمل اور مفصل شجرۂ نسب موجود نہیں ہے لیکن خاندان کے چند تعلیم یافتہ اور باذوق لوگوں نے اسے مرتب کرنے کی کوشش ضرور کی۔ تحقیق سے یہ علم ہوتا ہے کہ بترا خاندان قندھار اور غزنی سے منتقل ہو کر ہندوستان آبسا تھا۔ آج بھی ملتان میں ایک کثیر تعداد میں بترا خاندان کے لوگ سکونت پذیر ہیں۔ یوں گمان ہوتا ہے کہ افغانستان سے لاہور جانے والے تجارتی راستے پر جہاں ملتان واقع ہے اس خاندان کے لوگ آکر بس گئے۔ ملتان کو مرکز بنا کر کچھ لوگ سندھ منتقل ہو گئے۔ آج بھی اپنے آپ کو بترا کہلانے والے گنے چُنے لوگ سندھ میں موجود ہیں اور ایک شاخ نے لاہور جانے والے راستے پر واقع گیروٹ میں سکونت اختیار کر لی۔ گیروٹ دریائے جہلم کے نزدیک واقع ہے۔ یہ بیساکھی کے میلے کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ گیروٹ سے قریبی مقام میٹھا ٹوانا اور جھنگ میں آکر بس گئے۔ ان جگہوں پر اس خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ عام طور پر بترا خاندان کے لوگ تجارت پیشہ ہیں اور ملتان کے اکثر خاندان اس پیشے سے منسلک ہیں اور خوشحال ہیں۔ لیکن گیروٹ سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کے اکثر افراد نے ملازمت اختیار کر لی اور اعلا سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس لئے انہوں نے خاصا نام کمایا۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ کسی بھی بترا خاندان کا فرد ہونے کے لئے گیروٹ سے وابستگی لازمی ہے۔ دورانِ ملازمت ملک کے مختلف حصوں میں بھی یہ افراد منتقل ہوتے رہے۔ گیروٹ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہمیشہ خوشحال اور ممتاز رہے۔

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بترا خاندان اقتصادی طور پر یقینی بہت خوشحال رہا ہوگا۔ کیونکہ ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر میں ستیش بترا کے دادا لالہ ہرکشن داس بترا اور ان کے دو بڑے بھائی یکے بعد دیگرے اعلا تعلیم حاصل کرنے لئے انگلستان گئے تھے۔ ستیش کے دادا لالہ ہرکشن اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ انگلستان سے لوٹنے کے بعد انھوں نے پنجاب میں بیرسٹری شروع کی۔ اس وقت وہ پنجاب کے چند نامی گرامی بیرسٹروں میں سے ایک تھے۔ ان کے بڑے بھائی نہال چند بترا نے انگلستان میں انجینیرنگ کی تعلیم مکمل کی اور ان سے چھوٹے بھائی لالہ ہری داس بترا اسیول سرجن کی ڈگری حاصل کر کے ہندوستان لوٹے۔ ڈگریاں حاصل کر کے واپس آنے کے بعد دونوں بھائیوں نے ملازمت کر لی اور اعلا و ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ برطانوی عہد حکومت میں تین تین بھائیوں کا انگلستان جا کر تعلیم حاصل کرنا اور واپس آنے کے بعد اپنے اپنے میدانوں میں نام پیدا کرنا

معمولی بات نہ تھی۔ ان تمام باتوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بترا خاندان اس زمانے میں تعلیمی اور اقتصادی طور پر بے حد مستحکم تھا۔ محض یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان تینوں بھائیوں کی اگلی پیڑھی نے بھی اپنے لئے نمایاں طور پر وہی پیشے اختیار کئے جو ان کے بزرگوں نے اختیار کئے تھے۔ اس طرح ستیش بترا کے دادا لالہ ہری کشن داس کا خاندان وکیلوں کا خاندان کہلایا اور باقی دونوں بڑے بھائیوں کے خاندان نے بالترتیب انجینیرنگ اور ڈاکٹری کے پیشے کو اختیار کیا۔ زمانے کی روایت کے مطابق سمندر پار یعنی انگلستان جانے والے لوگوں کو برادری آسانی سے قبول نہیں کرتی تھی جب تک کہ وہ لوگ ہری دوار جا کر گنگا میں نہا کر پوتر نہ ہو جاتے۔

ستیش بترا کے دادا لالہ ہری کشن داس نے انگلستان سے بیرسٹری کر کے لوٹنے کے بعد لائل پور میں جو گیروٹ (موجودہ ضلع سرگودھا) سے بہت دور نہ تھا، بیرسٹری شروع کی اور اپنے علاقے کے لوگوں کے مقدموں کی پیروی کر کے خوب خوب نام کمایا۔ اس وجہ سے برادری لوگ ہمیشہ ان کے ممنون رہے۔

ستیش بترا کے والد لالہ رگھوناتھ بترا بھی قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنے والد ہری کشن داس بترا کی پریکٹس میں شامل ہوئے لیکن انھیں بہت جلد پنجاب سرکار نے جوڈیشیل سروس میں لے لیا جس میں ترقی کرتے ہوئے وہ سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ دورانِ ملازمت ہی ان کا انتقال ہو گیا ورنہ وہ ترقی کی مزید منزلیں طے کرتے۔ ان کی وفات ۴۶ سال کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ وہ بے حد مخلص اور اپنی دیانت داری کے لئے بہت مشہور تھے۔ ان کی قانونی سوجھ بوجھ نے ان کی شہرت میں اضافہ کیا۔ ان کے دیے ہوئے فیصلے سالوں سال تک عدالتوں میں حوالے کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔

لالہ رگھوناتھ بترا پانچ بھائی اور دو بہن تھے۔ پانچ بھائیوں میں سے دو نے وکالت پاس کی۔ ایک محکمۂ آبپاشی میں چیف انجینئر ہوئے اور ایک کی اگری کلچرل سروس میں بطور آفیسر تقرری ہوئی۔ بہنوں کی شادیاں وکیلوں سے ہوئیں۔ بھائیوں میں سے کسی نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ سبھی بھائی متوسط عمر میں ہی وفات پا گئے۔

پیدائش: ستیش بترا کی پیدائش ۱۹/ مارچ ۱۹۲۶ء کو ضلع جہلم (پاکستان) کے مشہور قصبہ پنڈ دادخاں میں ہوئی۔ اس وقت ان کے والد لالہ رگھوناتھ بترا اسیشن جج کے عہدے پر فائز تھے۔ ستیش بترا کی والدہ سورج دیوی موضع چک موسیٰ کے ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ ستیش بترا عہدِ طفولیت یعنی فقط پانچ برس کی عمر میں ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی دادی نے انھیں اپنے زیرِ سایہ لے لیا اور کبھی بھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ان کے والد بھی اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کی وفات ۴۶ سال کی عمر میں جون ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے وقت ستیش بترا بارہ سال کے تھے۔ ایک طرف دادی نے ماں کی شفقت دی تو دوسری طرف ان کے بڑے بھائی

جگدیش بترا نے بھائی اور باپ کے فرائض انجام دیے۔ ایک بہن کی شادی ماں کی موجودگی میں ہو چکی تھی۔ دوسری بہن کی شادی والدہ کے انتقال کے بعد ہوئی جسے انھوں نے اپنی زندگی میں ہی طے کر دیا تھا۔ ستیش بترا نے اس شادی سے متعلق ایک مذاق کا ذکر راقم الحروف سے ان الفاظ میں کیا :

''اتفاق سے ہمارے یہ بہنوئی بھی وکیل صاحب تھے۔ ہمارے بہنوئی کا نام گنگا رام تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جہیز میں ایک رنگین کاٹھ کا طوطا بھی شامل تھا جس کے نیچے ہمارے سب سے چھوٹے چچا نے مذاق کے طور پر ایک بڑی سی تختی پر لکھ دیا تھا — بول گنگا پوڑی کھائے گا۔''

بچپن اور تعلیم : ستیش بترا آٹھ بہن بھائی تھے جن میں پانچ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بترا اپنے والدین کی چھٹی اولاد تھے۔ ان کی والدہ کا جب انتقال ہوا تو ان کی چھوٹی بہن کی عمر صرف سات دن کی تھی۔ اس کی پرورش کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس کے دودھ پلانے کے لیے آگرہ سے ایک آیا کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب اس کی شادی ہوئی تو وہ بھی اپنے دوسرے بچے کو سات دن کی عمر میں ہی چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی۔ اس وقت اس کی عمر ۲۴ برس تھی۔ خاندان کی روایت کے مطابق گھر میں ٹیوٹر رکھ کر بچوں کو چھٹی جماعت تک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ستیش بترا جب پانچ سال کے ہوئے تو ان کے لیے بھی باقاعدہ ٹیوٹر کا انتظام کیا گیا۔ ان کا چھوٹا بھائی جوان سے تقریباً دو سال چھوٹا تھا، ان کے ساتھ پڑھنے بٹھا دیا جاتا تاکہ گھر والے کچھ دیر کے لیے اس کی شرارتوں سے محفوظ رہیں۔ بترا ذہین اور تیز تھے۔ والد کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہا اور ان کے ٹیوٹر بدلتے رہے۔ انھیں بھی نئے نئے استادوں سے ملاقات کا موقع فراہم ہوتا رہا۔ وہ نکودر (ضلع جالندھر) سے نارووال (ضلع سیالکوٹ) اور گجرات پہنچ چکے تھے۔ اس درمیان ان کے والد ترقی کر کے سینئر سب جج کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ بترا نے پانچویں جماعت کا امتحان سناتن دھرم اسکول سے دیا اور چھٹی جماعت میں باقاعدہ اسکول میں داخلہ لیا۔ گجرات سے وہ آریا اسکول لدھیانہ منتقل ہوئے۔ جہاں انھیں گائتری منتر کا جاپ سکھایا جاتا تھا۔ لدھیانہ میں رہ کر آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ ان کے والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا اور وہ گورنمنٹ اسکول دہلی میں داخل کرا دیے گئے جہاں دعا کے وقت ''تیری شان جل جلالہ'' سے سابقہ پڑا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد انھیں ڈی-اے-وی اسکول لاہور میں نویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ یہاں ہاسٹل میں رہنے کا تجربہ ہوا۔ ۲۸/ جون ۱۹۳۸ء کو ان کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا۔

والد کے انتقال کے بعد وہ سبھی بھائی بہن لاہور کے رام نگر کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ لیکن ان کے دو بڑے بھائی لاہور سے باہر تھے۔ ایک بھائی نیول اسکول ڈفرن میں اور دوسرے بھائی امپیریل ایگریکلچر اسکول نئی دہلی

میں پڑھتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جگدیش والد صاحب کے آخری دنوں میں ہوائی جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ انھیں مجبوراً گھر سنبھالنے کے لیے فلائنگ چھوڑ کر انجینئر نگ کا کورس کرنا پڑا۔ کورس پورا ہوتے ہی ان کی شادی ہوگئی اور انھوں نے موٹر ورک شاپ کھول لیا۔ اس درمیان بترا رام نگر سے نکل کر میکلوڈ روڈ پہنچ گئے۔ جہاں ایک بڑے سے مکان کے سامنے کے حصے میں شوروم اور ورک شاپ تھا اور عقب میں رہائش گاہ۔ اس دوران بترا نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کرلیا تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہونا چاہئے تھا لیکن دیال سنگھ کالج بہت قریب تھا اس لیے ان کا داخلہ وہیں ہوا۔ انٹر میں سائنس کے مضامین کے ساتھ اختیاری مضمون کے طور پر اردو رکھا اور شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی جیسی شخصیت سے دیوان حالی اور مقدمۂ شعر و شاعری پڑھنے کا موقع ملا۔ بترا کو شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن افسانے اور ناول سے گہری دلچسپی تھی۔ میٹرک میں تھے تو رام نگر سے پبلک لائبریری زیادہ دور نہ تھی اسی طرح اب میکلوڈ روڈ سے دیال سنگھ لائبریری بہت قریب ہوگئی تھی۔ انھوں نے دونوں لائبریریوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ گرمی کی چھٹیوں میں اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ہمراہ دہلی والے بھائی کے یہاں تو کبھی چچا کے پاس جو محکمۂ آبپاشی میں انجینئر تھے، چلے جاتے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا جس سے بترا کو پنجاب کے اکثر باندھوں (Dames) کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے چچا کو بھی اچھے ناول و افسانے اور ڈرامے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے یہاں کتابوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ بترا ان کے گھر پہنچ کر ان کی کتابوں سے خوب استفادہ کرتے۔ اس طرح ایچ۔جی۔ویلز، شیکسپیر اور برنارڈ شا وغیرہ کی بہت سی کتابیں پڑھنے کا انھیں موقع ملا۔ چچا کی کتابوں میں کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ ''نظارے'' پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ اس کتاب کا علمی ادبی حلقوں میں کافی چرچا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد بقول بترا — انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے تخیل کے نئے دروازے کھل گئے ہوں۔ اس مجموعے کے ہر افسانہ نے انھیں متاثر کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی مجموعے نے انھیں لکھنے کی تحریک دی۔ پھر وہ اس جانب سنجیدگی سے مائل ہوئے۔ اس دوران ان کے بڑے بھائی جگدیش بترا کو موٹر ورک شاپ کا کام راس نہ آیا اور انھوں نے ہندوستان ایرکرافٹ لیمیٹڈ بنگلور میں ملازمت کرلی۔ اب وہ لوگ میکلوڈ روڈ کا مکان چھوڑ کر پھر رام نگر کے ایک چھوٹے سے مکان میں آگئے۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا بھائی اجیت اور چھوٹی بہن کامتا تھی۔ دادی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ بڑے بھائیوں کے گھر سے دور ہونے کی وجہ سے گھر کی ساری ذمہ داری ستیش بترا کے سر آگئی۔ اس وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔

بترا صاحب نے انٹر سائنس سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین میں طبیعیات، ریاضی اور انگریزی ادب تھے۔ اس وقت یہ مضامین انجینئر نگ کے کورس کو مدنظر رکھ کر رکھے گئے تھے۔ اس وقت بھی انھوں نے اختیاری مضمون اردو ہی رکھا تھا۔ اس وقت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ان کے استاد تھے

اور دیوان غالب شوق سے پڑھایا کرتے تھے۔۱۹۴۴ء میں بی-اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ جانسن کالج آگرہ میں ایم-اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ آگرہ میں ان کے بڑے بھائی ملازم تھے۔ جب بترا آگرہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کرنے لگے تو اسی دوران ان کے بھائی کو ایک دوسری جگہ اچھی ملازمت مل گئی جس کی وجہ سے بترا کو کالج کے ہاسٹل میں جانا پڑا۔ آگرہ کے قیام کے دوران اعجاز صدیقی مدیر 'شاعر' سے ملاقات ہوئی۔ لاہور کی طرح یہاں بھی بترا کو پروفیسر امداد حسین کی شکل میں ایک شفیق استادمل گئے جو اڈنبرا سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ تھے اور شعبۂ انگریزی میں استاد تھے۔ جب کبھی بترا کوئی افسانہ لکھتے اور انھیں دکھاتے تو وہ حوصلہ افزائی کرتے اور افسانے کی باریکیوں پر تبادلۂ خیال کرتے۔ ڈاکٹر امداد حسین کو بھی اردو ادب سے کافی دلچسپی تھی وہ کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے۔ بترا کے ایم-اے کرنے کے بعد اُن کی تقرری مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیمات میں معاون مشیر کی حیثیت سے ہوئی اور ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے جہاں محکمۂ خارجہ کے کسی اعلا عہدے پر ان کی تقرری عمل میں آئی۔

بترا نے ابھی ایم-اے کا امتحان دیا ہی تھا اور نتیجہ نکلنے میں کچھ دن باقی تھے کہ خبر ملی کہ ان کی دادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ایم-اے کرنے کے بعد وہ مختصر افسانے یا سمرسٹ ماہم پر ڈاکٹریٹ کرنا چاہتے تھے اور صحافت کے پیشے کو اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن معاشی مجبوریوں نے انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے پر مجبور کردیا۔

مذہب وعقیدت: بترا کے گھر کا ماحول مذہبی ضرور تھا مگر کٹر پن نہیں تھا۔ یہ لوگ ہندو مذہب کے پیرو تھے۔ ان کے خاندان کے افراد نے انگلستان میں اعلا تعلیم حاصل کی تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ روشن خیال تھے۔ اندھی تقلید نہ تھی۔ بترا صاحب کے دل میں تمام مذاہب کا احترام تھا۔ وہ جدید اور روشن خیال تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''مختلف اسکولوں، کالجوں میں رہنے کی وجہ سے تقریباً سبھی مذہبوں سے فیض پایا اور اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسانیت سے اونچا کوئی دھرم نہیں''۔

شکل وشباہت: ان کی شکل وصورت بڑی دل آویز اور پُرکشش تھی۔ رنگ گورا چٹا، صحت مند چھریرا بدن، میانہ قد، مونچھ داڑھی سے یکسر خالی مگر روشن وشگفتہ چہرہ، چوڑی پیشانی، پیشانی کے اوپر دوٗر تک بالوں سے خالی سر، سر میں اوسط بال جس میں سفیدی نے جھانکنا شروع کردیا تھا، ذہانت آمیز سیاہ آنکھیں، جھریوں سے پاک وصاف چہرہ اور دوران گفتگو پیشانی پر ہلکی سلوٹیں نمودار ہوجاتیں۔ بھرے بھرے گال اور ہلکی پھیلی ہوئی ناک —— ان سب کی آمیزش سے ان کا چہرہ بڑا پُر رعب لگتا تھا۔ دیکھنے میں ذہانت اور سنجیدگی کے پیکر معلوم ہوتے تھے۔ (باقی آئندہ)

H.O.D of Persian
Z.A. Islamia College
Siwan - 841226 (Bihar), Tel.- 06154-285698

ڈاکٹر حبیب اللہ

پروفیسر سید احتشام حسین بہ حیثیت شاعر

پروفیسر احتشام حسین ۱۱/ جولائی ۱۹۱۲ء کو موضع اتر ڈیہہ میں سید محمد قاسم (احتشام صاحب کے پھوپھا) کے یہاں پیدا ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس زمانے میں قصبہ ماہل میں طاعون کافی زوروں پر تھا۔ اس لیے احتشام کے خاندان کے بھی افراد اتر ڈیہہ چلے گئے اور وہیں احتشام حسین پیدا ہوئے۔

احتشام حسین کا سلسلۂ نسب ملتِ جعفریہ کے آٹھویں امام، امام رضا مدفون مشہد پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ عہد اکبری میں ایران سے ہندوستان آئے اور فیض آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ بعد میں اسی خاندان کے ایک بزرگ میر مہر علی کسل گانو ضلع اعظم گڑھ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھر احتشام حسین کے دادا نے کسل گانو کو ترک کر کے قصبہ ماہل تحصیل پھول پور ضلع اعظم گڑھ میں اقامت اختیار کر لی۔ ان کے خاندان میں ملازمت، زمینداری اور ادب سے لگاؤ ہمیشہ رہا۔ احتشام کے گھر کا ماحول اور رہن سہن متوسط طبقے کا تھا لیکن ماہل میں ان کا مکان ''بڑی چھاونی'' کے نام سے اب بھی یاد کیا جاتا ہے۔

احتشام صاحب کی مذہبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ اس لیے چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے دینیات پر عبور حاصل کر لیا۔ احتشام نے ابتدائی تعلیم اپنے پھوپھا سید محمد قاسم کے ساتھ رہ کر گورکھپور میں حاصل کی۔ اپنے قصبہ کے مڈل اسکول سے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں مڈل فرسٹ کلاس پاس کیا۔ مزید انگریزی تعلیم کے لیے شہر اعظم گڑھ کے وِسلی اسکول میں داخلہ لیا۔ اسی دوران یعنی ۱۹۲۹ء میں احتشام کے والد کا انتقال ہو گیا۔ احتشام اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اس لیے ان کے سر پر گھر کی تمام ذمہ داریاں آ گئیں۔ اس سلسلے میں احتشام کے چچا سید ابو محمد عیش نے بڑی مدد کی اور اپنے بھتیجے کی تعلیم مکمل کرانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں وسلی اسکول سے ہائی اسکول اور ۱۹۳۲ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان الہ آباد گورنمنٹ کالج سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اس کے بعد بی-اے کے امتحان میں ۱۹۳۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں اول آنے پر انھیں چنتامنی گھوس گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ پھر اسی یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو) کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر الہ آباد یونیورسٹی کا سب سے بڑا تمغہ (امپریس وکٹوریہ گولڈ جبلی میڈل) عطا کیا گیا۔ مزید براں انھوں نے ایل-ایل-بی میں داخلہ لیا لیکن لکھنو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر ہو جانے پر وکالت کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ وہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۱ء تک لکھنو یونیورسٹی میں معلم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں سید احتشام حسین کو صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے

الہ آباد بلالیا گیا۔ اور آخری وقت تک اسی عہدے پر رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔

احتشام حسین کی شادی ۱۹۴۰ء میں قصبہ نگرام ضلع لکھنو کے سید حسن عسکری صاحب کی چھوٹی صاحب زادی محترمہ ہاشمی بیگم سے ہوئی۔ یہ بھی شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ احتشام صاحب سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے سید جعفر عباس شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین کو ترقی پسند تحریک سے وابستگی طالب علمی کے دوران ہی ہو چکی تھی۔ جو آخری وقت تک برقرار رہی۔ جب وہ ایم۔اے کے طالب علم تھے تبھی سے وہ اس تحریک کے ایک سرگرم رُکن کی حیثیت سے شمار ہونے لگے۔ ترقی پسند مصنفین کی صف میں امتیازی حیثیت رکھنے والے احتشام حسین، اپنی تحریروں اور تقریروں سے اس تحریک پر ہونے والے پے در پے حملوں کا بڑی سنجیدگی، متانت اور پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیتے رہے جس سے ان کا علمی ذوق پروان چڑھا اور ان کی تصنیفی صلاحیتیں چمک اٹھیں۔

انھوں نے طالب علمی کے دوران اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ایک رُکن کی حیثیت سے بہت کام کیا۔ اس فیڈریشن کے ہر اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اسے پُر وقار بنانے میں نئی نئی اسکیم کے تحت دیگر کارکنوں کی ہمت افزائی کرتے رہے۔

بعض ترقی پسند مصنفین کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے بھی ہوتا ہے لیکن احتشام صاحب کا اس سے باقاعدہ تعلق کبھی نہیں رہا۔ بقول سجاد ظہیر ''احتشام حسین کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر کبھی نہیں رہے لیکن ہم ان کو ہمیشہ اپنا سمجھتے رہے''۔ (۱)

احتشام حسین ترقی پسند مصنفین ہونے کے ساتھ ہی پرانی روایات کا ہمیشہ خیال کرتے تھے۔ وہ بے حد سنجیدہ اور سلجھے دماغ کے انسان تھے اور سجاد ظہیر کے قول کے مطابق ''ان کی تہذیب اور شرافت کا معیار غالباً غیر ترقی پسند یا جاگیردارانہ تھا یا شاید اپنے اسی معیار کو وہ ترقی پسند کے مطابق سمجھتے ہوں''۔ (۲)

احتشام حسین اردو تنقید پر بے پناہ درک و بصیرت رکھتے تھے۔ حالؔی نے جس کام کو شروع کیا تھا احتشام نے اسے صرف آگے ہی نہیں بڑھایا بلکہ اس کو ایک نئی راہ عطا کی۔ احتشام صاحب کی تحریروں میں انسان دوستی، شرافت، حب الوطنی، ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا جذبہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تعصب و جہالت کا خاتمہ کرنے اور مساوات و اشتراکیت پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب بھی۔ چنانچہ اگر ان اصولوں کی پابندی کوئی شاعر یا ادیب کرتا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اچھا ادب وہی تھا جسے پڑھنے اور سننے سے قاری اور

۱۔ احتشام حسین اور ترقی پسند تحریک۔ سجاد ظہیر ''آج کل'' احتشام حسین نمبر، اپریل ۱۹۷۳ء۔ ص ۸

۲۔ ایضاً

سامع کے دِلوں میں گرمی پیدا ہو جائے۔

احتشام کے گھر میں علم و ادب سے خاصا لگاؤ تھا۔ دوسرے ان کا خاندان مذہبی قسم کا تھا۔ آئے دن وطن میں ہونے والی مذہبی مجالس میں احتشام نوحے، مراثی پڑھتے اور پرزور تقریریں بھی کرتے تھے۔ مزید بریں بیت بازی اور ادبی نشستوں میں بھی شریک ہوتے تھے کیوں کہ ''جدید علوم اور ادب کے ساتھ احتشام کا مذہب اور خصوصاً اسلام اور تصوف کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا''۔ (۱)

احتشام کے بچپن کے ایک واقعہ پروفیسر اعجاز حسین لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :

''اس قصباتی ماحول میں شعروشاعری، ادب و ادیب پر رائے زنی اس عہد تک معاشرہ کی تفریحی اور علمی دلچسپی کی امتیازی خصوصیت تھی۔ بڑے بوڑھے شام کو جمع ہو جاتے تھے تو منجملہ دیگر موضوعات کے کبھی کسی شعر یا شاعر کے بیان سے گرمی محفل پیدا کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں میر انیسؔ، داغؔ، اور امیرؔ کا کلام پڑھا جاتا اور عہد جدید کے رجحانات پر رائے پیش کی جاتی۔ میرے بچپن میں گھر پر زمینداری کے معاملات کے بعد شعروشاعری کا چرچا رہتا۔ بیت بازی کے دوران احتشام اور ان کے دوسرے دوست میں یہ معاہدہ ہوا کہ ہم لوگ جو باتیں کریں وہ نظم میں ہوں گی۔ چنانچہ یہ عمل کافی دِنوں تک چلتا رہا۔ ایک مرتبہ احتشام کے حریف شہر جا رہے تھے اور احتشام کو کچھ منگانا تھا۔ ایسے موقع پر کوئی شعر موزوں نہ ہو سکا اور احتشام نے یوں کہا ۔

'' نثر میں ایک بات کرنا ہے'' (۲)

یہیں سے احتشام کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ان کو لسانیات اور تنقید سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے لیکن اردو شاعری کی دنیا میں ان کے شعری اکتسابات اہم ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''روشنی کے دریچے'' احتشام اکیڈمی الٰہ آباد سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کے شروع میں چند رُباعیاں ہیں۔ ان میں رباعی کا پورا انداز ملتا ہے اور آخری مصرعہ میں کافی زور پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ ان رباعیوں میں جوانی کی تفسیر مختلف انداز میں کی گئی ہے اور عہد شباب کے حیات آفریں اور حاصل زندگی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش میں بڑی بڑی نکتہ آفرینیوں سے کام لیا گیا ہے۔ ان رباعیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام نے انیسؔ کے اثرات خاص طور سے قبول کئے ہیں۔ ان کی آواز میں انیسؔ کا خیال کروٹیں بدلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ۔

اک روز بڑھاپے میں کماں ہونا ہے　　اور چادرِ خاک میں نہاں ہونا ہے
کس طرح رکھیں دل سے جوانی کو عزیز　　جب مر کے پھر اک بار جواں ہونا ہے

۱؎ احتشام صاحب کا تاثراتی خاکہ۔ ڈاکٹر وحید اختر، ''نیا دور''۔ احتشام نمبر مئی۔ جون ۷۳ء، ص ۶۴

۲؎ احتشام حسین۔ ذہن و کردار کی ابتدائی نشوونما۔ اعجاز حسین، ''آج کل''، احتشام نمبر اپریل ۱۹۷۳، ص ۲۵-۲۶

بے لطف شباب زندگانی کیسی	گرمائے نہ جو دل کو وہ کہانی کیسی
تیزی ہو طبیعت میں تو ہو دل میں امنگ	جو آگ نہ برسائے جوانی کیسی

منجمد کردوں آفتاب کو میں	ٹوٹنے بھی نہ دوں حباب کو میں
جلد آنے کا گر کرو وعدہ	روکوں جاتے ہوئے شباب کو میں

احتشام کی ان رباعیوں میں تفکر بھی ہے اور خیالات کا اچھوتا پن بھی۔ زندگی کے تجربات ومشاہدات کا عکس بھی ہے اور زندگی کی معنویت کا احساس بھی۔ رباعی کا فن بڑھاپے میں نکھرتا ہے اور یہ فن تجُربات ومشاہدات اور زندگی کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ احتشام کی رباعیاں اس خصوصیت کی حامل ہیں۔

احتشام کی ابتدائی غزلیں رومانیت سے بھرپور ہیں۔ انھوں نے ان غزلوں میں وارداتِ قلب کا اظہار کیا ہے اور اس وادیٔ پُرخار میں بربادیوں اور ناکامیوں کا بیان اس طرح کرتے ہیں :

کاٹی ہے انتظار میں مشکل سے شامِ غم	اب آیئے حضور کی تاخیر ہو چکی
جاں دینے پر بھی آپ نہ آئے ہزار حیف	جو اختیار میں تھی وہ تدبیر ہو چکی

کتنی پرپیچ و خطرناک ہے راہِ اُلفت	اس کے ہر ذرے کا ممکن ہے بیاباں ہونا

میرے مرنے کا انتظار نہ تھا	خود سے شانہ ہلا کے دیکھ لیا
بھول جانا انھیں محال سا ہے	ہر طرح سے بھلا کے دیکھ لیا

سیرِ چمن کا ذکر کہاں ان کے بعد سے	میرا تو اب ادھر سے گذرنا محال ہے

احتشام کی غزلوں میں رجائیت کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ وہ صبحِ وطن کی بے رونقی کو محسوس کرتے ہیں مگر شامِ غریباں جیسی بے لطفی سے اس کو محفوظ بتاتے ہیں۔ چوں کہ احتشام کی زندگی بڑے پرپیچ راستوں سے گزر کر منزلِ نشاط تک پہنچی تھی اس لیے وہ زیادہ تر رجائی پسند طبیعت کے مالک رہے۔ سخت ترین حالات میں بھی انھوں نے امید کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پرشوق	بے رونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے
اک یاد بہاریں لیے جاتی ہے اکثر	دل کا چمن اتنا ابھی ویراں تو نہیں ہے

نہ ترا ظلم گیا رائگاں نہ شوق مرا — اسی لہو سے نیا آفتاب ابھرا ہے

نہ جانے ہار ہے یا جیت کیا ہے — غموں پر مسکرانا آ گیا ہے

تیر آلام و حوادث نے چلائے کتنے — جی رہا ہوں ترا غم سینہ سپر ہے کہ نہیں ؟

زندگی اور نئی لگتی ہے دل والوں کو — گرچہ ہر بار وہی لیل و نہار آئے ہیں

وادیٔ شب ہیں اُجالوں کا گزر ہو کہ نہ ہو — دل جلائے رہو پیغامِ سحر آنے تک

احتشام جدیدت سے سخت نالاں تھے۔ وہ جدید رجحانات پر کبھی کبھی برستے بھی تھے۔ انھیں جدید شعراء کی یاسیت، احساسِ تنہائی اور فرد کی اجتماعیت سے دوری پر سخت اعتراض تھا۔ وہ ان باتوں کو مصنوعی سمجھتے تھے۔ انھوں نے فرد کی تنہائی والے رجحان پر اپنی ایک آزاد نظم ''فرد'' میں یوں طنز کیا ہے ۔

دورِ خزاں پر پیڑ نے جھیلا

لطف بہار ہر اک نے اٹھایا

سر جوڑے سب پاس کھڑے ہیں

لیکن پھر بھی اکیلے ہیں

کیا انسان بھی پیڑ ہی ہے ؟

احتشام ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے اندر دردِ قومی پوری طرح سرایت کر چکا تھا۔ وہ اپنے شعری اور فکری میلانات اور رجحانات سے سماجی اور عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ ''نظامِ کہنہ'' کے عنوان سے ان کی قومی نظم کافی مشہور ہے :

ہم نشیں کھٹکی تو ہوگی تجھ کو بھی یہ اک بات — کب سے گھیرے ہے نظامِ کہنہ کی تاریک رات

اس شبِ تاریک کی آغوش میں ہے وہ جہاں — جس جگہ اڑتی ہے عدل و حریت کی دھجیاں

جس جگہ مفلس کھڑے ہیں کارواں در کارواں — حکمراں ہیں جس جگہ زردار کی عیاریاں

جس جگہ قانون کے ڈر سے زباں ہلتی ہے — جس جگہ بیمار مفلس کو دوا ملتی نہیں

اس نظم کے آخری دو شعر میں قوم کے سوتوں کو بیدار کرنے اور نظامِ کہنہ کو مٹانے کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

وقت کی آواز ہے ہم کو ابھرنا چاہئے — اس تضادِ زندگی کو ختم کرنا چاہئے

جس نے روکا ہے ترقی سے یہی زنجیر ہے — اس نظامِ کہنہ کی تخریب بھی تعمیر ہے

احتشام نے جن نظموں میں سیاسی اشارے کیے ہیں وہ وسیع پیانے پر دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ان کی شخصیت کا پرتو پایا جاتا ہے۔ انھوں نے نظم ''سبز رنگ'' میں کچھ سیاسی اشارے اس طرح کیے ہیں ؎

ہاں مگر بانکپن کچھ اور رہی، سبز پرچم کی مرے
زندگی بخش، جواں سال بہاروں کا رنگ
جذبۂ کوہکنی، تیشہ زنی، دل فگنی
سبز پتی نے بہاروں کے جگر کاٹ دیئے
بن کے الماس کبھی اور کبھی خنجر بن کر
بن گیا زہر ستم گر کے لیے
ان پہاڑوں میں صنم گر بھی نہ رہے
سبز ہے رنگ مرا، مرے ارماں کا بہاروں کا رنگ
سبز آغازِ محبوب کا رنگ
اور پھر زہر کا رنگ
مرگ بھی زیست بھی، سب کچھ اسی اڑتے ہوئے سبزے کے تلے۔

احتشام نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے افسانے ڈرامے، سفرنامے، مزاحیہ کہانیاں اور تنقید سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اگر چہ وہ اپنی شاعری پر پوری توجہ نہیں دے سکے مگر پھر بھی ان کی غزلیں، نظمیں اور رباعیاں خاصے کی چیزیں ہیں۔

''بعض شاعروں اور نقادوں کو احتشام صاحب کی شاعری سے اختلاف تھا۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ ''منہ کا مزا بدلنے کے لیے'' شاعری کرتے ہیں۔ جب ان کی شاعری کے بارے میں انھیں چھیڑا جاتا تو وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کا موضوع بدل دیتے لیکن ان پر کی گئی تنقید یا اعتراضات یا چھیڑ چھاڑ کا برا نہ مانتے''۔ (۱)

احتشام حسین یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو ابدی نیند سو گئے مگر انھوں نے ادب پر اپنی شخصیت اور فن کی گہری چھاپ ڈالی ہے۔ اردو والے برسوں تک اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ ●●●

Deptt of Urdu, D.A.V. Degree College, Ausanganj, Varanasi [U.P]

۱؎ پیکر اخلاق و مروت۔ برق آشیانوی۔ ''شاہکار'' بنارس احتشام نمبر۔ نومبر-دسمبر ۱۹۷۳ء۔ ص ۲۲۵

ابوالفیض سحر

مظہر امام کے تنقیدی بیانات پر ایک بیان

''ایک لہر آتی ہوئی'' کے حوالے سے

مظہر امام عصری اُردو ادب کا ایک اہم اور معتبر نام اور تخلیقیت کا باوقار عنوان ہیں۔ یہ ہمارے عہد کے نامور شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ ایک آبرومند کثیر المطالعہ ادب شناس، فکر و خیال کے رمز آشنا پارکھ اور فن پاروں کے باریک بین ناقد بھی ہیں، جن کی نظر میں نئے ادب اور عصری حسیت کے پورے سیاق و سباق، منظر اور پس منظر بھی ہیں اور تخلیقی رو کی رفتار و روش اور جہات بھی۔ مظہر امام، بطور خاص، گزشتہ نصف صدی کے نئے ادبی رویوں اور نئے رجحانات کے مدار و مرکز اور مزاج و کردار، سبھی سے پوری طرح بہرہ مند ہیں، ساتھ ہی تخلیقی سفر کے نشیب و فراز سے بھی پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ آزاد غزل کے ہیئتی تجربے کے سلسلے میں محرک و بانی کی حیثیت سے اور اس تعلق سے دوسرے سلسلوں میں بھی یہ بہت زیر بحث آتے رہے ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ اُردو ادب، نثر و نظم دونوں کے ارتقا اور ارتفاع کے فنی، فکری اور تہذیبی تناظرات میں انھوں نے خود کو بھی بحیثیت فنکار پرکھا اور جانچا ہے۔ اسی کے دوش بدوش، معاصر ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو ٹٹولا، ان کی متاعِ فکر و فن کے سبھی پہلوؤں کا گہرا مطالعہ اور ماہرانہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ ہماری وراثت، ہمارے کلاسیکی ادبی سرمائے سے رشتے، اس کے علاوہ ہیں۔ پھر فکر و فن کی نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کی فکر اور تلاش و جستجو نے انھیں شعری جمالیات کی رمز آشنائیوں کے علاوہ ایک تنقیدی مزاج بھی بخشا ہے جو مہذب، محتاط اور شائستہ ہے مگر حسب تقاضۂ انصاف، بے باک اور بلند آہنگ بھی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بات ایک خاص وصف اور ظرف کی ہے۔ فکر و شعور کی یہی تحسین شناس جامعیت ہے جس کی وجہ سے مظہر امام ہمارے بلند مرتبت دانشوروں کی صف میں جگہ پانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

''ایک لہر آتی ہوئی'' میرے خیال میں ایک خاص ادبی ارتعاش یا تحرک (Literary vibration) کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ ہر چند کہ یہ مظہر امام کے تنقیدی نوعیت کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے مگر دھوپ کا وہ دریچہ بھی ہے جس سے ان کی علمی، ادبی اقدار سے مخصوص قدر شناسی اور معیار بندی کے معیار و مزاج اور رویہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں مختلف اوقات اور مختلف موضوعات پر قلم بند کیے گئے مضامین و مقالات شامل ہیں۔ معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں مباحث کا تنوع بھی ہے اور تحریر کی معنی آفریں شگفتگی بھی۔ پھر مظہر امام کے اندازِ بیان و پیرایۂ

اظہار نے اسے خلقی طور پر جامع اور دلچسپ تو بنایا ہے ہی، ساتھ ہی اس کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ کیا ہے۔

اس مجموعے میں دو مضامین ''بہار میں اُردو افسانہ ۴۶ء کے آس پاس'' اور ''مغربی بنگال میں اُردو شاعری آزادی کے بعد'' بھی شامل ہیں جو نفسِ مضمون کے لحاظ سے علاقائی احاطہ رکھتے ہیں۔ مگر مظہر امام نے ان موضوعات سے بھی انصاف کیا ہے۔ اس سلسلے کے ایک ذیلی تاثر کی صورت میں مظہر امام اپنے اس احساس میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے جید ناقدین محدود علاقائی موضوعات پر وقت ضائع نہیں کرتے۔ دیگر موضوعات بھی اہم ہیں مگر ''اقبال تیسری دنیا کے لیے'' اور ''غالب بے رنگ'' اپنے Scope اور Thought Content کے ساتھ نئے سوالوں اور نئی خیال افروزیوں کے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن میں صرف تنقیدی مباحث سے ہی گفتگو کرتے ہوئے خود کو اسی دائرے تک محدود رکھنا چاہوں گا۔

''آج کا ادیب کتنا ادیب'' میں ایک وسیع تناظر میں مظہر امام نے ادب اور ادیب کے وصفی و خلقی رشتوں کی بات کرتے ہوئے ان مسائل کو بھی چھیڑا ہے جو عصری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> ''میری نسل کے لوگ گزشتہ چالیس سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب کی حسین قدروں کا حسن مشتبہ ہو گیا ہے۔ انسان اپنی عظمت کھوتا جا رہا ہے اور تباہی و بربادی کی طاقتیں سرافراز ہو رہی ہیں۔ نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت نہیں رہی۔ قومی اور بین الاقوامی انتشار نے ایقان و اعتماد کی دیواروں کو متزلزل کر دیا ہے۔ زندگی کی عزیز قدریں فنا ہو چکی ہیں۔ تنگ نظری، جانب داری اور خود غرضی کی بڑی کریہہ صورتیں سامنے ہیں۔ نئی نسل نے تو اسی ماحول اور اسی فضا میں آنکھیں کھولی ہیں''۔

مظہر امام نے نئے ماحول اور نئے سماج میں آدرشوں اور اقدار کے تصادم، ارزانی اور ابتذال کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ایک حساس اور باشعور ادیب اور فنکار کے احساسات و جذبات کی ترجمان ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے عصر حاضر کی ان ستم سامانیوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں کو بجا طور پر غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ایسے مسائل پر، جو عصری زندگی پر گہرے اثرات مرتسم کر رہے ہوں، بے خوف ہو کر بے جھجک اپنے فنکارانہ ردِ عمل کا اظہار کریں۔ میرے خیال میں یہ ادیبوں اور دانشوروں کے مقصدِ حیات اور وظیفۂ حیات کا ہی ایک حصہ ہے جسے موجودہ عہد کے فنکاروں نے تن آسانی اور سہل انگاری، کہیں کہیں موقع پرستی اور کبھی کبھی مصلحت اندیشی کا شکار ہو کر شعوری طور پر طاق پر اٹھا رکھا ہے۔ افلاطون نے اپنے عہد کے ان تن آسان اور سہل نگار ادیبوں اور شاعروں کو جو صرف خیالی جنتوں اور احساس کے Ivory Tower میں ماحول سے بے نیاز و بے فکر اپنے آپ میں مگن رہا کرتے تھے، پھولوں کا تاج پہنا کر شہر بدر کرنے کی بات کہی تھی۔ آج بھی اگر ہمارے سماج میں ادیب و دانشور اپنی ذمہ داریوں

کو محسوس کیے بغیر، اسی رویے سے محض نظریاتی سطح کے تفکر کو ہی بہت کچھ سمجھتے ہوں اور عملی زندگی سے فرار کا رویہ اختیار کرتے ہوں تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ زندگی میں، خاص کر ایک مہذب باشعور معاشرے میں، خیال و فکر کا عمل سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر عمل نہیں تو خیال و فکر کی بھی کوئی قدر نہیں۔ مشقِ سخن کے ساتھ چکّی کی مشقت بھی ادب اور زندگی کا مقصود ہے۔ نامساعد حالات سے یا کسی ناموافق صورتِ حال سے گھبرا کر یا مایوس ہو کر بیٹھ جانا کفر سے کم نہیں۔

فراریت (Escapism) کا رویہ کسی بھی فرد یا جماعت کے لیے خواہ وہ اسے عارضی طور پر اپنی ذات کے لیے کتنا ہی راحت افزا کیوں نہ محسوس کرے، غیر محسوس طریقے پر اس کے لیے فنا اور نابودیت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس لیے زندگی اور درسِ عمل کے مفکر شاعر اقبالؔ نے کہا :

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

''فیض کی تنقیدیں'' کے عنوان سے مظہر امام نے انتقادِ ادب سے متعلق مختلف نکات و مسائل سے دلچسپ بحث کی ہے۔ اس دوران ایک اہم سوال بھی اُٹھایا ہے :

> ''سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اپنے طرزِ احساس، فکری عوامل اور لفظیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہے اُسے پرکھنے کے پیمانے کیا ہوں گے۔ کیا میرؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف پیمانۂ تنقید ہوگا اور غالبؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف۔ کیا ہر دَور کے تنقیدی اصول مختلف ہوتے ہیں؟ اس مسئلے پر بحث ہو سکتی ہے۔ اگر شعر یا نظم ایک قائم بالذات خود کفیل اکائی ہے اور شعر کی باطنی اور نادیدہ کائنات کے سیاحت لسانی تجزیے سے ہی ممکن ہے جیسا کہ ''ہیئتی تنقید'' یا ''نئی تنقید'' ہمیں بتاتی ہے تو پھر تنقیدی اصول زمانے اور وقت کے ساتھ نہیں بدل سکتے۔ ترقی پسند نظریۂ تنقید اس موقف کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے فیضؔ اس نقطۂ نگاہ کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تنقیدی اصول اپنے دَور کے مخصوص معاشی، سیاسی اور سماجی مزاج کو سامنے رکھ کر متعین کیے جاتے ہیں''۔

سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے مگر لگتا ہے مظہر امام خود دامن بچا گئے۔ کوئی حقیقی اور سچا فنکار اپنے فن اور فکر سے خود کو بہت دیر تک علیحدہ نہیں رکھ سکتا۔ مظہر امام کے نقاطِ نظر کو بھی ان کے بیانات اور تحریروں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ویسے تو اس سوال کا جواب بھی جدیدیت اور ترقی پسندی کے زیر بحث اعلانیوں اور عہد ناموں سے علاحدہ نہیں ہے۔ جہاں وقت نے دونوں طرف کی شدّت پسندیوں، بے اعتدالیوں اور غیر فطری اندازِ فکر و اظہار اور ان کے نام نہاد تلازموں کو مسترد

کر دیا ہے وہیں یہ بات بھی واضح کی ہے کہ زندگی ادب سے اور ادب زندگی سے اساسی طور پر مربوط اور منسلک ہے۔ کچھ رجحانات اور رویوں کی بنیاد تبدل پذیر حالات اور ان کے تقاضوں پر بھی قائم ہوسکتی ہے۔ بعض مفروضے اور اعتقادات بھی زندگی کی دیرپا اور دائمی حقیقتوں اور سچائیوں سے مل کر آفاقی قدریں بن جاتے ہیں۔ اس کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے اور اگر اس کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہ تو اسی کلیے کے مطابق اس کا اطلاق ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ویسے ہمارے نئے تنقید نگاروں نے انتقادیات کے دائرے میں خاصی گڑبڑ کی ہے اور کئی زاویے نکالے ہیں اور کئی اُلجھاؤ بھی پیدا کیے ہیں۔ تارِ عنکبوت جیسی باتوں کو بھی دبیز بنانے کی سعی کی ہے۔ غیر ضروری طور پر طرح طرح کے تنقیدی اصول اور طریقہ کار وضع کیے ہیں۔ ہر وضع یا موضوع بحث یا تجزیے کو ایک علیحدہ نام دے کر نئی شاخیں بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے خود تنقید کی اہمیت، ضرورت اور افادیت معرضِ بحث میں آگئی ہے۔ حالانکہ یہ ساری موشگافیاں فن پاروں کی جزئیات کے تجزیے یا جائزے ہی ہیں۔ انھیں علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھیں تو یہ الگ نظر آتی ہیں اور اگر جوڑ کر دیکھیں تو ایک ہی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ بڑی حد تک ایسا ہی ہے جیسے بچوں کے بعض کھلونوں کو، بعض خاکوں کو اور بعض ڈیزائنوں کو مختلف حصوں/ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کو الگ کر کے بکھیر دیا جاتا ہے، پھر ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ دیں تو وہ کھلونا، وہ خاکہ اور وہ ڈیزائن اپنی اصلی صورت میں یکجائی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح اصل تنقید تو سائنٹفک اور معروضی تنقید ہی ہوتی ہے۔ اگر اسے جمالیات سے جوڑیں تو وہ جمالیاتی تنقید کہلاتی ہے۔ تاثرات پر مبنی تنقید کو تاثراتی تنقید کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر اس کو متن سے ہی جوڑ کر دیکھیں تو یہ متنی تنقید ہو جاتی ہے۔ ہیئت اور ہیئت کے مسائل کو زیرِ بحث لائیں تو یہ ہیئتی تنقید بن جاتی ہے، پھر اسی طرح ساختیاتی تنقید وغیرہ وغیرہ۔ مگر غیر ضروری نکتہ سنجیوں کی کوششوں اور ادعائیت سے بچ کر اس طرح کی تقسیم و تخصیص کے عمل کو مربوط انداز میں پیش کرسکیں تو اُلجھاؤ، انتشار اور افراتفری بھی کم ہوسکتی ہے اور پراگندگی اور گمراہی کے امکانات بھی کم سے کم ہوں گے۔ یہ ادب کی ہی نہیں خود انتقادیات کی بھی بڑی خدمت ہوگی۔ مظہر امام کو بھی میں اس خیال کے قریب پاتا ہوں۔ تنقیدی عمل میں ان کا Approach براہِ راست ہوتا ہے۔ گھما پھرا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں سے گزرنا انھیں پسند ہی نہیں۔ رائے بھی صائب اور بڑی حد تک نپی تلی، بات بھی گنجلک نہیں بلکہ شفافیت کے ساتھ دوٹوک اور لب و لہجہ علمی مباحث کے دوران، اظہار و بیان کے دمسازی کی طرح پُروقار اور شائستہ، جس کی ہمیں مظہر امام جیسے صاحب نظر اور ذی فہم فنکار سے امید ہوتی ہے۔

البتہ علمی سطح پر مجھے مظہر امام کے تنقیدی بیانات کے بعض پہلوؤں سے جتنا اتفاق ہے اتنا ہی اختلاف کہیں کہیں ان کے دوسرے نقاطِ نظر سے ہے۔ جیسے اس کتاب کے ان کے دیباچے سے یہ اقتباس :

''وہ تنقید جو ادب سے مسرّت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب کی تنقید کم کم ہے، البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔

ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے۔خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔

- اب ملکِ ادب میں تخلیقی فنکار کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری کی ہوگئی ہے۔تنقید کی آمریت نے تخلیق کار سے آزادی سلب کرلی ہے۔ بدذوقی کو ہوا دی ہے اور قاری کو ادب بدر کر دیا ہے۔ایسے میں اگر کچھ لوگ واقعی ادب لکھ رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔تخلیقی مجبوری اور ان ہی کے دَم سے تخلیقی ادب کا بھرم باقی ہے''۔

یہ اقتباس خود ہی ایک تنقیدی بیان ہے اور مظہر امام کے تنقیدی مزاج اور نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور بڑی حد تک ہمعصر تنقیدی رجحانات اور رویّوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

جہاں تک اتفاق کرنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ آج کے تنقیدی ادب میں واقعی وہ تنقید جو ادب سے مسرت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے، خال خال ہی دکھائی دیتی ہے،لیکن بیان کے اس حصّے سے مجھے کامل اتفاق نہیں کہ یہاں ادب کی تنقید کم کم ہے، البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے مگر ایسی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔ اس کے برخلاف اس کے برعکس رویّے بھی بکثرت ملتے ہیں۔اسی طرح میں یہ بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔ایسا پہلے بھی نہیں ہوا اور آج بھی نہیں ہو رہا ہے۔شاید آئندہ بھی ایسا نہ ہو کیوں کہ تنقیدی شعور ادب کی تخلیق کا پہلی منزل سے لے کر آخری منزل تک معاون ہے، اس کا مخالف نہیں۔کلاسیکی ادب کے فروغ میں قصائد اور ہجو کا دورِ شباب آیا مگر بعد کو نقدِ ادب کے مزاج نے انھیں پسند نہیں کیا۔خواہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو، یہ رویّے مفقود ہونے کی حد تک بدل گئے۔ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں غزل کو نشانۂ ملامت بنایا گیا مگر صحت مند تنقیدی شعور نے اس رویّے کو رد کر دیا۔ پھر غزل نیم وحشی صنفِ سخن نہیں بلکہ اردو شاعری کی آبرو بن گئی اور اسی طرح جدیدیت کی ہماہمی میں ''سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا'' کو بالغ نظر تنقیدی شعور نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے اس طرح کی شاعری کم سے کم ہوتی گئی۔تجریدی افسانے کا بھی یہی حال ہوا، مگر کیا شاعری رُک گئی، کیا افسانہ نگاری ختم ہوگئی؟ نہیں بلکہ جو غلط رویّے اور رجحانات سر اُٹھا رہے تھے وہ ختم ہوگئے۔تنقید کا کام بھی یہی ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔

مظہر امام نے ایک جگہ لکھا ہے :

> ''میں نے اپنا مضمون' آتی جاتی لہریں' ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا جب جدیدیت اپنے پر پرزے نکال رہی تھی۔ میں نے اس مضمون میں جدیدیت کے نام پر روا رکھے جانے والے کئی غلط رویّوں کی نشاندہی کی تھی اور بعض خطرات سے آگاہ کیا تھا جن کی صداقت جلد ہی ثابت ہو گئی ہے''۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی جب کہ مظہر امام کے تنقیدی نوعیت کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''ایک لہر آتی ہوئی'' شائع ہو چکا ہے (۱۹۹۷ء)، ان کے تنقیدی نظریات انہی بنیادوں پر قائم ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اصابتِ فکر اور اعتدالِ مزاج سے ہی تعمیری ادب تخلیق ہوتا ہے۔

مظہر امام کا یہ خیال بھی درست ہے کہ :

''زندگی، نظریۂ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ ادیب کے لیے کسی مخصوص نظریۂ حیات یا فلسفہ یا عقیدہ یا مسلک سے کلی طور پر وابستہ ہونا ضروری نہیں۔ ادب کا تعلق انسان اور حیات انسانی سے ہے اور کوئی بھی ادب غیر انسانی اور رجعت پسند نہیں ہوتا۔ انسانی دوستی، مساوات، عالمگیر برادری، حسن و خیر اور صداقت کے تصورات تخلیقی سرگرمیوں ے خاص محرک ہیں''۔

یہ بات تخلیق اور تنقید دونوں اعتبار سے صحیح ہے۔ دراصل تنقید کا مدعا بھی یہی ہے اور منشا بھی یہی۔

○○○

مظہر امام: جنوری ۲۰۰۳ء سے مارچ ۲۰۰۴ء تک

کتاب

- دستارِ طرح دار (مظہر امام کے فکر وفن کا منظوم جائزہ) ڈاکٹر عبدالمنان طرزی
- مظہر امام: نئی نسل کے پیش رو — ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

انتساب (مظہر امام کے نام)

- اپنی محفل، اپنے دوست (تاثراتی مضامین) — جگن ناتھ آزاد
- خیال آباد (مجموعہ کلام) — عالم خورشید
- ارژنگ (تنقیدی مضامین) — سید احمد شمیم
- احمد سجاد: احوال و آثار — ڈاکٹر مظفر مہدی

کتابوں میں

رشتہ گونگے سفر کا	ڈاکٹر وہاب اشرفی	نکتہ نکتہ تعارف
اقبال کی ایک غزل نما نظم (مظہر امام پر تنقید)	ظہیر غازی پوری	مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو
مظہر امام کی نظم نگاری: تجزیاتی مطالعہ (۵۶ صفحات)	سید احمد شمیم	ارژنگ
نظم: ''تاریخ یہی کہتی ہے'' (مظہر امام کے نام)	محمد سالم	درد کا سفر
مظہر امام: ہمہ جہت شخصیت	رفعت سروش	بہارِ نو بہار
مظہر امام کی تنقیدی بصیرت	رفعت سروش	بہارِ نو بہار
مظہر امام کے شخصی خاکے	رفعت سروش	بہارِ نو بہار

رسالوں میں

رُباعیاں (مظہر امام کے نام)	سلطان اختر	''مباحثہ'' پٹنہ، جنوری
مظہر امام: ہمہ جہت شخصیت	رفعت سروش	''اردو ادب'' دہلی، جنوری، فروری، مارچ
ممتاز اور منفرد شناخت کا شاعر: مظہر امام (انٹرویو)	سلیم صدیقی	''عالمی سہارا'' دہلی، ۳۱/مئی

مظہر امام کی تیس سالہ نظمیہ شاعری کا واضح منظر نامہ	قیصر شمیم	''اخبارِ مشرق'' کلکتہ، یکم جون، ماہ نامہ ''دلّی'' جون
نئے عہد کا ایک معتبر ناقد: ایک تاثر	ڈاکٹر محمد مثنّیٰ	''مشام'' مگدھ یونیورسٹی، گیا ۲۰۰۳ء (اشاعت: جولائی)
ممتاز تخلیق کار: مظہر امام	پریمی رومانی	''تعمیر ہریانہ'' چنڈی گڑھ، اکتوبر
مظہر امام: نئی نسل کے پیش رَو	رضوان احمد	''قومی تنظیم'' پٹنہ، ۳/اکتوبر
کچھ مظہر امام کے بارے میں	نور پرکار	''کویت ٹائمز'' کویت، ۱۷/اکتوبر
شاعر مظہر امام کی پہلی تنقیدی کتاب	جگن ناتھ آزاد	''ترکش'' کلکتہ، اکتوبر تا دسمبر ''افکار'' کراچی، فروری ۲۰۰۴ء
نقدِ شعر: بھنور خواہش	ڈاکٹر ثوبان فاروقی	''تمثیلِ نو'' دربھنگہ، اکتوبر تا دسمبر
مظہر امام کی ایک نظم: ''تمہارے لیے ایک نظم''	زیب غوری (مرحوم)	''گلبن'' لکھنو، نومبر–دسمبر
''تمہارے لیے ایک نظم'': ایک تجزیہ	جمال نویسی	''گلبن'' لکھنو، نومبر–دسمبر
مظہر امام وہ کہ جسے جان و دل کہوں	جگن ناتھ آزاد	''الحمرا'' لاہور، جنوری ۲۰۰۴ء

تبصرے

نگارشاتِ آرزو جلیلی	حقانی القاسمی	''استعارہ'' دہلی، مارچ
نگارشاتِ آرزو جلیلی	پروفیسر رئیس انور	''ہماری زبان'' دہلی، ۲۲ تا ۲۸/جون
مظہر امام: نئے منظر نامے	انور کمال حسینی	''آج کل'' دہلی، جون
مظہر امام: نئے منظر نامے	ڈاکٹر منصور عمر	''تمثیلِ نو'' دربھنگہ، اپریل تا جون
مظہر امام: نئے منظر نامے	احمد کفیل	''ایوانِ اردو'' دہلی، جولائی
دستارِ طرح دار	ڈاکٹر عبید الرحمٰن	''تمثیلِ نو'' دربھنگہ، جولائی تا ستمبر
دستارِ طرح دار	عبد الرافع	''قومی تنظیم'' پٹنہ ۱۱/اکتوبر
مظہر امام: نئی نسل کے پیش رَو	اقبال انصاری	''ہماری زبان'' دہلی، ۲۲ تا ۲۸ ستمبر
مظہر امام: نئے منظر نامے میں	سید احمد شمیم	''وقت'' دھنباد، جنوری ۲۰۰۴ء

عبدالوحید ثاقب

نعت

نازم بہ بختِ خویش کہ دارم پیمبرے
گو در صفاتِ خویش ہم دارد نہ ہمسرے

آں دستگیر و سیّد و سالار و سَروَرے
شکرِ خدا کہ نیستم محتاجِ دیگرے

آں فخرِ انبیا کہ دعاے خلیل بود
عیسیٰ مسیح بود یکے از مبشّرے

آخر ظہور یافت ز پہلوے آمنہ
خورشید و ماہ طلعتے خوش آب گوہرے

گمراہ بود خلق بہ ظلماتِ کفر و شکر
ایزد بہ فضلِ خاص فرستاد رہبرے

روپوش می شوند ہمہ جیش اختراں
طالع چو می شود ز افق شاہِ خاورے

لات و منات و عزیٰ ہمہ سرنگوں شدند
چوں شد بلند نعرۂ اللہ اکبرے

پیغامِ حق رساند بہ مخلوق لا الہ
بُت در سجود رفت و بلرزید بُت گرے

بر اوجِ ذلت او نرسد آگہی کہ فکر
مرغے است دُم بریدہ و بے بال و بے پَرے

اصحابی کالنجوم کہ ارشادِ مصطفاست
از بہرِ ماست ہر یکے تابندہ اخترے

اے مرکزِ وجودِ جہاں ذاتِ پاکِ تو
عرض است این جہان و توئی ہمچو رہبرے

گر تو مرا بہ لطف نخوانی کجا روم؟
ناکام و نامراد بگشتم ز ہر درے

تو در گلیمِ خویش بپوشی خطاے من
رسواے خلق تا نشوم روزِ محشرے

از تابِ آفتابِ قیامت چہ غم کنم
ظلِ نبی است بر سرِ ما سایہ گسترے

در حسرتم کہ گنبدِ خضریٰ چساں رسم؟
بے زادِ راہ دارم و نے کیسۂ زرے

آنجا کہ رفتہ ای نپرد طائرِ خرد
جبریل ہم بماند و بیفگند شہ پرے

نازم اگر بخوانی دمِ تشنگی بہ حشر
ثاقب بیا بگیر بدست جامِ کوثرے

○

پروفیسر حنیف نقوی

تضمین بر غزلِ نعتیۂ غالب

بے چونیِ صفات ز آنِ محمدؐ است　　برتر ز درکِ واہمہ شانِ محمدؐ است
عین الیقیں عیاں ز گمانِ محمدؐ است　　حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

روشن ہو تیری آنکھ تو اٹھ جائے ہر نقاب　　ہر چیز سے ہو جلوہ حقیقت کا بے نقاب
بن جائے تیرے واسطے یہ نکتہ اک کتاب　　آئینہ دارِ پرتوِ مہر است آفتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

مختارِ دو جہاں ہے خدائے بلند و پست　　یہ کائنات ازل سے اسی کے ہے زیرِ دست
قائم اسی کی ذات سے سارا یہ بندوبست　　تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

ہے مقتضائے دینِ ہُدیٰ مصطفیٰ رسی　　ہے اصلِ حق یہی، یہی عینِ خدا رسی
حائل ہے تیری راہ میں خود تیری نارسی　　دانی اگر بہ معنیِ لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است از آنِ محمدؐ است

بے کار ہے یہ تذکرہ حوروں کا بار بار　　خوش قامتی کا ان کی ہو کیا ہم کو اعتبار
کیا بات کا صنوبر و شمشاد کی وقار　　واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار
ایں جا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

مٹھی میں سنگریزوں نے کلمہ کبھی پڑھا　　سورج اشارہ پا کے کبھی واپس آ گیا
مطلوب ہو جو اس سے بڑا اور معجزا　　بنگر دو نیم گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است

ہمت ہزار بار بہ وصفش گماشتیم　　معلوم شد کہ تابِ ستائش نہ داشتیم
ایں منقطع آخرش سرِ کاغذ نگاشتیم　　غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

D50/250-A. Hakim Jafar Road, Dalmandi, Varanasi (U.P)

گنج پنہاں

غزل فارسی از نتائجِ فکر منشی محمد شاکر حسین مرحوم نکہتؔ سہسوانی

ولادت: رام پور، ۲۹/ جون ۱۸۷۱ء - وفات: سہسوان ضلع بدایوں، ۲۳/ دسمبر ۱۹۵۲ء

ز دودِ آہ کہ از قلبِ ناتواں برخاست
بہ بزمِ شعلہ رخاں شورِ الاماں برخاست

کجاست چشمِ غضب، نیست گر نگاہِ کرم
مگر کہ رسمِ جفا نیز از جہاں برخاست

ز دودِ رنگِ کدورت ز خاطرش آہم
نشست گردِ غم و پردہ از میاں برخاست

منارہاست کہ در وادیٔ طلب بستند
غبار نیست کہ از پائے رہرواں برخاست

زہے مآل کہ در جلوہ گاہِ عشق دلم
نشست لرزہ براندام و شاداں برخاست

کرا دماغ کہ خیزد بہ سیرِ جلوۂ طور
خوشم بہ شعلہ کہ از سوزِ استخواں برخاست

بہ خارزارِ محبت دمید لالہ و گل
زسیلِ اشک کہ از چشمِ خوں چکاں برخاست

بیار بادہ کہ از سرد مہریٔ یاراں
بہ گوشہ گوشۂ دل یادِ مہرگاں برخاست

تواضعے کہ بہ مے خانہ می تواں، کردیم
چرا ز صحبتِ ما شیخ سرگراں برخاست

ز طبعِ نازکِ عاشق دمے مباش ایمن
کہ باز رخ نکند چوں ز آستاں برخاست

شود چہ شاد بہ مرگِ عدو دلم نکہتؔ
کہ لطفِ جوشِ رقابت ز درمیاں برخاست

◉

مرسلہ:- پروفیسر حنیف نقوی بنارس

عابدامام زیدی

غزل

دوائے دردمنداں می فروشم — بمن آیید درماں می فروشم

بگیر از من چہ ارزاں می فروشم — بیک جو علم و عرفاں می فروشم

من از تاراجِ گلشن نالم — بسے گلہائے خنداں می فروشم

بیا با ابر من تا کے نشینی — کہ من انوارِ یزداں می فروشم

منم آئینۂ حسنِ دل افروز — متاعِ چشمِ حیراں می فروشم

فقیہانِ حرم چیں بر جبیں اند — برائے کفر ایماں می فروشم

ندارم ہیچ جنسی سود مندی — نواہائے پریشاں می فروشم

خذف چینم کنارِ آبجوئے — ولے دُرہائے عُمّاں می فروشم

بفلسے میدہم تریاقِ عابدؔ
بکاہے آبِ حیواں می فروشم

Abid Imam Zaidi
705, Sharaf Appt.
Maulana Mazharul Haq Road,
(Old Fraser Road) Patna - 800001

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

سرِ تابوتِ مادر

هزار و چار صد با بیست و چار[1] — ز سالِ هجرتِ وخشور[2] اکرم
به ماه شش[3]، به روز بیست و نُه — ز تلفن حالِ مادر باز جستم
پس از صبحانه بیهوش است امروز — رسید آوازِ محزونی به گوشم
برفتم از علی گر با اتوبوس — رسیدم شامگه در زاد بوم[4]

به آن شهری که پیش از نیم قرنی
نخستین بار چشم را گشودم

در آن خانه که در آغوش مادر — گهی گریان و گاهی خنده بر لب
همی خوردم زلالِ زندگانی — به صبح و شام وهم در روز و شب
گهی بوسیدی او لبهای نازم — گهی لب را نهادی روی عنغب
نشاندی گاه بر روی زمینم — گهی افراشتی چون ماه نخشب

چو فرزندِ نخستین بودم او را
مرا پنداشتی فخرِ جد و اب

در آن منزل که مام مهربانم — به طفلی ام سخن گفتن بیاموخت
چگونه آب نوشم داد تعلیم — غذا را شیوهٔ خوردن بیاموخت
گرفت انگشت من محکم بدستش — مرا، استادن و رفتن بیاموخت
ز شادی و ز غم آگاهیم داد — وجوهِ خنده و شیون بیاموخت

خبرهایم ز مکرِ جامعه داد
تمیز رهبر و رهزن بیاموخت

در آن منزل که تا هنگام رُشدم — بسر بُردم به امن و راحت ایام
ز تاثیر دعای مام و بابا — گرفتم یاد دانشهای اسلام
کلام الله را ازبر نمودم — تلاوتها بکردم صبح تا شام

نوشته های سعدی را بخواندم | گرفتم هم ز شعرِ حافظ الهام

سرودم شعرهای عارفانه

چو عطار و چو رومی نکو نام

همان منزل، همان جا بود لاکن | دگرگون گشته آن اوضاع و احوال

به تختِ خواب دیدم مادرم را | به حالِ سکته و گردیده بی حال

نشسته گردش اهلِ خانواده | فسرده خاطر و بشکسته آمال

پزشکی از پس ساعت دو ساعت | زدی تزریق تا گرداندش قال

عزیزان طولِ شب قرآن خواندند

نیامد هیچ گونه راستش فال

بالآخر روزگارِ، آن عفیفه | به وقتِ صبح آدینه سر آمد

ز قالب روحِ پاک او سرانجام | به امرِ خالق عالم بر آمد

مبارکباد گفتند اهلِ افلاک | که بیرون از جهان پُر شر آمد

صدا پیچید در سکانِ جنت | خوش آمد، نیک آمد، بهتر آمد

فرا تر از حدود وقت و آوان

به دار الخلدِ ربّ اکبر آمد

به پرواز آمده روحِ نجیبش | فراتر از فضای آسمانی

از این دنیای پُر رنج و محن رفت | نصیبش شد نعیمِ جاودانی

ولی پس ماندگان را ماند بر جا | غم قلبی و اندوهِ روانی

نه مامِ مهربان را دادم از دست | که گم کردم نشاطِ زندگانی

سه سال و نیم پس از فوتِ بابا [۵]

شده مادر هم اکنون آن جهانی

آیا مادر ! آیا مادر ! کجایی | چسان گویم به تو غمهای جان را

چه بودی گر که سالی چند دیگر | نمی پرداختی بزمِ جهان را

همی دیدی غمِ فرزند و پیوند | همی پرسیدی وضعِ خاندان را

رئیسِ کودکی را پروریدی بدیدی حالِ این پورِ جوان را

ندیدی وای! در آغازِ پیری

چسان دارد بہ لب آہ و فغان را

الم ہای یتیمی با لیسیری شنودہ بودم، اکنون حس نمودم

نمی داند کسی غیر از خداوند چہ ہا رفتہ بہ دل زین حادثاتم

کجا وقتی کہ گشتہ سخت بیتاب سراپا گوش می بودی بہ حرفم

کجا ایندم کہ بستہ چشم و گوشت نمی دانی کہ گریم یا کہ خندم

کجا بینم ازین پس روی پاکت

پس از مُردن مگر در خُلد بینم

ھمی در سینہ دارم آرزویش ھمی دارم امید از فضلِ داور

بہ یُمن پای تو آیم بہ جنت کہ معلوم است از قولِ پیمبر

کہ دربِ خوبی از جنت پدر ھست کہ جنت ھست زیرِ پای مادر

ازین پس عمرہا باشد زبانہا بہ یادت با دعای مغفرت تر

بگیر اکنون سلامِ الوداعی

بہ امیدِ لقای روزِ محشر

○

---

۱ ۱۴۲۴ھ

۲ وخشور = رسول، پیغامبر

۳ ماہ شش = جمادی الثانیہ

۴ کانٹھ (مرادآباد)

۵ شاعر کے والد کا انتقال مارچ ۲۰۰۰ء میں ہوا تھا۔ شاعر کی والدہ کا انتقال جمعہ ۲۹؍ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ-۲۹/ اگست ۲۰۰۳ء کو صبح ۶ بج کر ۴۵ منٹ پر ہوا تھا۔

House No. 4/118A, Loko Colony (Nai Abadi), Aligarh - 2002002 (U.P)

مرزا دبیر اور اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ اشعار

جناب عابد امام زیدی سے دستیاب شہر عظیم آباد کے بارے میں مرزا دبیر مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ رباعی اور 'رشتہ دار' کے عنوان سے اکبر الہ آبادی کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ موصوف کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہے۔ مدیر

عظیم آباد

این جاست کہ خاطرِ غریباں شادست
معمورۂ عِلم و حِلم و فضل و دادست
ہر فردِ بشر دفترِ خُلق است دبیرؔ
این شہرِ پُر اخلاقِ عظیم آبادست

○

رشتہ دار

جو دُور ہوں تو جدائی سے آہ آہ کریں
جو مل کے بیٹھیں تو کم بخت زہر اُگلنے لگیں
عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
جو دور ہوں تو دھواں دیں جو پاس ہوں تو جلیں

○

باقر مہدی

'بام' کا زلزلہ

یہ آنسو بے سبب بہتے نہیں ہیں
انھیں تم صرف پانی کہہ کے مت ٹالو !
بہت سے زلزلے آئے مگر — 'بام'
پر آفت — ہمارے دل ہلا کر
آنسوؤں کا سیل بن کر بہہ رہا ہے !

(۲)

ہزاروں بے سہارا لوگ
یوں بھی مرنے والے تھے
مگر زمیں کے ٹکڑے ٹکڑے ان کے جسموں کو
کیسا کفن دیں گے ؟
وہ مٹی ہی کے پتلے تھے
انھیں مٹی نے ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں بخشا
در و دیوار کی مٹی نے کھا ڈالا
جسے ہم زلزلہ کہتے ہیں
آخر وہ بھی زمیں کو چاک کرتا ہے
اس طرح مٹی کو مٹی سے ملاتا ہے
ہمارے اشک بہنے دو
کہ غم ہر گام پہ رگ رگ میں سمایا تھا
ہمیں یہ علم تھا کہ ہماری ابتدا اور انتہا — دونوں میں غم ہے
ابھی کچھ روز تک رونے کی مہلت زندگی نے دی ہے
ہمارے آنسوؤں کے سیل بہنے دو
کہ شاید کچھ سکوں مل جائے
میرے دیدۂ بینا کو آخری لمحے

Ravi Darshan, Bandra (E), Mumbai - 50

باقر مہدی

ایک نوحہ

(حضرت نجم آفندی کے نام)

عاشور کی شام اندھیارا تھا ہلکی سی شفق کی لالی تھی
شبیر نے جیون دان دیا پھر بھی سب کی پامالی تھی

حُر چھوڑ کے ساری دنیا کو آیا تھا حسینی لشکر میں
بولے تھے امامِ وقت مگر یہ پہلی خیر سگالی تھی

عباسِ دلاور جاتے تھے تنہا تھے علَم کے سایے میں
اک نقش دوامی چھوڑ گئے پیاسے کی زباں گو خالی تھی

اکبر کے دمکتے چہرے پر اک نور کا ہالا رہتا تھا
سینے میں تڑپ تھی مرنے کی سج دھج تو دیکھنے والی تھی

جلتے ہوئے خیمے سے بھاگی ننھی سی سکینہ میداں کو
زینب تو اکیلی تھی لیکن گھر بھر کی وہی رکھوالی تھی

سجاد کو زندہ رہنا تھا پیغامِ حسینی کی خاطر
قریے قریے شہروں شہروں شاعر کی روح سوالی تھی

گھر گھر میں سبیلیں لگتی تھیں ماتم کی صدائیں آتی تھیں
اشکوں کے چراغوں میں ڈوبی ہر صورت پیلی کالی تھی

کل نجم کے نوحے پڑھتے تھے سب ہندو مسلم روتے تھے
باقر کے زمانے تک آکر اخلاص سے دنیا خالی تھی

○

علامہ جمیل مظہری

ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

(۱)

میں ہوں مسیحِ سخن عیسیٰ زمانِ سخن — میں نبض دانِ معانی مزاج دانِ سخن
ہے مجھ سے پیکر لفظ و بیاں میں جانِ سخن — ہے سجدہ گاہِ خرد میرا آستانِ سخن

غرور دانش و تقویٰ کا توڑتا ہوں میں
کہ پتھروں سے بھی پانی نچوڑتا ہوں میں

(۲)

نہ پوچھ میرے تخیل کی حد کہاں تک ہے — وہ خاک ہوں کہ پہنچ جس کی آسماں تک ہے
مری خودی کی نظر گاہ لا مکاں تک ہے — دراز دستِ جنوں شاخِ کہکشاں تک ہے

کہ سطحِ نطقِ جہاں سے قریب لا کے اسے
ستارے توڑ رہا ہوں جھکا جھکا کے اسے

(۳)

سخن کے ہم ہیں مدبّر سخن ہمارا ہے — ہمیں نے گیسوے الہام کو سنوارا ہے
یہ مرثیہ نہیں طوفاں کا استعارا ہے — یہ بیت بحرِ تجلّی کا ایک دھارا ہے

مرا سفینہ کہ ہے تیز ماہ و اختر سے
لبِ فرات تک آے گا بہہ کے کوثر سے

(۴)

سلام اے مری کشتی کے ناخدا ساقی — مئے محبتِ پیرِ مغاں لنڈھا ساقی
ہے تو منازلِ عرفاں کا رہنما ساقی — مرے دماغ کو اپنا سُبو بنا ساقی

یہ ولولہ ہے تصدق ترے فسانے کا
میں پی رہا ہوں مگر شوق ہے پلانے کا

(۵)

اُنڈیل اتنی کہ سب کو چھکا چھکا کے پلاؤں   جو تشنہ کام ہیں اُن کو بُلا بُلا کے پلاؤں
جگا جگا کے پلاؤں، اُٹھا اُٹھا کے پلاؤں   کبھی حرم میں کبھی بت کدے میں جا کے پلاؤں

بڑھا دے کیف مرے جذبۂ عوامی کا
کہ تجھ پہ قرض ہے دنیا کی تشنہ کامی کا

(۶)

کھلا ہے در ترا کیوں تشنگی بھٹکتی ہے   ہر اک نگاہ سے اک سرخوشی ٹپکتی ہے
صراحی میری مئے نور سے چمکتی ہے   مرے پیالوں سے تیری عطا چھلکتی ہے

دلوں کی پیاس بجھائے مرا بیاں ساقی
ترے کرم سے یہ دریا رہے رواں ساقی

(۷)

ترے کرم سے دریچے ہوئے ہیں ذہن کے باز   ترے کرم سے تخیل ہیں آسماں پرواز
زبانِ اہلِ سخن تیرا بولتا اعجاز   حریفِ بلبلِ سدرہ ہے بلبلِ شیراز

ملی جو تیری نیابت انیسؔ و غالبؔ کو
نیا سُرور ملا بادۂ مطالب کو

(۸)

مرا یہ جوشِ سخن مستئ شرابِ طہور   مری کشادہ دلی اس کی برکتوں کا ظہور
ترے کرم سے ملا مجھ کو اک لطیف شعور   اک انبساطِ خودی ایک تندرست غرور

مئے خرد میں مئے عشق گھول دی تو نے
یہ جام دے کے مری آنکھ کھول دی تو نے

(۹)

مئے سُرور سے چھلکے نہ کیوں ایاغ اپنا   سوادِ منزلِ سدرہ میں ہے دماغ اپنا
مری جلو میں ہے سورج لیے چراغ اپنا   دکھا رہا ہے مجھے خُلد سبز باغ اپنا

مگر نگاہ مری ما سوا کو کیا دیکھے
خدا ہے دل میں تو عرشِ خدا کو کیا دیکھے

(۱۰)

جو نشے میں سرِ منبر یہ مدح خواں پہنچا — تو غُل ہوا مہ و انجم کا کارواں پہونچا
زمیں کی خاک تھا بالائے آسماں پہونچا — بہ فیضِ صاحبِ معراج میں کہاں پہونچا
جہاں سے عرش کے تارے دکھائی دیتے ہیں
تجلیوں کے اشارے دکھائی دیتے ہیں

(۱۱)

میں دیکھتا ہوں کہ فطرت بدل رہی ہے نقاب — ہے تیرگی بھی حجاب اور روشنی بھی حجاب
میں دیکھتا ہوں کہ دریا بھی بن رہا ہے سراب — میں دیکھتا ہوں کہ جگنو سے دور ہے مہتاب
مری نظر میں ہے ربط آفتاب و شبنم کا
میں دیکھتا ہوں ہبوط و صعود آدم کا

(۱۲)

میں دیکھتا ہوں سمندر کھنگالتا ہے کوئی — کمند اپنی ستاروں پہ ڈالتا ہے کوئی
قدم حدود سے باہر نکالتا ہے کوئی — خود اپنے پاوں کی زنجیر ڈھالتا ہے کوئی
خودی جو اپنے لیے آئینے بناتی ہے
تو وحدت اس کے لڑکپن پہ مسکراتی ہے

(۱۳)

میں دیکھتا ہوں تقاضاے ادعاے ظہور — میں دیکھتا ہوں تماشاے انکسار غرور
میں دیکھتا ہوں کہ طوفاں اُگل رہا ہے تنور — میں دیکھتا ہوں کہ شعلہ فشاں ہے سینۂ طور
میں دیکھتا ہوں کہ روشن چراغ یزداں ہے
اور اس کے سوز میں آتشکدہ فروزاں ہے

(۱۴)

میں دیکھتا ہوں کہ جو دھیان میں تھا زیر شجر — اٹھا ہے فطرت انساں کا رہنما بن کر
میں دیکھتا ہوں کہ اک نئے نواز روح بشر — بجا رہا ہے لڑائی کا سنکھ بھی یکسر
میں دیکھتا ہوں کہ سولی پہ چڑھ رہا ہے کوئی
صلیب اٹھائے سوے دار بڑھ رہا ہے کوئی

(۱۵)

میں دیکھتا ہوں کہ سُلگا ہے سینۂ فاراں　　اور اُس کی کوکھ سے اک آفتاب ہے تاباں
میں دیکھتا ہوں کہ وہ آفتاب ہے پنہاں　　بھٹک رہی ہے اندھیرے میں قسمتِ انساں
ہے ماہتاب کے سینے میں اُس کی ضَو لیکن
کروڑوں آنکھوں میں بینا ہیں چند سَو لیکن

(۱۶)

بہتّر اُن میں جو ظاہر دکھائی دیتے ہیں　　تو کربلا کے مناظر دکھائی دیتے ہیں
رہِ وفا کے مسافر دکھائی دیتے ہیں　　حبیب ابن مظاہر دکھائی دیتے ہیں
کھلا ہے دیدۂ احساس دیکھتا ہوں میں
شکوہِ حضرتِ عباسؑ دیکھتا ہوں میں

(۱۷)

میں دیکھتا ہوں کہ ہے پشت بارِ فرض سے خَم　　کہ اس پہ مشکِ سکینہ ہے ہاتھ میں ہے عَلم
جو نہر پر متحرک ہَوا سے ہے پرچم　　تو دیکھتے ہیں پھریرے کی شان اہلِ حرم
سکینہ خوش ہے کہ میرے چچا اب آتے ہیں
مرے لیے جو بھری ہے وہ مشک لاتے ہیں

(۱۸)

میں دیکھتا ہوں کہ جھکتا ہے دینِ حق کا نشاں　　کہ گر رہی ہے چھدی مشک، گر رہا ہے جواں
جری کے دستِ بُریدہ زمیں پہ ہیں جو تپاں　　اٹھا رہی ہیں اُنھیں چوم کر حسینؑ کی ماں
حسینؑ آتے ہیں چہرے پہ خاک ڈالے ہوے
ہے نوجوان پسر باپ کو سنبھالے ہوے

(۱۹)

میں دیکھتا ہوں کہ شہزادۂ علی اکبر　　زمینِ گرم پہ لیٹے ہیں کھاکے زخمِ تبر
مقامِ شکر میں ہے سرنگوں ضعیف پدر　　اور اس کے بعد ہے منظر اک اور پیشِ نظر
کہ باپ کھودتا ہے طفلِ شیر خوار کی قبر
عرب کی غیرتِ قومی کے اعتبار کی قبر

(۲۰)

میں دیکھتا ہوں کہ مقتل میں بعد دفنِ پسر کھڑا ہے مالکِ مُلکِ رضا جھکائے سر
ہے اک قدم سوئے خیمہ تو اک قدم ہے اُدھر نظر جو دور پہ آتی ہے تربتِ اصغرؑ
رباب خیمے سے سینہ تپاں نکلتی ہیں
اب آنکھیں موند لو سیدانیاں نکلتی ہیں

(۲۱)

بس اب مجاہدِ صبر و رضا جلال میں ہے امامِ مسلکِ کرب و بلا جلال میں ہے
مسیحِ امتِ خیر الوریٰ جلال میں ہے امینِ مرضیٔ ربِ علا جلال میں ہے
دلیلِ نصرتِ حق بے نیام ہوتی ہے
خدا کی آخری حجت تمام ہوتی ہے

(۲۲)

بدل گیا ہے جو موسم نئی بہار ہے اب فضائے کرب و بلا صحنِ لالہ زار ہے اب
زمیں سے تا بہ فلک ایک خلفشار ہے اب خلا سے تا بہ خلا عالمِ غبار ہے اب
جو چل رہی ہے زمانے کی سانس رُک رُک کے
فرشتے دیکھ رہے ہیں زمیں کو جھک جھک کے

(۲۳)

ادھر سے جاتے ہیں کفار ہاتھ مَل مَل کے زبانِ شعلۂ تیغِ دوسر سے جَل جَل کے
سرکتے جاتے ہیں بادل سیاہ کے دَل کے یہ کہہ رہا ہے مگر آفتاب ڈھل ڈھل کے
کہ حق کی کار روائی کا وقت آ پہونچا
حضور وعدہ وفائی کا وقت آ پہونچا

(۲۴)

اشارہ پا کے ہوا مائلِ نیاز جلال رکی جو تیغِ دو پیکر ہوئے حضور نڈھال
جو ڈگمگانے لگے تھام لی فرس کی ایال بس اب زبانِ ادب کیا بیاں کرے احوال
عرق تھکن کا جبینِ ستم پہ آتا ہے
وہ اپنا آخری حربہ بھی آزماتا ہے

(۲۵)

یہ وقت وہ ہے کہ اے حاضرینِ بزمِ عزا — جھکے ہیں سجدۂ آخر میں سید الشہدا
چھری قفا پہ ہے دیجے رسول کو پُرسا — سلام آپ پہ ہو اے شفیعِ روزِ جزا

یہ مرحلہ کہ مشیت کا ایک جبر بھی ہے
مقامِ فخر بھی ہے اور مقامِ صبر بھی ہے

(۲۶)

سلام آپ پہ اے مظہرِ فیوضِ عمیم — سلام آپ پہ اے رحمتِ خدائے علیم
کیا ہے آپ کے لختِ جگر نے کارِ عظیم — جو نسلِ آدمِ اول پہ تھا از عہدِ قدیم

ہوا وہ قرض ادا قصہ مختصر حضرت
بلند ہو گیا انسانیت کا سر حضرت

(۲۷)

حضور آپ کی عترت نے جو مہم سر کی — وہی کمائی ہے اس ملتِ بد اختر کی
نواسیوں نے بھی دی بھینٹ اپنی چادر کی — وہ پشت اٹھ نہ سکی جس سے لاش اکبر کی

اٹھایا امتِ عاصی کا بارِ قرض اس نے
چکائے آپ کی شفقت کے سارے قرض اس نے

(۲۸)

علَم حضور کا ٹھنڈا ہوا بہ وقتِ زوال — بلند ملتِ حق کا ستارۂ اقبال
خوشا سیاست دینی کا منتہائے کمال — نماز ہی میں ہوا ذبح فاطمہ کا لال

ردائیں پھینک کے دو دن کی پیاسیاں نکلیں
حرم سے آپ کی دونوں نواسیاں نکلیں

(۲۹)

یہ سانحے ہوئے بیشک مگر ہمارے لیے — تباہ ہو گیا حضرت کا گھر ہمارے لیے
شہیدِ حق کا تھا نیزے پہ سر ہمارے لیے — ہے ریش خون سے اصغر کے تر ہمارے لیے

مگر حسین سے ہم نے وفا نہ کی حضرت
کہ پیرویٔ امامِ ہدا نہ کی حضرت

(۳۰)

ہم اور آپ کو دیں کس زبان سے پُرسا　　　　کہ ہم سے اجرِ رسالت بھی ہو سکا نہ اَدا
ہم اُمتی ہیں بہت آپ سے خجل مولا　　　　بہت حقیر سہی آنسوؤں کا یہ تحفا
مگر قبول ہو یہ تعزیت نواسے کی
قبول رسمِ عزا کربلا کے پیاسے کی

(۳۱)

بس اب کہ ختم پہ یہ مرثیہ ہے اہلِ وِلا　　　　پھرا کے رُخ سوے درگاہِ سید الشہدا
کہو زبانِ تاسف سے باصد آہ و بکا　　　　سلام تجھ پہ ہو اے وارثِ خلیلِ خدا
سلام تجھ پہ ہو اے افتخارِ نسلِ ذبیح
سلام تجھ پہ ہو اے ناشرِ پیامِ مسیح

(۳۲)

تاثرات کا اعجاز تیری قربانی　　　　کہ برف شعلہ بنی آگ ہو گئی پانی
مگر نہ زندہ ہوئی غیرتِ مسلمانی　　　　محرّم آج اسی کی ہے فاتحہ خوانی
یہ ہم تجھے نہیں روتے ہیں اس کو روتے ہیں
جو دھبے دامنِ دیں پر ہیں ان کو دھوتے ہیں

◉ مرسلہ : پروفیسر ثریا جمال مظہری، پٹنہ

توجہ

۱۔ قلمکار حضرات سے گزارش ہے کہ تحریریں صاف وخوشخط بھیجیں۔ زیراکس کاپی بھیجنے کے بجائے اصل بھیجیں اور زیراکس اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ ۲۔ جب تک مضامین کی عدم اشاعت کی اطلاع نہ دی جائے اُس وقت تک کسی اور جگہ اشاعت کے لئے نہ بھیجیں۔ ۳۔ نمونے کی کاپی اور جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ بھیجیں۔ ۴۔ تخلیقات اور مضامین اس پتے پر بھیجیں :-
ڈاکٹر سید حسن عباس، شعبۂ فارسی ۔ فیکلٹی آف آرٹس ۔ بنارس ہندو یونیورسٹی ۔ وارانسی - ۲۲۱۰۰۵

نقی احمد ارشاد

مرثیہ

دراحوالِ امام حسینؑ ، امام زین العابدینؑ اور اَسیرانِ کربلا

(۱)

کربلا تیرے شہیدوں، ترے مشہد کو سلام   ہر شہیدِ رہِ معبود کے مَرقد کو سلام
کاروانِ رہِ حق، منزلِ مقصد کو سلام   کفر و ایمان کی اِس آخری سرحد کو سلام
کربلا، پھر تجھے دیکھا نہ کہیں عالَم میں
درسِ ادراک نہ کیونکر ہو ہمارے غم میں

(۲)

اے حسین ابن علیؑ تجھ پہ ہو اُمت کا سلام   حشر تک رہ گیا باقی، ترے دَم سے اسلام
انبیا سے نہ جہاں میں جو ہوا کام انجام   تو نے اُس کام کو دنیا میں کیا آ کے تمام
تیرے ہی دَم سے پیمبر بھی خدا بھی باقی
نامِ اسلام بھی ہے، نامِ وفا بھی باقی

(۳)

تو نے جو کام کیا تا دَمِ آخر شبّیرؑ   صورتِ مہرِ جبیں پھیلی ہے اُس کی تنویر
نت نیا طرزِ عمل ہائے ری تیری تدبیر   تیرے اَوصاف کو سب کرتے ہیں دل سے تحریر
مثلِ دریا نہ روانی میں کبھی رُکتے ہیں
تیرا نام آتے ہی سجدے میں قلم جھکتے ہیں

(۴)

جب نبیؐ اُٹھ گئے کیا آل نبیؐ پر گزری   کون واقف نہیں، کیا حق کے ولی پر گزری
باغِ دنیا میں ستم دیدہ کلی پر گزری   کیسی ساعت، حرمِ لَمْ یَزَلی پر گزری
فکر تھی نور کو ظلمت سے ہٹا دینے کی
کوششیں تھیں انہی شمعوں کو بجھا دینے کی

(۵)

کوئی والی نہ تھا اسلام کا جز ذاتِ حسینؑ یادگارِ شہ لولاک و شہ بدر و حنین
بچ رہا تھا یہی بس فاطمہؑ کا نورِ عین نہ دیا دشمنِ اسلام نے اس کو بھی چین
صرف دنیا طلبی بھول کے عقبیٰ کو رہی
کر دیں اس شمع کو گل فکر یہ اعدا کو رہی

(۶)

شام تھا آلِ اُمیہ کی حکومت کا مقام جس کا معلوم عرب میں تھا خیالِ اسلام
کس سے مخفی ہے ابوذرؓ کا جہاں میں انجام چاہتی تھی کہ کرے دینِ الٰہی کو تمام
ذلتیں اپنی شکستوں کی نہ یہ بھولی تھی
دولت و فوج پہ نخوت کی کلی پھولی تھی

(۷)

دولتِ نَو نے بدل ڈالا تھا تاریخ کا باب وہ نمازیں تھیں نہ روزے تھے فقط ذکرِ شباب
یوں سرک آئی تھی تہذیب کے چہرے سے نقاب حاکمِ وقت کو بھاتا تھا فقط چنگ و رباب
جو ہوں مذہب کے منافی وہی تدبیریں تھیں
کر دیں گمراہ خطیبوں کی وہ تقریریں تھیں

(۸)

شمع اسلام پہ غالب تھی سیاہی شب کی ہر طرف پردۂ اسلام میں تھی دیں شکنی
اک نئے عہد کی تعمیر میں تھا شرکِ جلی کوئی اسلام کا پُرساں نہ تھا جز آلِ نبیؐ
کفر کے سانچے میں تہذیب ڈھلی جاتی تھی
ایک تھی شمع فقط جس کی ضیا آتی تھی

(۹)

آخر اس شمع کو اعدا نے بجھا کر چھوڑا زعم میں اپنے لیا بدر و اُحد کا بدلا
لا کے غربت میں وطن سے شہ دیں کو مارا کفر نے پردۂ اسلام میں کیا کیا نہ کیا
جن کے افعال سے تاریخ لرز جاتی ہے
تذکرہ تک سے اُن ایسوں کے حیا آتی ہے

(۱۰)

آہ وہ دشتِ پُر آشوب وہ لاشے عُریاں   نہ نگہباں تھا کوئی جن کا نہ کوئی پُرساں
رات سنانے کا عالم، وہ ستارے لرزاں   آئی غیرت تو کیا، خاک نے اٹھ کر پنہاں

فرض امت کا ادا خاکِ بیاباں نے کیا
اپنی چادر سے شہیدوں کا بدن ڈھاک دیا

(۱۱)

اس شقاوت پہ درندوں کا بھی دل آب ہوا   آئے پہرے کو جو دل ماہئی بے آب ہوا
کون وہ دل تھا تڑپ کر جو نہ سیماب ہوا   کون وہ تھا تہ گردوں جو نہ بیتاب ہوا

لا کے اولاد کو صحرا میں عدو نے مارا
یہ صلہ اجرِ رسالت کا نبیؐ نے پایا

(۱۲)

اہلِ قریہ کو جو یہ دیکھ کے غیرت آئی   لاشیں آ آ کے شہیدوں کی وہاں دفنائی
گرچہ غربت میں غریبوں نے تھی تُربت پائی   آج ہے ان کی زیارت سببِ بینائی

کس نے اس طرح بدل ڈالا ہے تاریخ کا باب
پھر نہ دنیا نے دیا ایسی شہادت کا جواب

(۱۳)

خستہ دل، خستہ جگر، قید میں عابد بیمار   کانپتے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ناقہ کی مہار
سر برہنہ وہ کجاووں میں حرم، غیرت دار   راہِ صحرا میں چلی جاتی تھی اونٹوں کی قطار

دشت کی تیز شعاعوں میں جلے جاتے تھے
راہِ تسلیم میں سادات چلے جاتے تھے

(۱۴)

کربلا، کوفہ سے ہوتا ہوا تا سرحد شام   قافلہ آلؑ کا اور آگے سر شاہِ انام
ہر قدم راہِ سعادت میں نیا درسِ عوام   اک نئی روح، نیا قوم کو لے کر پیغام

قافلہ آلِ محمدؐ کا چلا جاتا ہے
راہِ تسلیم میں خاموش بڑھا جاتا ہے

(۱۵)

آئے دربار میں جب پیشِ بن زیاد، امام ۔ قتل کر دو انھیں بولا وہ شقی بد انجام

بولے سجادؑ، شہادت ہے ہمارا انجام[۱] ۔ تجھ کو معلوم نہیں کیا ہے شہیدوں کا مقام

ہے شہادت ہی میں در پردہ فضیلت میری

قتل ہونا رہِ معبود میں عزت میری

(۱۶)

ہم ہی بندے ہیں جہاں میں جو رفیع الدرجات ۔ ان کی آنکھوں میں مساوی ہیں حیات اور ممات

طاعت حق میں بسر کرتے ہیں اپنے اوقات ۔ ان کے رہتی ہے سدا پیش نظر راہِ نجات

دارِ دنیا سے اسی طرح گزر جانا ہے

موت کا سامنا ہر وقت ہے مر جانا ہے

(۱۷)

کیا کروں عرض کہ کس طرح کٹی راہِ ثواب ۔ راہ دشوار، سفر سخت، حکومت کا عتاب

جب لعینوں نے کیا آپ سے سختی سے خطاب ۔ تلخ باتوں کا دیا نرم کلامی سے جواب

جیسے سمجھائے کوئی اپنے ہَوا خواہوں کو

درس شفقت سے دیا کرتے تھے گمراہوں کو

(۱۸)

مشتہر جب ہوا اولادِ نبیؐ کا احوال ۔ آ گیا دَورِ یزیدی کو بہت جلد زوال

ملک میں پھیل گیا چار طرف رنج و ملال ۔ اہلِ کوفہ ہوئے آمادہ پے جنگ و جدال

جتنے ملزم تھے وہ چُن چُن کے گرفتار ہوئے

قاتلانِ شہ دیں تیغ سے فی النار ہوئے

(۱۹)

اس شہادت سے بھی بدلا نہ حکومت کا مزاج ۔ قدحِ اولاد کا تھا عہدِ اُمیہ میں رواج

ظلم اور جَور سے لیتے تھے شقی سب سے خراج ۔ تین سو سال خلیفہ رہے یوں صاحبِ تاج

تفرقہ دین کا ہر دَور میں بڑھتا ہی گیا

دبدبہ دینِ خدا داد کا گھٹتا ہی گیا

۱۔ قتل ہونا ہماری عادت اور شہید ہونا ہمارے لیے عزت ہے۔قولِ امام

(۲۰)

عِلم پھیلا تو ہوئے آلِ محمدؐ مقبول　　سب نے جانا کہ علیؑ کون ہیں، کون آلِ رسولؐ
اصلِ دیں کیا ہے اور اس دین کے کیا کیا ہیں اصول　　کھل گیا سب پہ جو کہتے تھے غلط اہلِ جہول
پھر اسی نور کی اس دہر میں تابانی ہے
ہر طرف مصحفِ ناطق کی ثنا خوانی ہے

(۲۱)

عزتِ نفس ہے کیا، کیا ہے بشر کا ایثار　　کس طرح اِن کا کیا، ابن علیؑ نے اظہار
کربلا گو کہ مصائب کا ہے زندہ شہ کار　　نوعِ انساں کی صداقت کی مگر اک معیار
آج تک اہلِ جہاں اس سے سبق لیتے ہیں
جب بھی تاریخ کا عالَم کی ورق لیتے ہیں

(۲۲)

کس نے اس طرح دیا صلح پسندی کا سبق　　کہد و تاریخ کا خود دیکھ کے ایک ایک ورق
صبر و ایثار و رواداری ہیں ایسے ملحق　　کہ تجاوز نہیں احکامِ خدا سے مطلق
جب بھی تاریخِ شہادت کا ورق کھلتا ہے
اصلِ دیں کیا ہے یہی درس وسبق کھلتا ہے

(۲۳)

تو وہی ارض ہے اے وادئ دجلہ و فرات　　جس میں تخلیقِ تمدن ہوا کہتے ہیں روات
کس نے انساں کو دکھائی ہے کہو راہِ نجات　　کون حسین ابن علیؑ سا ہے رفیع الدرجات
اک نئے عزم سے انساں کو جگایا کس نے
طوقِ اندوہِ غلامی سے چھڑایا کس نے

(۲۴)

قاتلوں کا جو ہوا سب کو ہے معلوم انجام　　تاج شاہی نہ رہے اور نہ جہالت کا نظام
آفریں سبطِ نبیؐ، آفریں تیرا پیغام　　نہ مٹانے سے مٹا رہ گیا تیرا اسلام
تیرا ہر فعل و عمل علم کا گنجینہ ہے
تو نے جو درس دیا آج وہ آئینہ ہے

(۲۵)

کربلا تجھ میں ہے عباسؑ کے بازو کا لہو　　اکبرؑ و قاسمؑ جاں باز کے پہلو کا لہو
تشنہ لب اصغرِؑ معصوم سے گل رو کا لہو　　بنتِ زہراؑ کے سنوارے ہوئے گیسو کا لہو

تجھ پہ انسان تو کیا جن و ملک روتے ہیں
عرش و کرسی و زمیں سات فلک روتے ہیں

(۲۶)

جنگِ عباسؑ کے دریا کے کنارے ہیں گواہ　　خونِ ناحق کے شفق رنگ نظارے ہیں گواہ
عرش و کرسی و فلک چاند ستارے ہیں گواہ　　جتنے مخلوق ہیں عالم میں وہ سارے ہیں گواہ

صاف ماتم کی فضاؤں سے صدا آتی ہے
سر کو مشہد سے جو ٹکرا کے ہوا آتی ہے

(۲۷)

یہ شہیدوں کی ہے یادوں کی جلالت کا علم　　زید اور جعفرؑ و عباسؑ کی عظمت کا علم
صبر و ایثار و رضا، علم و فضیلت کا علم　　صبرِ شبیرؑ کا حیدرؑ کی شجاعت کا علم

دیکھو طوفانِ حوادث میں نہ جھکنے پائے
اک قدم راہِ سعادت میں نہ رکنے پائے

(۲۸)

درسِ قرآن ہے پیغام حسینی بخدا　　اصل غم یہ ہے کہ ہم نے نہ ابھی تک سمجھا
کیا ہے اخلاقِ حسن اور شہادت ہے کیا　　ایک اک بابِ مصائب میں ہے سو درس چھپا

فرض جو ہم پہ ہے اس فرض کا انجام کریں
جو خیالاتِ حسینی ہیں انھیں عام کریں

(۲۹)

ساتھ تاریخ کے ہیں درس کی باتیں ارشاد　　شکوۂ جور ہے اس میں نہ ستم پر فریاد
مرثیہ میں ہے نئے طرزِ سخن کا ایجاد　　گر پسند آئے تو دیں اہلِ سخن، نظم کی داد

ہے صدا دل کی مری مرثیہ خوانی کیا ہے
میں ہوں کیا اور مری ہیچ بیانی کیا ہے

○

MIG. Colony, Kankarbagh, Patna - 800020

کاوش بدری

قصیدۂ سحرِ حلال نذرِ فخرِ جنوب وشمال

حضرت ابوالفیض سحرؔ

تشبیبِ نو (ذاتی)

صفحۂ ہستی میں فریادی ہیں سب نقش و نگار!
سیکڑوں ماضی ہیں ان کے اور مستقبل ہزار

ایک معشوقِ غزل اور اس کے عاشق بے شمار
لاکھ بیماروں میں ہو تقسیم کیسے اک انار

وہ بھی کیا دن تھے کھلونے ٹوٹنے پر رو پڑے
کوئی مرجائے تو روتے ہیں کہاں اب رشتہ دار

رونے دھونے کی کسے فرصت مشینی دور میں
ذوق کی تسکین کو تفریح کے ساماں ہزار

سب کے سب بیمار ہیں یا سب کے سب بدکار ہیں
دوزخستان بن گیا شعرا کے حق میں یہ دیار

قابلِ لاحول ہے ماحول سارا ان دنوں
کر لیا ہر شہر نے اب رنگِ کوفہ اختیار

آہ گریہ نالہ و شیون فغاں فریاد غم
سب کے سب شل ہوگئے ہیں ان دنوں آمرزگار!

یوں تو سب کچھ ہے خزانے میں خدا کے، غم نہیں
ایک بوند آنسو کے آگے ہیچ ہے جنت بھی یار

بحرِ علم و فن کی غوّاصی کا حاصل کچھ نہیں
مچھلیوں کا ویسے کر لیتے تھے بچپن میں شکار

شعر، سنگیت عشق لازم ہیں ہر اک فنکار پر
ورنہ نیرنگِ نظر ہے گردشِ لیل و نہار

کیسا سرپٹ دوڑتا ہے گر کے ٹوٹے گا کبھی
توسنِ تخلیق پر تنقید کا بت ہے سوار

شاہزادوں کی طرح اپنی ہوئی تھی پرورش
ماں کی ممتا باپ کی شفقت تھی کتنی تابدار

گویا ماضی نے بُنا تھا جال مستقبل کا یوں
خود ہما بھی مضطرب تھی اس میں ہونے کو شکار

ایک دن گائک سے ہم آوارہ شاعر بن گئے
حسن والوں کے لئے مرغوب تھا اپنا شعار

گاہ ہونٹوں نے ڈسا اور گاہ زلفوں نے کسا
ایک دل کے دو مسلماں دو صنم تھے حصے دار

آگہی و شاعری اور عاشقی آوارگی
تھا جنازہ عشق کا ان چار کاندھوں پر سوار

محفلِ شعر و سخن کافی نہ تھی اپنے لئے
سستی شہرت کی ہوس پھر لے گئی جمنا کے پار

رقص ہم نے بھی کیا پہلی غزل چھپنے کے ساتھ
ماہناموں کا ہمیں رہتا تھا پل پل انتظار

جب بھی ملتے تھے مدیرانِ رسائل کے خطوط
جب بھی آ جاتے بڑے شاعر شمالی ہند سے
ان کو ٹھہراتے تھے بنگلوں اور فیو اسٹار میں
منعقد کرتے تھے جلسے ان کے یوں اعزاز میں
نام ور شاعر کوئی مرتا تو مر جاتے تھے ہم
ان سے ملنے کے لئے گھر بیچ کر جانا پڑا
چند تصویرِ بتاں اور لاکھ یاروں کے خطوط
تنگ آ کر گھر کے جھگڑوں سے بہک جاتے تھے ہم
گنبدِ ہستی پہ زنگ آلود تھا من کا کلس
چھٹیاں لے کر بہت، دفتر میں ہم بدنام تھے
وقتِ رخصت لے کے چپراسی بھی نکلے چار لاکھ
ایک ہم گھر میں ہیں زندہ لاش خدمت کے لئے
ایک پل کے درد کو صدیوں ہمیں سہنا تو ہے
دکھ کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا تو ہم
اپنی ہر تصنیف پر چٹائی میں ہنگامے ہوئے
اہلِ ظاہر کے لئے تھی ''کاوی یم'' نارِ جحیم
خانقاہوں اور درگاہوں میں ملتی تھی اماں
جب غبن کر بیٹھے ماموں اور چچا املاک کو
خواجگانِ چشتؒ کے فیضان و احسانات سے
اس قدر تھا ہم پہ محبوبِ الٰہیؒ کا کرم
محوِ سجدہ تھا قلم سجّادۂ قرطاس پر
بادۂ عرفاں ٹپکتا تھا جبینِ شعر سے
کاوشؔ و ممتازؔ پر یوں نکتہ چینی کس لئے ؟
کیا علی گڑھ، کیا الہ آباد، کیا دلی، بہار

اپنا سینہ پھاڑ کر محفوظ کر لیتے تھے یار!
گھر کے زیور رہن رکھ کر ان کو لے جاتے تھے بار
وہ سمجھتے تھے کہ ہم مدراس کے ہیں شہر یار
محفلِ شادی میں بھی ہوتی نہ تھی ایسی بہار
خون کے رشتے سے بھی تھا ان سے رشتہ استوار
گاہ دہلی گاہ ممبئی گاہ بنگال و بہار
بے سر و ساماں سہی ہم تھے بڑے سرمایہ دار
جا کے کوٹھوں پر طوائف کے پہن لیتے تھے ہار
تھا مسلّط ہم پہ ابرِ واژگونِ روزگار
بیکسی پر اپنی بے حد خوش تھے سارے رشتہ دار
افسرِ دفتر تھے ہم نکلے لئے بس دس ہزار
ڈھو رہے ہیں بوجھ سب کا بن کے سوؔدا کا حمار
شاعروں میں کس کو حاصل ہے کچھ ایسا افتخار
روتے تھے ممتازؔ لے کے بحروں میں اکثر زار زار
کفر کے فتووں نے ہم کو کر دیا تھا نابکار!
اہلِ باطن کے قریں تھی کارناموں میں شمار
چادرِ گل میں چھپا لیتے تھے فرقِ شرمسار
کھو کے سب کچھ گھومتے تھے شہر میں دیوانہ وار
دشمنوں کے درمیان باقی تھا کچھ اپنا وقار
ہم پہ ہوتی تھی نزولِ رحمتِ پروردگار
مضمحل مارِ نفس تھا مست طاؤسِ قرار
لفظ کی ہر بوند میں رقصاں تھے معنی کے شرار
میرؔ و غالبؔ مصحفیؔ بھی تھے طوائف پر نثار
ہر جگہ کھینچے گئے ہیں فرقہ بندی کے حصار !

مستند ہوتا ہے بس ان کا ہی فرمایا ہوا
بانس پر جس کو اچھالیں بس وہی ہے، شاہکار

دیکھنا ہو مغلیہ دربار کا منظر کہیں
شعبۂ اردو کے دروازے کا بنئے چوکیدار

جامعاتِ ھند سے قائد کوئی نکلا نہیں
ہے تو شاعر ہے تو ناقد ہے تو افسانہ نگار

زندگی آساں نہیں اتنی ردیفوں کی طرح
قافیہ پیمائی سے آگے ہے جینے کا شعار

داستاں بننے کے قابل بھی نہیں شاعر کوئی
پڑھنے لکھنے اور سننے کی کسے فرصت ہے یار

خوں سے لکھی جائے گی تاریخِ اردو ایک دن
اردوداں اس وقت ہونگے سب کے سب زیرِ مزار

تا قیامت پھر نہ گونجے گی نوائے جبرئیل
اکتساب نور کو کافی ہے کوئل کی پکار

میرؔ و غالبؔ سا قصیدہ گو یقیناً میں نہیں
یہ قصیدہ نثری نظمیں کہنے والوں پر ہے بار

آبروئے ابروئے چشمِ غزالانِ تتار
یوسفستانِ زلیخائے ادب کے تاجدار

اک ولیؔ دکنی، سحرؔ[2] اور مجتبیٰ صاحب[3] کے بعد
اور کس دکنی کو دلّی میں ملا اتنا وقار

تو ولیؔ کا جانشین ہے فخرِ ہندوستان بھی
لاکھ پت جھڑ میں بھی تیری ذات ہے باغ و بہار

گھر میں مکتب میں دفاتر میں رہی ہے ساتھ ساتھ
مادرِ اردو کے قدموں پر ہے جنت بھی نثار

ایک اک عہدہ ترے حق میں ہے معراجِ کمال
تو جہاں بھی جائے تیرا بول ہی بالا ہے یار

مجتمع اک ذات میں تیری ہزاروں نعمتیں
ناقد و شاعر محقق خالقِ نقش و نگار

غازۂ رخسارِ فکر و سرمۂ چشمِ غزل
وادیٔ تحقیق کا تو آبشارِ کوہسار

اے جنوبی آفتابِ نو شمالی ماہتاب
تیری کرنوں سے منوّر صبح نو شام خمار

زندۂ جاوید تیرے کارنامے کیوں نہ ہوں
جبکہ اک 'خسرو شناسی' بن گئی ہے شاہکار

فرق آتا ہی نہیں گفتار اور کردار میں
تجھ پہ ہیں حضرت نظام الدینؒ کے احساں ہزار

صحبتِ شہبازؔ و شاربؔ میں بڑھی توقیر کیا!
معتقد تیرے ہیں کل دانشورانِ ذی وقار

اکتساب نور فاروقیؔ[4] سے کیا تونے کیا
شخصیت تیری بنی بھارت میں فانوسِ منار

عطرِ جاں چھڑکا ہے تو نے خامۂ افکار سے
دامنِ معشوق ہے تیرے لئے قرطاس یار

تو روایت کا پجاری اور جدّت کا امام
ہاتھ میں تسبیح بھی آگے ہے جامِ زرنگار

شہ نشیں کو حاسدوں نے کر دیا دار و رسن
تو نے ہر کرسی کو بخشا مسندِ گل کا وقار

بدرِ کامل ابرِ ظلمت میں چھپا تو غم نہیں ضوفشاں ہیں جب شب تاریک میں چشمانِ یار

شخصیت کردار اور خدمات پر میں کیا لکھوں یہ مرا پیشہ نہیں ہے، تجھ سے میں کرتا ہوں پیار

عہدِ ماضی تیرا تابندہ تھا تجھ کو خوف کیا تیرا مستقبل یقیناً ہوگا بے حد شاندار

استعاروں اور تشبیہوں میں دم خم ہم سے ہے ہم سے مستحکم ہے اب تک عالمِ ناپائدار

سانس نتھنوں سے نہیں ہم آنکھ سے لیتے رہے رو برو جب تک تھا بیٹھا پیکرِ صوتِ ہزار

کیوں جنوبی ھند کے شعرا ہیں محرومِ ایوارڈ کیا شمالی ھند ہی کے لوگ ہیں تخلیق کار!

تو اگر چاہے تو مل سکتا ہے حق حقدار کو ایک اک دکنی بھی بن سکتا ہے دُرِّ شاہوار

جن کو مرجانا تھا وہ اب تک ہیں زندہ کس لئے؟ جن کو جینا تھا صدوسی سال، ہیں زیرِ مزار

جملہ اردو کے عدو کی عمر بھی تجھ کو ملے

کاوشؔ کی یہ دعا مقبول ہو پروردگار!

---

۱ ملکۂ ترنم ثانی اختری بائی ممتاز جان آدا۔ کاوشؔ بدری کی کاوی یم (ادب العالیہ) مطبوعہ طویل نظم کی ہیروئن

۲ حضرت ابوالفیض سحرؔ ۳ حضرت مجتبیٰ حسین، عظیم طنز نگار

۴ سرس وتی سمان حضرت شمس الرحمن فاروقی سابق ڈائرکٹر B.P.U.

Post Box#42, AMBUR - 635 802,
Phone: 04174 - 245485

پروفیسر ولی الحق انصاری

قطعات

ہیں زندہ مگر زندگانی سے دور
کہ جس طرح مچھلی ہو پانی سے دور
سراپا وجود اپنا ہے مد و جزر
ہیں بحرِ مجسّم، روانی سے دور

حقیقت ہے اک داستانِ حیات
مگر تلخ اور خوش بیانی سے دور
سمجھ میں کسی کے یہ کیا آ سکے
ہیں الفاظ اس کے معانی سے دور

کہاں وہ جگہ ہے جہاں رہ سکیں
ستم رانیِ آسمانی سے دور
بنے ہیں انھیں سے تو ہونا محال
ہوا، خاک، آگ اور پانی سے دور

یہ عالم ہے کیا جس میں ہوں آج کل
غموں سے الگ شادمانی سے دور
مسرت کے جذبات سے بے نیاز
غم و غصہ و سرگرانی سے دور

جسے دیکھتی ہے مری چشمِ دل
وہ جنت ہے قید مکانی سے دور
پس از مرگ جائے عقوبت ہے جو
وہ دوزخ ہے آتش فشانی سے دور

ہے غربت کی تنہائی بھی خوشگوار
ہیں ناکامی و کامرانی سے دور
حسد اور احساں سے پائے نجات
ہیں بے مہری و مہربانی سے دور

غمِ زندگی کے یہ مارے جواں
جواں ہو کے بھی ہیں جوانی سے دور
صلاحیتیں ان کی آئیں نہ کام
ہیں گلبن، مگر گل فشانی سے دور

اگر ہے یہ خواہش تمہاری، رہو
ہر اک آفتِ ناگہانی سے دور
ولیؔ بیٹھ کر کشتیِ مرگ میں
نکل جاؤ اس دارِ فانی سے دور

○

Farangi Mahal, Victoria Street, LUCKNOW - 3

علامہ سریر کابری

بھارت کی بیٹی

جسے کہتے ہیں دلّی ہے وہ اپنا مولد و مسکن
شہنشاہوں کے محلوں میں گزاری کمسنی اپنی

جگہ پانے لگا آنکھوں میں حسنِ دل فریب اپنا
پسند آنے لگیں ہر دل کو ترکیبیں نئی اپنی

بنا طورِ تجلی ذرہ ذرہ ساری دنیا کا
زمانے بھر میں پھیلا دی بہت کچھ روشنی اپنی

سنوارے اپنے گیسو ہندو و مسلم نے مل جل کر
تو نکھری اور بھی آرائشوں سے سادگی اپنی

بجھا دی شمعِ ایران و عرب محرابِ مسجد نے
الگ تہہ کر کے رکھ دی مندروں نے بانسری اپنی

بہت اٹکائے روڑے غیر نے راہِ ترقی میں
مگر کچھ اور بھی بڑھتی گئی افسوں گری اپنی

چڑھے بامِ ترقی پر جب اپنے چاہنے والے
نہ جانے کیا نظر آئی انھیں بیگانگی اپنی

نکالی جا رہی ہوں دفتروں سے درسگاہوں سے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا خطا ہے کون سی اپنی

عزیزانِ وطن کے جی میں جو آتا ہے کرتے ہیں
دل اپنا، حوصلہ اپنا، مزاج اپنا، خوشی اپنی

ہمیں ہرگز نہیں اس کا گلہ لیکن یہ شکوہ ہے
کسی نے آج تک توڑی نہ مُہرِ خامشی اپنی

سریرؔ اس قوم کی ملکی ترقی کا خدا حافظ
مٹانے پر تُلی ہے جو زبانِ مادری اپنی

◉ مرسلہ: جناب مختار احمد عاصی (مظفرپور-بہار)

پروفیسر وارث کرمانی

محبوبِ نامسلمان

کیا بتائیں کہ شعر کہنے میں ہم کو لاحق ہے کیا پریشانی
تم کو یہ ضد کہ اس زمانے میں مان لیں تم کو یوسفِ ثانی
روز آئیں تمہاری محفل میں بہرِ پا بوسی و ثنا خوانی
روز کہتے ہو ہم پہ شعر کہو چھوڑ دو نعت و منقبت خوانی
بے وفا شاعروں میں جا بیٹھے چھوڑ کر میرے گھر کی دربانی
تم نے دیکھا بھی کیا ملا تم کو صرف فکر و نظر کی ویرانی
ایک صحرا میں جا کے ڈال دیا نہ وہاں پیڑ ہے نہ ہے پانی
نہ جوانی نہ جوشِ جاں نہ جنوں نہ جلاجل نہ جشن و جولانی
نہ جلال و جمال کے آثار نہ خیال و خرد کی حیرانی
نہ وہ ہجر و وصال کا موسم نہ وہ سجدے نہ سوزِ روحانی
نہ وہ الفاظ کی کم آمیزی نہ وہ الہام کی فراوانی
نہ زباں جبرئیل کی دمساز نہ قلم رشکِ آزر و مانی
وارثِ تختِ دلّی و شیراز اور یہ ذلتِ سخنرانی
تم نے کیا خاک میں ملائی ہے عزتِ میر و غالب و فانی

بُت پرستی سے ہو گئے تائب
آخر ایسی بھی کیا مسلمانی

Dewa Sharif. Barabanki (U.P)

صابر آروی

قوتِ ضبط

موجودہ عالمی تناظر میں

شام پھر آئی ہے تنہائی کا احساس لئے
رات آئے گی تو کیا ہوگا اس احساس کا حال

دل میں موجود ہے میرے ابھی احساس جمال
دل دھڑکتا ہے عجب طرح کا وسواس لئے

ہر طرف دھند ہے تاریکی و مایوسی ہے
اب فضاؤں میں گھلی ہے دلِ غمگیں کی کراہ

روشنی کوئی نظر میں نہیں تا حدّ نگاہ
گوشۂ ذہن میں خاموشی ہی خاموشی ہے

شہر و قریہ میں ہے ابلیس ابھی رقص کناں
خشک ہوتے ہی نہیں چشم بشر کے آنسو

جسم انساں کی سڑی لاش کی بدبو ہر سو
آج ہر آنکھ نظر آتی ہے حیراں حیراں

جرم پھر جرم ہے اس جرم کی پاداش نہ ہو
کوئی ہنس کر بھی کرے ظلم تو وہ ظلم ہی ہے

ہم کریں، آپ کریں، کوئی کرے، جرم ہی ہے
دل پہ خاش رہے یا دل پرخاش نہ ہو

کرب بڑھتا ہے تو خوشیوں کو نگل جاتا ہے
اس کی تاثیر میں بھی غیظ و غضب ہوتا ہے

قوتِ ضبط کا انداز عجب ہوتا ہے
ضبط کے سامنے شہ زور سنبھل جاتا ہے

چاہیئے ضبط فقط امن و اماں کی خاطر
ظلم کی تیغ اُبلی ہے تو اُبلی رہنے دو
بے گناہوں کا کہیں خون نہیں بہنے دو
عزم درکار ہے ہر کارِ جہاں کی خاطر

Patna

احمد جمال پاشا مرحوم

استادالاساتذہ کا عکسِ تخیّل

حضرات وخواتین! آج اس تقریب میں ایک ایسے استاد کی استادی کا اعتراف کرنا ہے جو طبعاً سراپا انکسار، خاکسار اور اس حد تک شریف ونحیف ہے کہ اپنے شاگردوں کے سامنے بھی استاد سے زیادہ شاگرد نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ اس شہر اور ریاست میں بہت سا کاروبارِ شعر وادب اس کے تقسیم اشعار کے نظام پر قائم ہے اور جب یہ استاد شہر میں داخل ہوتا ہے تو بڑے بڑے مونچھوں پر تاؤ دیے اور آسمان تک کو خاطر میں نہ لانے والے شعرا حصولِ کلام، اصلاح، اور فرمائش کے لئے اسے مرغی کے بچوں کی طرح گھیر لیتے ہیں۔ شہر میں ہونے والے مشاعروں اور شعری نشستوں کی کامیابی کا انحصار اس کی شہر میں آمد کی قطعی تاریخ پر ہوا کرتا ہے۔ اگر کار سرکار کے سبب تشریف نہ لاسکے تو پھر اس دن کی محفل سے بحر اور وزن کی قید باقی نہ رہ جانے کی وجہ سے مجلس ہی میں تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر درمیان میں نزول اجلال ہونے کی وجہ سے بقیہ نصف آخر مشاعرہ چمک اٹھتا ہے۔

حضرات! اس استاد کے دم سے سیکڑوں شاعروں کی اندرون وبیرون ریاست شاعری چل رہی ہے مگر پھر بھی مجھے اس کی ادائے استادی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے استاد دیکھے ہیں اور ان کی استادیاں بھی چشمِ تماشا سے گذر چکی ہیں۔ یگانہ چنگیزی شاگرد بنانے سے صاف انکار کردیتے ہیں لیکن اگر شاعر کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتا تو پھر اس کو مختلف بحروں سے مصرعے عطا کیے جاتے اگر فی البدیہہ غزلیں نہ سنا سکا تو ہوگیا مردودِ بارگاہ۔ ورنہ استاد کی چلمیں بھرنے کے منصب جلیلہ پر اس کا تقرر کردیا گیا۔ افقرؔ موہانی کے یہاں صرف کلام دیا جاتا تھا اور اس کا باقاعدہ نرخ مقرر تھا جو شاگردوں کی فوج ظفر موج میں جوار بھاٹے کے حساب سے چڑھتا اترتا رہتا۔ آرزوؔ لکھنوی کے یہاں شاگرد کو شاعری کی فوجی مشقیں کرنی ہوتیں۔ گھرداری، ڈانٹ ڈپٹ اور کلکتیہ سلیپر سے تواضع تو خیر روز مرّہ ہوا کرتا۔ آرزوؔ کے شاگرد پر تو استادی میں استاد سے بھی بانسوں آگے بڑھ گئے۔ نالائق شاعر کا تو خیر ان کے یہاں گزر کا سوال ہی نہیں لیکن لائق بھی پر بستہ تھے اور وہ بھی اس حد تک کہ اگر کسی شاگرد نے دل بدلی کی اور کسی دوسرے استاد کے یہاں شعری پناہ حاصل کرلی اور دوبارہ آیا رام گیا رام کرنا چاہا تو اسے باقاعدہ دھکے دے کر نکالا جاتا۔ آسیؔ سے شاگردی کے لئے شطرنج کی شرط لازمی تھی۔ آپ کی نوکری رہے یا نہیں مگر استاد کے ساتھ بازی پوری کرنا ہے۔ اثرؔ صاحب کے یہاں شاگردی کا مطلب ان کا کلام مسلسل بلکہ پہروں سننا ہوا کرتا۔ صرف کھانے یا ناشتے پر وہ صلاحیت کا اندازہ کرلیتے اور عدم صلاحیت کی صورت میں نہایت ناخوشگوار

طور پر رخصت کر دیے جاتے۔ عمر انصاری کو اگر شبہ بھی ہو جاتا کہ شاگرد میں شاعری کی رمق بھی ہے تو شاگرد بنانے سے صاف انکار کر دیتے اور شاگردوں کو گھنٹوں مشاعرہ لوٹنے اور استاد کے کلام پر پھبتیں اڑا دینے کی مشقتیں کراتے۔ مجھے تو یہ استاد عطا کاکوی کے قبیلے کا معلوم ہوتا ہے کہ اِدھر شاگرد آیا اُدھر انھوں نے جھٹ اسے نپٹا دیا۔ شاعری نہ ہوئی ہمیو پیتھک کی پریکٹس ہوگئی۔

یہ ساری تمہید جس استاد کے لئے باندھی جا رہی ہے وہ اس وقت مجسم موجود ہے اور حسب معمول نوشہ کی طرح شاگردوں اور دوستوں کے سامنے شرما رہا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ میں کس لائق ہوں۔ تو صاحب! استادوں کے استاد حضرتِ کوثر سیوانی جن کی شان میں ہمیں قصیدہ پڑھنا ہے، آپ سے بھی کیا چوری، جب ان سے پہلی بار ہماری ملاقات ہوئی تو ہمیں ان کی بے بسی پر بڑا ترس آیا اور ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص یا تو زمانے اور روزگار کا ستایا ہوا ہے یا اس پر وقت پڑا ہے لیکن جب ہمیں معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو ایمانداری اور جفاکشی کا شکار ہے ورنہ وزراتِ مالیات کے عملۂ احتساب سے اس کا تعلق ہے اور یہ فائینس کا آڈیٹر ہے اور اس کے نام سے بدعنوان اور بداعمال عمال بھی راتوں کو چونک اٹھتے ہیں تو مجھے تعجب سے زیادہ خوشی ہوئی۔

اس تصنع اور ملاوٹ کے زمانے میں کوثر صاحب واحد خالص انسان ہیں۔ ان کی سادگی، شرافت اور بھولے پن نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر کیا۔

''عکسِ تخیل'' کوثر سیوانی کا اولین شعری مجموعہ ہے جو بہت پہلے شایع ہو جانا چاہیے تھا جو ان کی زندگی کے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کا آئینہ ہے۔ جس میں غزلوں، نظموں اور قطعات کے پیکر میں روحِ شاعری جلوہ گر ہے۔ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ دل کی باتیں دلوں میں اتار دی گئی ہیں۔ ان کے یہاں روایت اور اقدار کا احترام اور قدیم و جدید کا خوشگوار امتزاج ہے۔ جس میں خلوص کی فراوانی نے احساس و ادراک کے نگینوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا کر دی ہے۔ یہ ہر انقلاب اور تبدیلی کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے اور خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں۔ شاعری ان کا نہ صرف ذوق بلکہ زندگی بھی ہے۔ جس پر کلاسیکی اساتذہ کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کے رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہے۔ اس لئے ان کے اشعار دلوں میں اتر جاتے ہیں اور شاعری کا جادو جگاتے ہیں اور کوثر کے طلسمی اثر کو برقرار رکھتے ہیں۔

کیوں نہ فن کار کا ڈھالا ہوا پیکر جاگے
روحِ فن پھونک دے پتھر میں تو پتھر جاگے

میں نے اپنے یہاں بھی اور اکثر اساتذہ کے یہاں بھی کوثر کو بارہا اپنے تخلص میں گھنٹوں غرقاب پایا۔ آئے اور دو ایک بات کے بعد خاموش ہو گئے پھر فکر میں ڈوب گئے اور اپنے اس شعر کی تفسیر بن گئے۔

جس کو ہجومِ شوق میں اپنی خبر نہیں
اس بے خبر کو کیا ہو خبر کائنات کی

''عکسِ تخئیل'' سے ان کی فنی پختگی اور قادر الکلامی کا احساس واضح ہو جاتا ہے اور وجہ سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ حضرت اتنے ڈوبے کیوں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو کسی شاعر کو اس زبان کا شاعر بنانے اور اس کے اساتذہ کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے یہ مقامی یا ریاستی تو وطن کی رعایت سے ہیں ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کا کلام جغرافیائی حدود سے بلند ہے اور بلا تکلف ہم انھیں ''عکسِ تخئیل'' کی بنیاد پر اپنے قومی شعرا کی فہرست میں شمار کر سکتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ احساس ہو اور آپ فرمائیں بھی کہ سیوان میں کوثر صاحب کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر ان کے میدانِ شاعری میں نظر نہیں آتا۔ میں عرض کروں گا کہ اپنے رنگ میں بہار میں بھی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ مجھ سے علامہ جمیل مظہری نے میرے گھر پر ان سے کوثر صاحب کو ملوانے کی تقریباً دس سال قبل فرمائش کی تھی مگر یہ دَورے پر گئے ہوئے تھے اس لئے ڈھونڈوانے پر بھی ہاتھ نہ آئے تھے تو علامہ نے فرمایا تھا کہ ''کوثر بہت ہی اچھا شاعر ہے''، تو میں چونک اٹھا تھا۔ کیونکہ وہ بار بار تعریف فرمار ہے تھے اور صرف ایک ہی فرمائش تھی وہ بھی میں پوری نہ کر سکا۔ بہار میں تو شاید ہی اساتذہ میں کوئی ایسا ہو جس نے ان کی تعریف نہ کی ہو یا ان حضرات سے اپنے برادرانہ ومخلصانہ مراسم کا ذکرِ خیر نہ کیا ہو۔ لیکن بیرونِ ریاست کے اساتذہ بھی ان کے فکر وفن کے مدّاح ہیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان ایک ایسا کوہِ نور بھی ہے جس کی چمک دمک سے سب اہلِ فن کی آنکھیں خیرہ ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ فن کار اور بندۂ مومن سادہ ہی ہوا کرتا ہے۔ حسن سیب کے درخت میں نہیں سیب میں ہوا کرتا ہے۔ انار کے درخت میں نہیں انار پر سرخی ہوا کرتی ہے۔ شاعر نہیں اس کی شاعری میں چمک دمک ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ کو اصلی اور نقلی کا فرق معلوم ہے تو آپ کوثر کا اسی طرح احترام کریں گے جیسے کہ آپ کو اساتذۂ فن کا احترام کرنا چاہئے۔ ''عکسِ تخئیل'' کے اجرا کے مبارک موقع پر میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

(یہ مضمون ۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء کو ''عکسِ تخئیل'' کی رسمِ اجرا کے موقع پر بدولت کدۂ جوہر سیوانی پڑھا گیا۔ ظ-ک)

کوثرؔ سیوانی
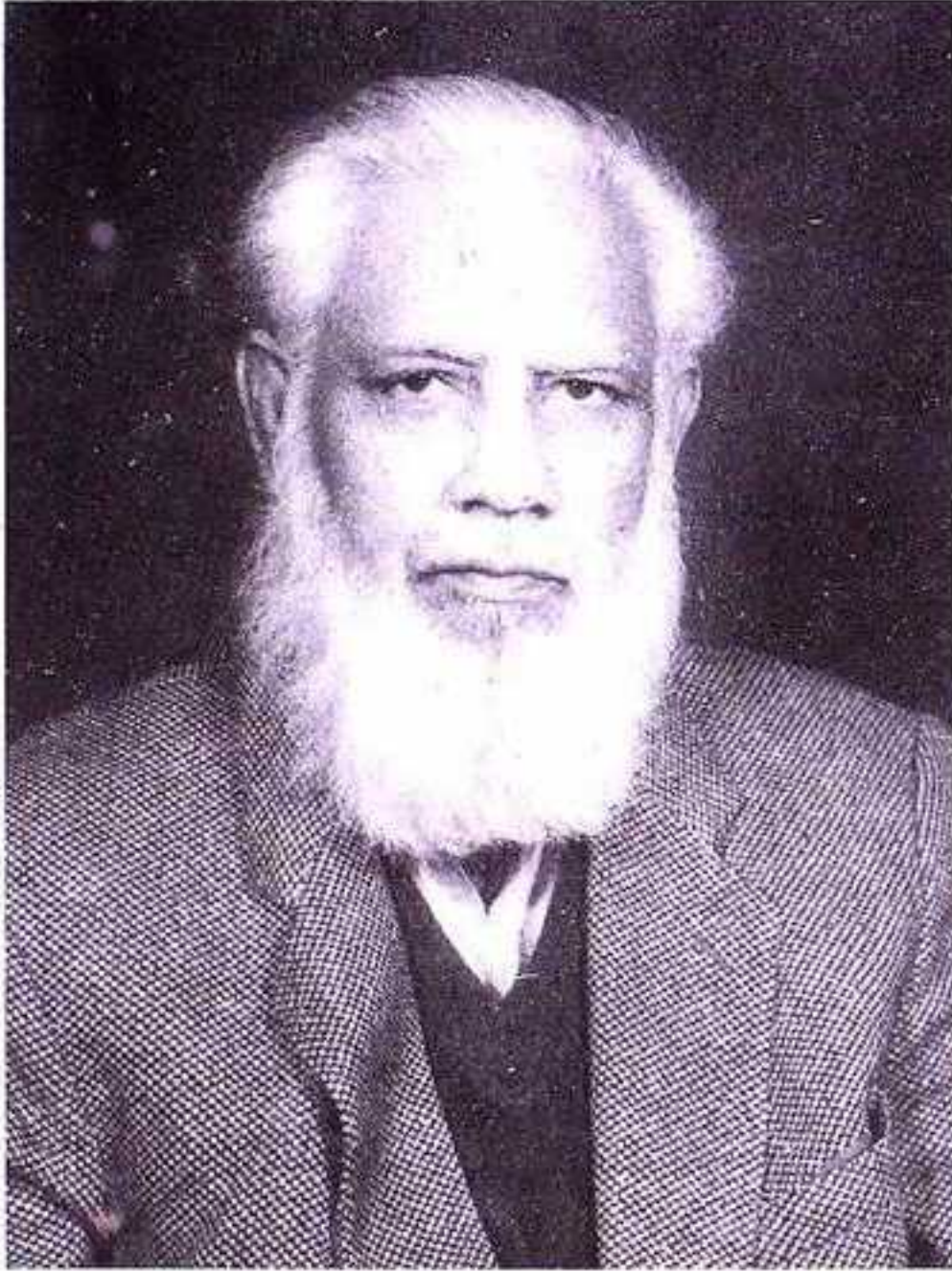
پیدائش: ۱۹۳۳ء　　وفات: ۷؍جنوری ۲۰۰۳ء

جو لکھنا تھا اسے جس دور میں وہ لکھ گیا کوثرؔ
بھلا کب ضربِ دوراں سے سخنور کا قلم ٹوٹا

قطعۂ تاریخِ وفات کوثرؔ سیوانی مرحوم

نادم بلخی

محفل علم و ادب میں لے کے منصب — شاعری کا جام رکھتا تھا لبا لب

کوثرِ شیریں سخن سیوان کا تھا — شہرِ فن میں فن تھا جس کا مثلِ نخشب

کل تلک وہ محفلوں میں نغمہ خواں تھا — آج اس کی زیست پر ہے موت اغلب

وہ کہاں اب علم والوں کو ملے گا — جس کی ہستی تھی سخندانوں کا مکتب

لے گیا ہے ساتھ توشہ آخرت کا — حق سے پانے کو مآلِ قربتِ رب

سوچتا تھا کچھ لکھوں میں اس کی خاطر — سوئے جنت چل بسا سنسار سے جب

سالِ مرگ اُس کا یہ بولا مجھ سے نادمؔ

''کامراں فردوس میں ہوگا ضرور اب''

۲۰۰۳ء

ظفر کمالی

کوثر سیوانی — احوال و انتخابِ کلام

محمد کوثر ابن محمد حسن ابن محبوب علی ابن غوثی میاں، آبائی وطن ہتھوا ضلع سارن حال ضلع گوپال گنج۔ کوثر کے والد محمد حسن دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی کا نام منور حسین تھا جنھوں نے مہاراج گنج بازار ضلع سیوان میں سکونت اختیار کی ان کی اولاد وہیں ہے۔ محمد حسن کا مکان نیا بازار محلہ نونیا ٹولی اسپتال روڈ سیوان میں تھا جو ان کی اہلیہ جنت خاتون کو میکے سے بطور ترکہ ملا تھا۔ حسن کے خسر جن کا نام شکر علی تھا، بسنیں تاج پور ضلع سیوان کے رہنے والے تھے ان کی اہلیہ مہتابن خاتون تھیں۔ محمد حسن آتش باز تھے۔ انھوں نے ایک کرانے کی دوکان بھی کھول رکھی تھی۔ سیوان صدر اسپتال کے نزدیک اسی جگہ اب سادھو میڈیکل ہال ہے۔ محمد حسن کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا اور وہ کربلا قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انھیں تین بچے ہوئے۔ (۱) محمد کوثر (۲) عابدہ خاتون (۳) زاہدہ خاتون۔ عابدہ اور زاہدہ کی شادیاں شہر سیوان ہی میں ہوئیں اور دونوں بقیدِ حیات ہیں۔

کوثر جو اپنے بھائی بہنوں میں بڑے تھے، ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کی سند میں سالِ ولادت ۳۱/ مارچ ۱۹۳۷ء درج ہے لیکن بقول کوثر ان کی والدہ بیان کرتی تھیں کہ جنوری ۱۹۳۴ء میں جب بہار میں زلزلہ آیا تھا، اس وقت وہ گود میں تھے۔ اس حساب سے ان کا سنہ پیدائش ۱۹۳۳ء ہی درست ہے۔ خود کوثر نے اپنے شعری مجموعے ''عکسِ تخئیل'' میں 'عرضِ حال' کے تحت یہی سنہ تحریر کیا ہے۔

ابتدائی تعلیم یو پی اسکول سیوان میں ہوئی جس کے صدر مدرّس مولوی محمد یوسف تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وی- ایم ہائی اسکول میں میٹرک کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔ اس زمانے میں کسی غریب رنگریز کے لڑکے کا درجہ اوّل میں کامیاب ہونا بڑی بات تھی۔ ۱۹۵۶ء میں راجندر کالج چھپرہ سے آئی ایس سی کے امتحان میں تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔ ڈی-اے-وی کالج سیوان سے ۱۹۵۸ء میں بی-اے پاس کیا۔ قرآن خود سے پڑھا۔

۱۹۵۹ء میں محکمۂ صحت میں ملیریا سپروائزر کے عہدے پر کوثر کی تقرری ہوئی۔ اس سلسلے میں میروا، دگھوا دگھولی، مظفر پور، پارس ناتھ (ہزاری باغ) وغیرہ جگہوں پر رہے۔ ۱۹۶۵ء میں محکمۂ مالیات کے امتحان میں شریک ہوئے اور منتخب قرار پائے۔ آڈیٹر کے عہدے پر پہلی تقرری پٹنہ میں ہوئی۔ وہاں سے مظفر پور، دربھنگہ اور پھر پٹنہ تبادلہ ہوا۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں چھپرہ سے سینئر آڈیٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

شادی ۱۹۶۰ء میں محمد غوث مرحوم کی صاحب زادی محترمہ قمر النسا بیگم سے ہوئی۔ محمد غوث نے جو شیخ محلہ

سیوان کے رہنے والے تھے، دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری اہلیہ کا نام فاطمہ خاتون تھا جو قمر النسا بیگم کی والدہ تھیں۔ سات بھائی اور دو بہنوں میں قمر النسا کا نمبر تیسرا ہے۔ ان کے بطن سے سات بچے تولد ہوئے۔ پہلا بچہ مردہ پیدا ہوا تھا بقیہ چھ کے نام اس طرح ہیں: (۱) محمد افتخار کوثر عرف شمن (۲) محمد اقبال کوثر عرف شہزادہ (۳) محمد ذوالفقار کوثر عرف اچھو (یہ ذہنی طور پر معذور ہے) (۴) محمد اظہار کوثر عرف نھو (۵) طاہرہ بانو عرف اچھی (۶) رقیہ بانو عرف نھی۔

کوثر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ عبدالعزیز بابو رئیس سیوان روح افزا منزل اور حکیم بشیر قادری کے دولت کدے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ یہ ان میں سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ اسی وقت لکھنے کا شوق ہوا اور مشقِ سخن کرنے لگے۔ جب موزوں اشعار کہنے لگے تو اصلاح کے لیے پروفیسر حمید تمنائی سے رجوع کیا۔ انھوں نے ڈانٹ پلائی کہ طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی سے باز رہیں۔ ۱۹۵۹ء میں باضابطہ شاعری شروع کی اور حمید تمنائی کی ہی شاگردی اختیار کی۔ تقریباً ۱۹۶۷ء میں این-سی-سی آفس میں آڈٹ کرنے کے لیے گیا گئے ہوئے تھے۔ وہاں فرحت قادری اور ظہیر غازی پوری سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ایما پر ابر احسنی گنوروی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ آبر صاحب اس وقت تاج پریس کے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے گیا آئے ہوئے تھے۔ کوثر صاحب نے آبر احسنی سے اصلاح کے لیے حمید تمنائی سے باضابطہ اجازت حاصل کی تھی۔ ابر احسنی نے اپنی وفات تک ان کی تقریباً پچاس غزلوں پر اصلاح دی۔ حمید تمنائی کی اصلاح کردہ غزلوں پر بھی انھوں نے نظر ثانی کی۔ ان کے انتقال کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ رفتہ رفتہ ان کی حیثیت خود استاد شاعر کی ہوگئی۔

کوثر صاحب کے تلامذہ کی تعداد تقریباً تین درجن ہے جن میں بیکس سیوانی، جوہر سیوانی، امتیاز رامپوری، علی اکبر اشک سیوانی، فہیم جوگاپوری، فاروق سیوانی، ظفر کمالی، شکیل دربھنگوی، انجم سیوانی، راز سیوانی اور قمر سیوانی کے نام اہم ہیں۔ کچھ شعرا نے گاہے بگاہے اصلاح لی۔ بعض حضرات کو ان کی خوشامد اور اپنے مزاج کی مروت سے طرحی غزلیں بھی کہہ کر دیں۔

۱۹۸۱ء میں ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل پہلا شعری مجموعہ ''عکسِ تخیل'' بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے بزمِ انور سیوان کے تحت شائع ہوا۔ اس میں کوثر صاحب کے ''عرضِ حال'' اور منظوم تعارف کے علاوہ عطا کاکوی، ظہیر صدیقی، قمر اعظم ہاشمی اور ایم-ہدیٰ-راز نے تقریظیں لکھیں۔ ڈیمائی سائز کے اس مجموعے میں بہتر غزلیں، چودہ نظمیں اور بیالیس قطعات ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ''جنون کی آگہی'' بھی ترتیب پاچکا ہے۔

تقریباً ۱۹۸۲ء میں الحاج عضدالدین خاں صاحب پروفیسر اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ سے سلسلۂ قادریہ میں ... دوری کی وجہ سے ملاقات ہونے میں دشواری تھی کیونکہ ان کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس لیے احب... کے مشورے سے یہ بیعت فسخ کردی اور یکم جون ۲۰۰۰ء کو الحاج حافظ علی احمد صاحب (مدرسہ احمدیہ

غریب نواز مولا نگر گردھر پر سا بھواں، گوپال گنج) سے سلسلۂ نقش بندیہ، مجدّدیہ، رضویہ میں بیعت ہو گئے۔ تعجب ہے کہ اصلاحِ سخن کے سلسلے میں جب استاد تبدیل کرنا ہوا تو استادِ اول سے باضابطہ اجازت طلب کی لیکن بیعت جیسے نازک معاملے میں وہی طریقہ کیوں اختیار نہیں کیا۔

پہلے کلین شیو ہوا کرتے تھے لیکن بعد میں سفید بُراق داڑھی رکھ لی تھی۔ کرتا پائجامہ پہنتے انھیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ گھر پر تہمد اور بنیان پہنتے تھے۔ باہر نکلنا ہوا تو پتلون اور شرٹ زیب تن کر لیا۔

کوثر صاحب مذہبی خیال کے نہایت شریف اور مہذب انسان تھے۔ مزاج میں تواضع اور خاکساری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کا شمار بزرگوں کی اس نسل سے تھا جو جدید تہذیب کی مصنوعی چکا چوند اور طوفانِ بے تمیزی کے مقابلے روایتی تہذیب اور قدیم اقدار کا چراغ روشن کیے کھڑی تھی۔ بزرگوں کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو ان کے پورے وجود میں افسردگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ وہ حفظِ مراتب کا ہمیشہ خیال کرتے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اس دور میں جس طرح دل خلوص سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، معاشرے میں منافقت اور ریاکاری کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے، خیر و شر، حق ناحق، جائز ناجائز اور حلال و حرام کا فاصلہ بتدریج گھٹ رہا ہے، مال و دولت کا لالچ، شہرت کی کاذب تمنا اور دنیوی حرص و ہوس نے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، دروغ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، کون ایسا صاحبِ دل ہے جو اس صورتِ حال سے بے چین نہ ہو۔ کوثر صاحب بھی اس انسانی بے راہ روی سے کافی دل برداشتہ رہتے، کبھی ذکر چھڑ جاتا تو رہ رہ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور بڑی حسرت سے اس انسانی المیے پر اپنے افسوس اور صدمے کا اظہار کرتے تھے۔

وہ ''دل بدست آور دکہ حج اکبرست'' کے قائل تھے۔ دل شکنی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ لوگ ان کے سامنے اپنے قصیدے پڑھتے اور ڈینگیں ہانکتے تھے اور یہ ان کی حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی ''واہ صاحب!''، ''ارے! ایسا ہوا''، ''کیا کہنا ہے صاحب'' جیسے الفاظ سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ کئی مرتبہ اس خاکساری نے دیکھا کہ کسی نے انھیں الٹے سیدھے اشعار سنانے شروع کر دیے، مصرعے وزن و بحر سے خارج، اس پر تلفظ کی مضحکہ خیزی مستزاد۔ لیکن کوثر صاحب وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں ''واہ وا''، ''بہت عمدہ''، ''بہت خوب''۔ یہ ساری تعریفیں محض اس لیے ہوتی تھیں کہ بے چارے کا دل نہ ٹوٹے۔ ان کے پاس اجہل بھی آ جائے تو بوقتِ رخصت خود کو عالم سمجھنے لگتا تھا۔ کوثر صاحب نے دوسروں پر اپنی لیاقت اور علمیت کا رعب کبھی نہیں ڈالا۔

مزاج میں ظرافت کا مادّہ بھی خوب تھا۔ لطیف اور شستہ چٹکیاں لیتے اور فقرے کستے رہتے تھے۔ گفتگو میں رعایتِ لفظی سے کام لینے میں طاق تھے۔ اس دور کا المیہ یہ ہے کہ لطیف مزاح لوگوں کے سروں سے گزر جاتا ہے۔

پھبتیوں کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے اب خال خال ملتے ہیں۔ کوثر صاحب بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے رہتے۔ اگر انھوں نے کسی پر فقرہ کسا اور مخاطب پر کوئی اثر نہیں ہوا، ایسے میں وہ کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن دل کا اضطراب چہرے سے نمایاں ہو جاتا تھا۔ مخاطب اگر زبان کے رموز و نکات سے باخبر ہوتا، اشاروں اور کنایوں کو سمجھتا اور جملے بازیوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا تو پھر ان کی گل افشانیِ گفتار کا جادو اپنے عروج پر ہوتا تھا۔ خندۂ دنداں نما کو قہقہوں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی تھی لیکن کیا مجال کہ تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

مذہب سے بڑا لگاؤ تھا۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے مسلک کے پیرو تھے لیکن مزاج میں تشدد نہیں تھا۔ طرزِ فکر صوفیانہ تھی۔ صلح کل اور رواداری کے قائل تھے۔ بعد نماز فجر دن چڑھنے تک اوراد و وظائف اور تلاوت میں مصروف رہتے۔ رمضان میں تو پورا مہینہ ہی تقریباً جانماز پر بسر ہو جاتا تھا۔ صوفیۂ کرام اور بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

کوثر صاحب صاحبِ ایمان تھے اور اس کا خیال انھوں نے ہر جگہ رکھا۔ اپنی پوری ملازمت کے دور میں کبھی رشوت نہیں لی۔ وہ جس عہدے پر تھے اس میں ''دستِ غیب'' کے مواقع بہت تھے لیکن وہ اس پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزر گئے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف ان کے دولت کدے پر موجود تھا۔ ان کے ایک رشتے دار جو دانا پور پٹنہ کے رہنے والے تھے، آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں بطور خاص صرف یہ دیکھنے کے لیے سیوان آیا ہوں کہ حلال آمدنی سے بنایا ہوا مکان کیسا ہوتا ہے۔ ان کی ایمانداری اور شرافت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حلقے میں امانت دار کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ایک زمانے تک وہ لوگوں کی چیزیں بطورِ امانت اپنے پاس رکھتے رہے۔ جس شخص نے جو چیز جس حالت میں جمع کی بالکل اسی شکل میں وہ اسے واپس ملی۔

آدمی کی پہچان کوثر صاحب میں بالکل نہیں تھی۔ انھیں آسانی سے فریب دیا جا سکتا تھا۔ ملازمت کے آخری دنوں میں جب یہ چھپرہ تھے تو ایک حضرت ان کے ساتھ آنے جانے لگے۔ خود کو سی۔بی۔آئی کا انسپکٹر ظاہر کیا۔ کوثر صاحب جب ریٹائر کر گئے تو وہ ان سے ملے اور ان کے دولڑکوں کی نوکری کا جھانسہ دے کر مختلف بہانوں سے ایک سال کی مدت میں تقریباً ڈھائی لاکھ روپے لے کر فرار ہو گئے اور انھیں معاشی طور پر کنگال بنا دیا۔ یہ تو کوثر صاحب کا ہی دل و جگر تھا جو اس صدمے کو جھیل گئے۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان کے ہمنوا جب اس دھوکے باز سے رقم وصول کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے تو اس وقت یہ دعا کر رہے تھے کہ اللہ اس فریبی کے قلب کو پھیر دے اور وہ راہِ راست پر آ جائے۔

کوثر صاحب نے حمید تمنائی کے بعد سیوان میں شاعروں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ فن کی شاہراہ پر لوگوں کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ ان کا یہ فیض تا مرگ جاری رہا لیکن ایسے عاقبت نا اندیشوں اور گندم نما جو فروشوں کی بھی

کمی نہیں رہی جنھوں نے ان کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا مگر در پردہ وہ انھیں پر اپنی برتری جتاتے رہے۔ منہ پر حضور سرکار کرتے اور استاد استاد کی رٹ لگاتے لیکن پیٹھ پھیرتے ہی سازشوں کا جال بننے میں مصروف ہو جاتے۔ کوثر صاحب ان تمام خفیف الحرکاتیوں سے اچھی طرح واقف تھے، وہ ایسے لوگوں کی منافقت کا ذکر کبھی تو بڑے مزے لے لے کر کرتے اور کبھی اس پر حیرت کا اظہار فرماتے کہ انسان کیسی کیسی خود فریبیوں کا شکار ہے اور کتنے معمولی فائدے کے لیے تو تا چشمی اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاگردوں کی ذہنیت کا صرف ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد کلام پر اصلاح کے لیے آتے رہتے تھے۔ کوثر صاحب کا طریقۂ اصلاح قدیم اساتذہ کا تھا۔ شعر یا مصرعے میں کوئی خامی ہو، کوئی لفظ یا ترکیب غیر فصیح ہو، روزمرّے یا محاورے میں چوک ہوگئی ہو، الفاظ کی بندش چست نہ ہو، وزن و بحر میں کوئی کمی ہو، قواعد اور مسلّمہ اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہو یا کوئی اور اسقام ہو تو حاشیے پر اس کی وضاحت کر دیتے تھے۔ کوئی شعر بہ اعتبار مضمون پست ہوا تو اسے قلم زد کر دیتے۔ وہ حتی الامکان مصرعے اپنی طرف سے نہیں لکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ شاگرد خود زیادہ سے زیادہ محنت کرے تاکہ اس کے فن اور صلاحیتوں پر نکھار آئے۔ شاگردوں کو پاس بٹھا کر اس سے سوال بھی پوچھتے۔ شاگرد کسی اصلاح سے مطمئن نہ ہو تو اس پر کبھی خفا نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کی توجیہات توجہ سے سنتے اور وہ قابلِ قبول ہوں تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ اگر شاگرد غلطی پر ہوتا تو اسے مختلف طریقوں سے سمجھاتے یہاں تک کہ وہ مطمئن ہو جاتا۔ ان کے مزاج میں ضد کا مادّہ بالکل نہیں تھا۔ خود کو منوانے کی روش سے دور رہے۔ ادب کے معاملے میں وہ جس طرح دوسروں کو مشورے دیتے اسی طرح خود دوسروں حتیٰ کہ شاگردوں سے بھی مشورے لیتے تھے۔ کسی نے معقول مشورہ دیا تو اس کا شکریہ ضرور ادا کرتے۔

شعر تحت میں سناتے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر آواز کے زیر و بم کے ساتھ پڑھتے تو سماں باندھ دیتے۔ اس خاکسار نے بڑے بڑے شاعروں کو تحت میں پڑھتے سنا ہے لیکن بلا مبالغہ ان میں کوئی کوثر صاحب کا ثانی نظر نہیں آیا۔ استاذی احمد جمال پاشا مرحوم بھی ان کے اندازِ شعر خوانی کے قائل اور مدّاح تھے۔ وہ اچھی بات اور اچھا شعر سن کر پھڑک اُٹھتے تھے۔ کبھی یہی پھڑک بیتابی کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی۔

کوثر صاحب نے ۱۹۸۱ء میں زمین خرید کر شیخ محلے میں مکان بنوایا اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔ آخری دنوں میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی۔ وہ دل، ہائی بلڈ پریشر اور ذیابطیس کے مریض تھے اس لیے دوائیں پابندی سے کھاتے تھے۔ طرز زندگی نہایت سادہ رہا۔ دل کے غنی تھے۔ دولت کی ہوس کبھی نہیں کی۔ بچوں کی نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر جانے کی وجہ سے افسردہ ضرور رہنے لگے تھے۔ جو رقم ڈوب گئی اس میں وہ بھی شامل تھی جو انھوں نے حجِ بیت اللہ کے ارادے سے رکھ چھوڑی تھی۔ حج ادا نہ کرنے کا غم ان کے دل کو کچوکے لگاتا رہا۔ شعرا کے حلقے میں اپنی ناقدری کے احساس نے انھیں بہت صدمہ پہنچایا۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک استاد کی حیثیت سے وہ جس عزت و احترام کے مستحق

تھے اہلِ سیوان نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔

ڈاکٹر شمس الضحیٰ شمس جالوی نے اپنے تحقیقی مقالے ''بہار کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کا اثر'' میں لکھا ہے کہ کوثر صاحب ۱۹۸۴ء میں انتقال فرما گئے (ص ۱۳۴)، یہ بات درست نہیں۔ ۸۴ء میں جوہر سیوانی کا انتقال ہوا تھا کوثر صاحب کا نہیں۔ ان کا وصال تو ۲۰۰۳ء میں ہوا۔

دسمبر ۲۰۰۲ء میں کوثر صاحب موضع حسن پورہ ضلع سیوان کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد غدۂ مثانہ میں خرابی کے سبب دفعتاً پیشاب رک گیا۔ ڈاکٹر ہارون نے نلی لگادی اور آپریشن کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سولہ دسمبر کو نرسنگ ہوم میں بھرتی ہوئے۔ اٹھارہ دسمبر کو ڈاکٹر ہارون نے ان کا آپریشن کیا۔ دو ہفتے بعد وہ وہاں سے گھر واپس آئے۔ ابھی پیشاب کی نلی لگی ہوئی تھی۔ تین جنوری ۲۰۰۳ء کو نلی سے خون آنا شروع ہو گیا۔ اسی دن انھیں پھر نرسنگ ہوم میں بھرتی کیا گیا۔ ۴/ جنوری کو دو بجے دن میں ان کا دوبارہ آپریشن کرنا پڑا۔ ڈاکٹر ہارون سیوان سے باہر تھے لہٰذا آپریشن ڈاکٹر عامر ریحان لاری نے کیا۔ اس آپریشن کے بعد کوثر صاحب کی صحت سنبھل نہیں سکی۔ ریاح خارج نہیں ہونے کی وجہ سے پیٹ پھولتا گیا۔ پیٹ کے دائیں جانب تیز درد بھی ہونے لگا۔ ۷/ جنوری کو ڈھائی بجے دن تک وہ گفتگو کرتے رہے تھے۔ جب تکلیف زیادہ بڑھی تو تین بجے دن میں انھیں نیند کی سوئی دی گئی۔ شام میں ڈاکٹر عشرت حسین کوثر صاحب کے دل کا معائنہ کرنے آئے انھوں نے بتایا کہ ابھی دل قابو میں ہے لیکن پٹنہ لے جانے کی صلاح دی۔ رات میں ہی انھیں پٹنہ لے جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ نو بجے ایمبولنس بھی آگئی لیکن ٹھیک اسی وقت ان کی الٹی سانس چلنی شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ۷/ جنوری بروز منگل پونے دس بجے رات میں یہ بلبلِ خوش نوا عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو پرواز کر گیا۔ شہر اور اس کے مضافات میں یہ خبر تیزی سے پھیلی اور بالخصوص ادبی حلقے میں افسردگی کی لہر دوڑ گئی۔ ۸/ جنوری کو ظہر کی نماز کے بعد ان کا جنازہ اٹھا۔ نیا قلعہ کے میدان میں پون گھنٹہ تک ان کی صاحب زادی کا انتظار ہوتا رہا جو مظفر پور سے آ رہی تھیں۔ عصر سے کچھ پہلے ان کے پیر و مرشد الحاج حافظ علی احمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مغرب کی اذان سے نصف گھنٹہ قبل کربلا قبرستان سیوان میں مدفون ہوئے۔

ابر احسنی گنوری کا شاگرد ہونے کی وجہ سے کوثر صاحب کا تعلق داغ اسکول سے تھا۔ وہ اس سلسلے کی روایات کا عمر بھر احترام کرتے رہے۔ وہ سیوان کی ادبی محفلوں کے روح رواں تھے۔ ان کی حیثیت میر کارواں کی تھی۔ وہ سب کو ساتھ لے کر چلنے میں یقین رکھتے تھے۔ بغض و کینہ سے ان کا دل صاف تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ مقامی شعرا آپسی چپقلش سے دور رہیں اور اپنا وقت اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے میں صرف کریں لیکن افسوس کہ ان کے چند سرپھرے شاگردوں نے ہی اس کوشش کو ناکام کر دیا۔ کوثر صاحب کے رہنے سے شعرا کو اس بات کا اطمینان تھا کہ ان کے

درمیان ایک استاد موجود ہے جو ان کی غلطیوں اور خامیوں کی اصلاح کردے گا۔ کوثر صاحب کے وصال کے بعد سیوان میں ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں رہا۔ انھوں نے اپنے کسی شاگرد کو فارغ الاصلاح قرار نہیں دیا تھا۔ سلسلۂ داغ کی اس شمع کے بجھنے سے جو تاریکی پھیلی ہے مستقبل قریب میں اس کے دور ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

کوثر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے مطالعے کی علت نہیں پالی۔ رسائل و جرائد بھی کم ہی پڑھتے تھے۔ ان کا فن اس کمی کی وجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''عکسِ تخیل'' میں جو کلام شامل ہے وہ ان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے اس لیے فطری طور پر اس میں اثر آفرینی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ زیرِطبع مجموعے ''جنوں کی آگہی'' کی غزلیں پہلے مجموعے سے بہتر ہیں۔ ان کی غزلیں بالعموم طرحی ہیں۔ طرحی کلام کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آمد اور آورد کا فرق یہاں زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ کوثر کی فکر کا دائرہ وسیع نہیں لیکن ان کے یہاں احساس کی شدت ضرور پائی جاتی ہے۔ انھوں نے پیچیدہ طرزِ بیان کبھی اختیار نہیں کیا۔ اپنے جذبات کی ترجمانی ہمیشہ سادہ انداز میں کی۔ اس سادگی میں ہنرمندی کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں راست بیانیہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ صداقتِ احساس کے باوجود وہ اپنی نظموں میں ایک خاص سطح سے بلند ہوتے نظر نہیں آتے۔ غزلوں اور نظموں کے برعکس رباعیوں میں ان کے فن کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں لیکن افسوس کہ انھوں نے اس صنفِ سخن پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ کوثر نے نعتیں بھی لکھیں ہیں اور منقبت بھی۔ اہلِ بیت اور شہدائے کربلا کی شان میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان میں بیش تر چیزیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ایسی تخلیقات میں انھوں نے جا بجا استادی کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان میں معنوی تہہ داری بھی ہے اور جذبے کا خلوص اور سوز بھی۔ کوثر کے چاہنے والے انھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

کوثر صاحب کے حالاتِ زندگی راقم الحروف نے ۲۰/مئی ۲۰۰۱ کو ان سے ملاقات میں حاصل کیے تھے۔ شخصیت سے متعلق معلومات میرے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ مضمون لکھنے کے بعد میں نے انھیں دکھا بھی لیا تھا تا کہ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو وہ اس کی تصحیح کردیں۔ افسوس ہے کہ یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ کلام کا انتخاب ''عکسِ تخیل'' اور زیرِطبع مجموعے ''جنوں کی آگہی'' سے کیا گیا ہے۔ آخر کے دو اشعار علاحدہ سے ہیں۔

انتخابِ کلام

کوثر گزر بھی جائیں تو روشن رہے حیات　　ایسا کوئی چراغ منوّر تراشیے

◉

تیری محفل میں کئی دل ٹوٹے　　جا ستمگر تری محفل ٹوٹے
ذہن جاگے تو قیامت ہو بپا　　کاش غفلت کی سلاسل ٹوٹے

بات پتھر نہ سہی پھول سہی
پھول ہی سے نہ کہیں دل ٹوٹے
ہے یہی شانِ مسافر کوثرؔ
دم جو ٹوٹے سرِ منزل ٹوٹے

◉

وہ کیا ٹھہر سکے گی تمازت کے روبرو
سورج کے منہ پہ برف کی چادر نہ پھینکیے
قطروں کے دم قدم سے سمندر کا ہے وجود
یوں قطرہ قطرہ کر کے سمندر نہ پھینکیے

◉

اسی سے پوچھیے ماضی کی عظمتوں کی کسک
جو جا کے قصرِ کہن کے کھنڈر میں کھو جائے
خدا کی ذات میں کھونا کمال ہے لیکن
یہ کم نہیں کہ بشر خود بشر میں کھو جائے
یہ اور بات ہے کوثرؔ کہ سر نہیں جھکتا
جھکا دوں سر تو ترا در ہی سر میں کھو جائے

◉

مرتا ہوں تو مرنے کا طریقہ نہیں آتا
جیتا ہوں تو جینے کی ادا یاد نہیں ہے

◉

میسّر نہ تھی جن کو چشمِ بصیرت
وہ کیا دیکھ لیتے اگر دیکھ لیتے

◉

دل جو اک بار بجھ کے رہ جائے
روشنی عمر بھر نہیں آتی

◉

غم تو خود سنگ ہے پھر آپ کا یہ سنگِ سلوک
سینہ پھٹ جائے گا پتھر پہ نہ پتھر رکھیے

◉

اے کاش قیدِ زیست سے ملتی مجھے نجات
کیا جانے میری موت کہاں جا کے مر گئی

◉

موت آئی ہے زندگی لے کر
مر کے جینے کا خواب دیکھا ہے

◉

خود ہی مانگے کی ہے واپس یہ چلی جائے گی
دہر ناپید سے کیا ہستیِ فانی مانگے

◉

مجھے کیوں نہ ہو تری جستجو تجھے کیوں نہ ہو مری آرزو
تجھے میرے سر کی تلاش ہے مجھے تیرے در کی تلاش ہے

◉

ملے گا اس کے سہارے سے زندگی کا پتا
یہ کارواں نہ سہی کارواں کی دھول سہی

◉

کچھ دیر میں وہ خود ہی اُلٹتے نقابِ رُخ
دستِ جنوں سے اتنا تحمل نہ ہو سکا

◉

کب بدل جائے گھر کرایے کا
گھر میں سامان کم سے کم رکھیے
آپ کو لوگ جان لیں نہ کہیں
جان پہچان کم سے کم رکھیے

◉

بڑھیں کیا مراسم خطا پر تو نادم
نہ تم ہو رہے ہو نہ ہم ہو رہے ہیں

◉

ربابِ عیش کو مضرابِ دل چھیڑے تو کیا چھیڑے
لبِ مجبور محرومِ تبسم ہے جہاں میں ہوں
خدا جانے تلاشِ دوست میں یہ کیا مقام آیا
پریشاں دل نظر حیراں خرد گم ہے جہاں میں ہوں

◉

سنائی دینے لگے دل کے ٹوٹنے کی صدا
کسی کا درد اگر اپنا درد ہو جائے

◉

تلخ حقیقت کے شعلے جب وقت کا سورج اگلے گا
اڑ جائینگے بھاپ کی صورت کوثرؔ یہ برفیلے لوگ

◉

حیاتِ دہر کے اسرار کُھل گئے خود ہی
غلافِ وہم و گماں جب یقیں نے کھینچ لیا

◉

کیوں نہ فن کار کا ڈھالا ہوا پیکر جاگے
روحِ فن پھونک دے پتھر میں تو پتھر جاگے
جاگ کر جب تھا جگانا تو نہ جاگے خود ہی
سو گئی قوم تو سوئے ہوئے رہبر جاگے
لبِ خوددار نے پینا ہی نہ چاہا کوثرؔ
یوں پلانے کو سمندر پہ سمندر جاگے

◉

جو خود میں خود ہے مقید وہ آدمی ہوں میں
جدید دور کا زندانِ زندگی ہوں میں
خود آگہی کے جنوں میں بھی ہوش مندی ہے
جسے شعورِ خودی ہے وہ بے خودی ہوں میں
جو توڑ دو گے مجھے خود بھی ٹوٹ جاؤ گے
کہ ارتباطِ سلاسل کی اک کڑی ہوں میں

◉

کہاں کہاں کی نہ چھانی تھی خاک کوثرؔ نے
مگر تلاش تھی جس کی وہ اس کے اندر تھا

◉

یہ وہ جہاں ہے جہاں یہ جہاں نہیں ملتا
یہاں سراغِ مکین و مکاں نہیں ملتا

یہ عکس عکس سراپا ہے عکسِ ذات نہیں — کہ آئینے میں تو عکسِ نہاں نہیں ملتا
نفس نفس میں ہے کوثر تضادِ فکر و خیال — زباں زباں سے بیاں سے بیاں نہیں ملتا

◉

ظلمت زدہ حیات منور ہو کس طرح — کوثر ابھی تو ماہِ بصیرت گہن میں ہے

◉

مکاں سے لا مکاں تک آ گئے ہیں — جنوں میں ہم کہاں تک آ گئے ہیں
وہ جانیں اب کہاں جانا ہے ہم کو — ہم ان کے آستاں تک آ گئے ہیں
وہیں کوثر چلی آئی ہے منزل — سفر میں ہم جہاں تک آ گئے ہیں

◉

مانجھی نے تہِ آب کا منظر نہیں دیکھا — رہ کر بھی سمندر میں سمندر نہیں دیکھا
فنکار نے مرمر کے تراشا جسے کوثر — کیا آپ نے مرمر کا وہ پیکر نہیں دیکھا

◉

تری محفل میں تو ہے زندگی دوچار مشکل سے — مگر جینا بھی مشکل ہے نکل کر تیری محفل سے
بھنور سے بچ بھی جائے تو کہاں جا کر لگے کشتی — اٹھا کرتے ہیں اب طوفان بھی دامانِ ساحل سے

◉

میرے نغموں کو سرِ بزم ترسنے والو — بے صدا کیوں ہے مرا ساز کہو تو کہہ دوں

◉

ان کے چہرے پہ جو چہرہ ہے کئی برسوں سے — آج اس چہرے کو چہرے سے ہٹا لوں تو چلوں
ان کی گفتار کا آئینہ تو دیکھا میں نے — ان کے کردار کا آئینہ دکھا لوں تو چلوں

◉

مجھ سے کیا منکرِ احساں ہی سے پوچھے کوئی — کس کا احسان فراموش پہ احساں ہے ابھی

◉

مدت سے جس کی یاد منائی نہیں گئی — وہ کون تھا شہیدِ وفا یاد کیجئے

◉

جو نورِ حسن کا حامل نہیں ہے — وہ کوئی اور شے ہے دل نہیں ہے
بقا ہے موت کی منزل سے آگے — فنا میں زیست کی منزل نہیں ہے

◉

دلکش ہے یہ صنم تو اسے گھر ہی لے چلیں
پتھر کا ہے تو کیا ہوا پتھر ہی لے چلیں

صحرا نہ گلستاں نہ کہیں اور اے جنوں
چل تجھ کو روبروئے ستم گر ہی لے چلیں

اس شہرِ دل نشیں میں ٹھہرنا کہاں نصیب
آنکھوں میں رنگ و نور کا منظر ہی لے چلیں

◉

اہلِ وطن کے دل میں خلوص و وفا تو ہے
جشنِ وفا مناتے ہیں خونِ وفا کے بعد

کوثر یہ کیا خلا میں ہماری تلاش ہے
بھرتے ہیں ہم اڑان حدودِ خلا کے بعد

◉

دیکھ لینا بڑھ گئی تو بڑھ کے کیا لے جائے گی
پیاس کی شدت سمندر کو اٹھا لے جائے گی

گردشِ ایام ہر شے کو بالآخر ایک دن
انتہا پر لا کے سوئے ابتدا لے جائے گی

دورِ حاضر کی ہوا کا اور ہی انداز ہے
کون جانے کس طرف کس کو اڑا لے جائے گی

مجھ کو دیتی ہے صدا میری صدائے بازگشت
اب کہاں کوثر مجھے کوئی صدا لے جائے گی

◉

مٹ کر بھی یادگارِ زمانہ ہو زندگی
کوثر فنا کے بعد بھی ایسی بقا ملے

◉

پتھروں میں تھا جو گوہر وہ چرا کر لے گیا
لوگ سمجھے جوہری پتھر اٹھا کر لے گیا

دیکھنے والے وہ منظر دیکھتے ہی رہ گئے
انقلابِ وقت کس کو کیا بنا کر لے گیا

یہ تو مشکل ہے بتا نا دے گیا کیا کیا مجھے
کائناتِ زندگی وہ مسکرا کر لے گیا

◉

کبھی جو دھوپ میں سایہ نہ بخشے
بھلا وہ شاخ کیا اور وہ شجر کیا

سحر ٹھہری نہ کوئی شام ٹھہری
یقیں ٹھہرے گزرتے وقت پر کیا

کسی در سے تو کوثر لو لگا لو
بھٹکتے ہی رہو گے عمر بھر کیا

◉

تراشا تھا جو بت گر نے وہ پتھر کا صنم ٹوٹا
خدا جانے کہ شانِ بت گری پر کیا ستم ٹوٹا

فقط اک رات کی بخشی گئی تھی زندگی اس کو
نمودِ صبح ہوتے ہی چراغِ شب کا دم ٹوٹا

◉

نہ پوچھو مرتبہ اس زندگی کا
جو گزری امتحاں سے امتحاں تک

◉

ان پہ کوثر نہ کسی آگ کا ہوتا ہے اثر
وقت کی آگ میں جو خود کو تپا دیتے ہیں

◉

جنوں سے ہوش تک پہنچا نہیں ہے
وہ سر جس میں ترا سودا نہیں ہے
اسے خود ڈھونڈنے نکلی ہے منزل
جسے منزل کی کچھ پروا نہیں ہے
یہ اس کے ظرف کی عظمت ہے کوثر
جو چھلکانے سے بھی چھلکا نہیں ہے

◉

میں نے تو اک خلوص کی چھیڑی ہے داستاں
ہونے لگی ہے ان کی جبیں کیوں عرق عرق
کوثر مرے وجود کی تاریخ دیکھ لے
لکھا ہے دستِ وقت نے کیا کیا ورق ورق

◉

بڑھنے لگے خود ان کے قدم سوئے لا مکاں
جو اپنی جستجو میں مکاں سے نکل گئے

◉

غیروں کو چھاؤں دے کے جلے خود ہی دھوپ میں
ایسی کہاں پناہ جو مثلِ شجر ملے

◉

بدنام گلستاں میں خزاں ہی تو ہے مگر
کیا کیا نہ گل کھلے ہیں بہاروں کی گود میں

◉

یہ کہیں اور مجھے چھوڑ کے تنہا نہ گئی
ہے وفادار تو کوثر مری تنہائی ہے

◉

مانند شام صبح بھی ظلمت زدہ ہے کیوں
کوثر سحر سے نورِ سحر کون لے گیا

◉

کیا بات تھی کہ جا کے درِ خرقہ پوش پر
کرتی تھی خسروی بھی گدائی تمام رات
آتی جو نیند ملتی نہ کوثر متاعِ زیست
تھی مصلحت کہ نیند نہ آئی تمام رات

◉

بلندی پہ جا کر بھی ٹھہرا نہ کوئی
زمیں پر گرے آسماں کیسے کیسے
ہر اک گام پر ان سے قربت تھی پھر بھی
رہے فاصلے درمیاں کیسے کیسے
اٹھا جب حقیقت کا پردہ تو کوثر
ہوئے چہرے چہرے دھواں کیسے کیسے

◉

چھلکانے والے خود ہی چھلکتے چلے گئے
کوثر تو اپنے ظرف کی گہرائیوں میں تھا

◉

نہ جانے ڈوب کے خورشید کب نکلتا ہے
دیارِ عشق میں شام و سحر نہیں ہوتی

جگر کے خون سے سینچا تو کیا ہوا کوثر
ہر اک شجر سے امیدِ ثمر نہیں ہوتی

◉

فکر و فن، رنج و محن دار و رسن سے آگے
امتحاں اور بھی ہیں گور و کفن سے آگے

دم بدم آتے نظر دل کے نظارے کیا کیا
کاش تم دیکھتے پیراہنِ تن سے آگے

تھک کے کیوں بیٹھ گئے راہِ سخن میں کوثر
فن کی منزل ہے ابھی مشقِ سخن سے آگے

◉

وہ تجھ کو توڑ کے مثلِ حباب کر دے گا
ترا غرور تجھے آب آب کر دے گا

کبھی تو پھیلے گی باغِ حیات میں خوشبو
گلاب کھل کے فضا کو گلاب کر دے گا

دکھا کے چہرۂ ماضی کے خدّ و خال تجھے
سوالِ دورِ رواں لاجواب کر دے گا

◉

بھٹک جاتے ہیں رہبر رہبری میں
کچھ ایسی منزلیں ہیں زندگی میں

◉

بحرِ خاموش میں ہل چل تو مچائی تم نے
کیسے کہتے ہو کہ برپا کوئی طوفاں نہ کیا

بزمِ ہستی کے اندھیروں کو مٹانا تھا جنھیں
ان چراغوں نے کبھی مل کے چراغاں نہ کیا

ٹوٹنے کو تو قیامت پہ قیامت ٹوٹی
پھر بھی کوثر نے عیاں گوشۂ پنہاں نہ کیا

◉

دکھا دے عکسِ حقیقت تو ہوش اڑ جائے
یہ کیسا آئینہ آئینہ گر بناتا ہے

یقینِ قلب بھی ہوتا ہے جب شکارِ گماں
بشر کو عزمِ بقا معتبر بناتا ہے

جو پتھروں سے بھی ٹکرا سکے وہی کوثر
دیارِ سنگ میں شیشے کا گھر بناتا ہے

◉

تاریخ ہے گواہ کہ انجامِ کربلا
ہے فتحِ حق کی صبح تو باطل کی شام ہے

صبرِ حسین، صلحِ حسن، جنگِ حیدری
تینوں سے دینِ حق کی بقائے دوام ہے

◉

بازغ بہاری

شامتِ اعمال

جب محفلِ گیتی سے مرا اُٹھ گیا دانہ — آخر ہوا دنیا سے اچانک میں روانہ
پہنچی جو مری روح ستاروں کی زمیں پر — آئی یہ صدا غیب سے رُک جاو یہیں پر
کھاتا لیے نازل ہوئے پھر چند فرشتے — ہر فعل و عمل کے مرے جس میں تھے نوشتے
داروغۂ رضواں نے رجسٹر کو جو کھولا — تفتیشِ عمل کے لیے ہر پیج ٹٹولا
لکھا تھا ہے یہ طنز و ظرافت کا مداری — بنگال میں رہتا ہے مگر ہے یہ بہاری
ہر لمحہ گریزاں یہ رہا جام و سبو سے — اور دور رہا صبح و مسا کذب و غلو سے
منت کشِ نقاد و محقق یہ نہیں ہے — حق بات کہا کرتا ہے فاسق یہ نہیں ہے
قلاش ہے لیکن نہیں پروردۂ الحاج — کرتا ہے فقط طنز سے یہ قوم کی اصلاح
نشتر جو لگاتا ہے یہ منقارِ قلم سے — بتھے سے اُکھڑ جاتے ہیں بھگوان ادب کے
فرمایا فرشتے نے ہے یہ مست قلندر — لے جاو اِسے جنتِ فردوس کے اندر
جنت میں عجب دیکھی مشیت یہ خدا کی — تھی بیٹھی ہوئی باغِ اِرم میں مری بیوی
کی عرض فرشتے سے وہ بیٹھی ہے جو بڑھیا — زوجہ ہے مری وہ مگر آفت کی ہے پڑیا
اس شامتِ اعمال پہ لعنت ہو خدا کی — اس صورتِ دجّال پہ لعنت ہو خدا کی
چالیس برس تک مجھے دنیا میں ستایا — ماں باپ کے ایما پہ مجھے خوب رُلایا
یہ بات بھلا پھر ہو مجھے کیسے گوارہ — میں ساتھ رہوں پھر اسی آفت کے دوبارہ
تسلیم نہیں، میں نے کہا مجھ کو یہ جنت — للہ، مجھے کیجئے دوزخ ہی عنایت
آرڈر ہوا، لے جاو اِسے سوئے جہنم — لے جا کے سونگھاو اسے خوشبوئے جہنم
پھر گیٹ پہ دوزخ کے جو پہنچا تو میں ٹھنکا — افتاد نئی دیکھ کے ماتھا مرا ٹھنکا
یک لخت مرا ہونے لگا ہائی پریشر — دیکھا جو میں نے سامنے دلدوز وہ منظر

تقدیر کی گردش مرے پیچھے یوں پڑی تھی
دروازۂ دوزخ پہ مری ساس کھڑی تھی

145/B. C.R. Avenue
Kolkata - 700 007 (W.B)

ظفر کمالی

عرب کی کمائی

عرب کی کمائی گھروں میں جو آئی　　قیامت پہ اس نے قیامت اٹھائی
عجب عقل میں آگ اس نے لگائی　　سبھی بھول بیٹھے خدا کی خدائی

جو کل خشک تھے آج تر بن رہے ہیں
جو مادہ صفت تھے وہ نر بن رہے ہیں

کسی کا سعودی عرب ہے نشانہ　　کسی لب پہ بحرین کا ہے ترانہ
زباں پر ہے دوحہ قطر کا فسانہ　　تصدّق ہے کویت پہ سارا زمانہ

نظر بامِ دولت پہ لٹکی ہوئی ہے
ہر اک سانس ہُنڈی میں اٹکی ہوئی ہے

جنھیں تھا میسّر نہ دال اور دَلیا　　انھیں اب تو بھائے پلاو نہ قلیا
بجاتے ہیں بیٹھے خوشی کی مُرلیا　　زمانے کی نظروں میں وہ تو ہیں چھلیا

کہیں شامِ رنگیں کہیں جام و خُم ہے
حیات ان کی دولت کی مستی میں گم ہے

جو بہنے لگی مال و دولت کی گنگا　　نظر اس میں آنے لگا جسم ننگا
بھڑکنے لگا اپنے اپنوں میں دنگا　　الجھنے لگا آندھیوں سے پتنگا

اچانک جو دولت کا سیلاب آیا
ہوس کے سمندر میں گرداب آیا

ڈرافٹ[1] آ رہا ہے تو سرشار ہیں سب　　جو بھیجے اسی کے طرفدار ہیں سب
سبھی یار اس کے مددگار ہیں سب　　وہ چاہے نہ چاہے وفادار ہیں سب

کہیں کیا کہاں کھچڑیاں پک رہی ہیں
یہاں پک رہی ہیں وہاں پک رہی ہیں

۱۔ 'ڈرافٹ' کا 'ن' بحر میں غرق ہوگیا۔ (ظ-ک)

مقدر کے ایسے بنے ہیں سکندر　　کہ لے ناریل ہاتھ میں جیسے بندر
جو اندھے کنویں تھے ہوئے وہ سمندر　　لگے کیوں نہ پھانسی کلیجے کے اندر

ضرورت سے بڑھ کر ہیں پھولے غبارے
دکھاتے ہیں سورج کو آنکھیں شرارے

جدھر دیکھیے ہیں شرارت کی باتیں　　عزیزوں سے اپنے بغاوت کی باتیں
کہیں ہو رہی ہیں عداوت کی باتیں　　کدورت کی لعنت ملامت کی باتیں

دلوں میں کہیں خاکساری نہیں ہے
مروّت نہیں انکساری نہیں ہے

جو کوّے تھے وہ بھی چہکنے لگے ہیں　　جو پتے نہ تھے وہ بھکنے لگے ہیں
جو ٹھنڈے تھے شعلے لپکنے لگے ہیں　　بھڑکنے لگے ہیں دہکنے لگے ہیں

بڑھی جس قدر ہے دماغوں میں گرمی
کہاں اس قدر ہے ایاغوں میں گرمی

کہیں فلس پیسہ ہوا بیس سالہ　　کہیں کوئی 'لاکر[1]' میں رکھے قبالہ
نگلتا ہے سونے کا کوئی نوالہ　　کوئی پی رہا ہے ہوس کا پیالہ

کوئی اپنی بہبود کی فکر میں ہے
کوئی سود در سود کی فکر میں ہے

سبھوں کی ہے خواہش مکاں وہ بنائیں　　بہشتِ بریں کو انگوٹھا دکھائیں
کمائیں جو دولت تو اتنی کمائیں　　کہ قاروں کو خاطر میں ہرگز نہ لائیں

گئی آسماں پر زمینوں کی قیمت
نصیحت ہوئی ہر قدم پر فضیحت

جو پیسہ ہوا تو بنے گھر جمائی　　جگہ تھی جو اپنی ہوئی وہ پرائی
کریں کیا جمی ہے دماغوں میں کائی　　ہوئے اپنی سسرال کے ہی فدائی

بڑے شوق سے باپ ماں کو بھی چھوڑا
رہیں کیوں نہ خوش خانداں کو بھی چھوڑا

۱۔ Locker

ترقّی کا مینار خود کو سمجھ کر لیاقت کا معیار خود کو سمجھ کر
ہر اک فن کا بازار خود کو سمجھ کر نیا راج دربار خود کو سمجھ کر

کریں کھول کر دل وہ ہرزہ سرائی
نہیں اس کی پروا کہ ہو جگ ہنسائی

وہی ہیں وہی اپنے حلقے کے سلطاں زمیں پر ہیں وہ مثلِ ماہِ درخشاں
سلامی دیں آکر انھیں جنّ و انساں کرے رشک دیکھے اگر ان کو رضواں

وہ عظمت کی گردان گردانتے ہیں
مگر سب انھیں خوب پہچانتے ہیں

کوئی ہیرو ہونڈا کوئی کار میں گم ہے درہم میں گم کوئی دینار میں گم
کوئی ہو گیا اپنے پرچار میں گم کہیں کوئی پائل کی جھنکار میں گم

لہو کی خرابی نے یہ دن دکھایا
جو کِھلنا نہیں تھا وہ گل بھی کھلایا

کوئی فون کرنے میں پیسے گنوائے کوئی واہ واہی میں سب کچھ لٹائے
کوئی اتنا معیار اونچا اٹھائے بہو بیٹیوں کو کلب میں نچائے

رہی جام سے زیست کی شام روشن
ہوا ان کا دنیا میں یوں نام روشن

جو ڈالر کا سر پر ہے سایہ گھنیرا تو بیگم کا گھر میں ہو کیسے بسیرا
لگاتی ہیں بازار کا روز پھیرا نہیں دور ہوتا ہوس کا اندھیرا

میاں کی کمائی اڑا کر مگن ہیں
وہ جلوے پہ جلوہ دکھا کر مگن ہیں

جواں ہے جو بیٹا اکڑنے لگا ہے کہ پریوں کا سایہ بھی پڑنے لگا ہے
جو بننے سے پہلے بگڑنے لگا ہے وہ سانڈوں سے شانے رگڑنے لگا ہے

بڑھی آبرو اس طرح باپ ماں کی
ہوئی ناک اونچی بہت خانداں کی

عجب ان کی اولاد کی تربیت ہے ۔۔۔ کہ ہر اک کو سگریٹ گٹکے کی لت ہے
سیانا ہوا جو وہ بگلا بھگت ہے ۔۔۔ خطاؤں پہ اپنی کہاں معذرت ہے

خیالی تھی عزت اسے بھی لٹا کر
چلیں راستہ عطر میں وہ نہا کر

چڑھی بن کے تپ جب ریالوں کی حدّت ۔۔۔ تغیّر کی زد میں تب آئی جبلّت
طبیعت میں شدّت خیالوں میں جدّت ۔۔۔ الگ ان کا دوزخ الگ ان کی جنّت

لگے یوں کہ وہ ماورائے بشر ہیں
چلیں ایسے جیسے خدائے بشر ہیں

جو تھا گلف میں اصطبل کا سپاہی ۔۔۔ خیالوں میں اس کے سمائی ہے شاہی
کھلاتا ہے لوگوں کو وہ مرغ و ماہی ۔۔۔ کہ بن جائے ان کا وہ ظلِّ الٰہی

سیاہی سفیدی کو آنکھیں دکھائے
کبوتر بھی شاہیں سے پنجہ لڑائے

دماغوں میں آلائشیں بڑھ گئی ہیں ۔۔۔ تو شادی میں فرمائشیں بڑھ گئی ہیں
یکا یک جو آسائشیں بڑھ گئی ہیں ۔۔۔ 'محبت' کی پیدائشیں بڑھ گئی ہیں

انگوٹھی کسی کی، کسی کا نگینہ
حیا کو بھی آتا ہے دانتوں پسینہ

جو ہو گھر میں شادی تو یاروں کا لشکر ۔۔۔ براتوں میں جاتا ہے کاروں کا لشکر
بیاہوں کا لشکر کنواروں کا لشکر ۔۔۔ چلے ساتھ میں ماہ پاروں کا لشکر

یہ احوال ان کے یہ ان کے کوائف
اِدھر طائفہ ہے اُدھر ہے طوائف

نمائش تو ان کے در و بام میں ہے ۔۔۔ عقیقے میں ختنے میں ہر کام میں ہے
یہ تکلیف میں ہے یہ آرام میں ہے ۔۔۔ یہ ہر 'گورخر' میں ہے بہرام میں ہے

نمائش کا غازہ جو ہے تازہ تازہ
نکالے گا وہ اقتصادی جنازہ

کہاں ہیں جہالت پہ شرمانے والے کہاں خاکِ غیرت میں گڑ جانے والے
ہر اک سو ہیں اپنے پہ اترانے والے شریفوں کو رہ رہ کے دھمکانے والے
نشے میں وہ دولت کے ماضی کو بھولے
وہ دولھا ہیں ایسے جو قاضی کو بھولے

نہ ان کے مرض کو دوا کی ضرورت نہیں پیش آتی دعا کی ضرورت
سمجھتے نہیں ہیں حیا کی ضرورت ہے پیسہ تو پھر کیا خدا کی ضرورت
مسلماں ہیں لیکن نمازی نہیں ہیں
پلٹ جائے ایسی وہ بازی نہیں ہیں

اگر ان کی اوقات کوئی بتا دے تو گویا فلیتے کو تیلی دکھا دے
انھیں آسماں سے زمیں پر گرا دے جو سویا ہوا ہو وہ فتنہ جگا دے
گلہ اپنا سن کر بہت تلملائیں
جو حق بات کہہ دے اسے کاٹ کھائیں

جو کہتا ہے ان سے کہ دنیا ہے فانی تو اس کو سناتے ہیں وہ لن ترانی
بھلی بات ان کے لیے چھیڑ خانی دکھائیں ضعیفوں پہ زورِ جوانی
عدالت کی رونق بڑھی ان کے دم سے
کمانِ عداوت چڑھی ان کے دم سے

شرافت کی پگڑی اُچھلنے لگی ہے نجابت بھی کروٹ بدلنے لگی ہے
ضلالت کی ہانڈی اُبلنے لگی ہے تمدن کی سانس اُلٹی چلنے لگی ہے
اُجالے اندھیروں میں ضم ہو گئے ہیں
ندامت سے سر کتنے خم ہو گئے ہیں

موحد ہیں لیکن انا پوجتے ہیں ہمہ دم یہ حرص و ہوا پوجتے ہیں
بنا کر نیا اک خدا پوجتے ہیں خدا جانے یہ اور کیا پوجتے ہیں
سمجھتے نہیں ہیں کہ دولت نئی ہے
سنبھل کر ہے رہنا محبت نئی ہے

جہالت کی ڈولی کہاروں سے آگے　　　خزاں بڑھ گئی ہے بہاروں سے آگے
حماقت کی منزل ستاروں سے آگے　　　یہ منظر ہے سارے نظاروں سے آگے

لٹے راہ میں کارواں اور بھی ہیں
''مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں''

ادھیڑوں پہ ایسی چڑھی ہے جوانی　　　جو بی بی تھی پہلی ہوئی وہ پرانی
کنواری ہی بیٹھی ہے بیٹی سیانی　　　ضروری تھا ان کو مگر عقدِ ثانی

بڑھاپا بھی ان کا بڑا معتبر ہے
عرب کے کسی شیخ کا یہ اثر ہے

یہ اپنی روایات سے بے خبر ہیں　　　یہ حُسنِ ہدایات سے بے خبر ہیں
یہ ٹیڑھے سوالات سے بے خبر ہیں　　　زمانے کے حالات سے بے خبر ہیں

اشارے مسلسل یہ ملنے لگے ہیں
جو مرجھا گئے تھے وہ کھلنے لگے ہیں

انھیں اک کمانے کا موقع ملا تھا　　　کہ بگڑی بنانے کا موقع ملا تھا
قدم کو جمانے کا موقع ملا تھا　　　یہ کچھ کر دکھانے کا موقع ملا تھا

مگر ہو گئی عید ان کی محرّم
ہوئے خود خلاف اپنے ایسے منظّم

کبھی سیدھے رستے پہ چلتے نہیں ہیں　　　یہ دلدل سے اپنی نکلتے نہیں ہیں
بدلنی تھی عادت بدلتے نہیں ہیں　　　سنبھلنے کے دن ہیں سنبھلتے نہیں ہیں

گرہ میں ہے جو مال کھوئیں گے جلدی
یہ ہنستے ہیں جلدی تو روئیں گے جلدی

جگن ناتھ آزاد

غزل

تجھے اے زندگی! پھر سینہ کاوی کا پیام آیا
بڑی مدت کے بعد ایک بار پھر مشکل مقام آیا

وہی اک جذبۂ دل تھا جو بن کر بزمِ عالم میں
کبھی صہبائے خام آیا، کبھی کاس الکرام آیا

ترا دردِ محبت راز رہتا بھی تو کیا رہتا
کہ ہر پھر کر مری ہر بات میں تیرا ہی نام آیا

نشانِ منزلِ مقصود کیا ملتا کہ رستے میں
کہیں بیت الصّنم آیا کہیں بیت الحرام آیا

بڑی مدت رہا مصروف سعی لب کشائی میں
بڑی مشکل سے میرے لب پہ حرفِ ناتمام آیا

مری حرص و ہوا نے دام پھیلایا بہت لیکن
نہ دنیا زیرِ دام آئی نہ عقبیٰ زیرِ دام آیا

کہاں عقل و خرد والے، کہاں موسم کی سرمستی
پیامِ فصلِ گل آیا تو دیوانوں کے نام آیا

مرے حق میں کہا اقبالؔ نے حالیؔ سے جنت میں
یہی اک کافرِ ہندی مسلمانوں کے کام آیا

جو دل میں بند تھا طوفاں، چھلک اٹھا وہ آنکھوں سے
سمندر پار سے اے دوست! جب تیرا سلام آیا

خرد والے بھی پُرامید تھے آزادؔ سے لیکن
یہ دیوانہ جو کام آیا تو دیوانوں کے کام آیا

A-25, Government Quarters,
Gandhi Nagar, Jammu Tawi - 180004

مظہر امام

غزل

ہونٹوں پہ درختوں کے مناجات نہیں تھی
کیا دشت میں اس بار تری ذات نہیں تھی

دامن پہ کہیں داغِ شناسائی نہیں تھا
ہر چند کہ یہ پہلی ملاقات نہیں تھی

چہرے پہ تبسم کی لکیریں تو وہی تھیں
پہلی سی مگر اب کے مدارات نہیں تھی

یہ عمر کے بادل تھے کہ تنہائی کے سائے
اس بار جو دیکھا اُسے، وہ بات نہیں تھی

الزام کسے دیں کہ زیاں کار ہمیں تھے
وجہِ غم دل گردشِ حالات نہیں تھی

اشکوں کی جھڑی دیکھ کے دھوکا سا ہوا تھا
کچھ اور ہی موسم تھا، وہ برسات نہیں تھی

اک شہرِ طلسمات ابھی تک ہے نظر میں
ہر سمت اندھیرا تھا، مگر رات نہیں تھی

پھر حوصلۂ جنگ لیے پھرتے ہیں دل میں
گر ہار ہماری تھی، مگر مات نہیں تھی

176-B. Pocket I, Mayur Vihar,
Phase I, Delhi - 91

غزلیں

رفعت سروش

بہت دشوار تھی منزل، مگر ہم بے خطر آئے
جہاں پر موت بٹتی ہے وہاں سے بھی گزر آئے

اسی سوکھے شجر پر کل ہمارا بھی نشیمن تھا
یہیں پر آنکھ کھولی تھی، یہیں پر بال و پَر آئے

سفینہ لے کے چل اے ناخدا طوفان کی زد میں
کبھی گرداب سے کھیلیں، کبھی ساحل نظر آئے

نظر کے سامنے تہذیب کی لاشوں کا منظر ہے
یہ پورا شہر قاتل ہے، کہاں سے نوحہ گر آئے

کریں گے رقص دیوانے، ابھی توڑیں گے زنجیریں
ذرا محفل تو اب ذوقِ تماشا رنگ پر آئے

ہمیں منظور ہے اس کھیل میں جاں سے گزر جانا
نہ کوئی حرف لیکن عشق کے کردار پر آئے

کہاں وہ ناز پرور اور کہاں یہ خانہ ویرانی
سروشؔ ان کو خرابے میں نہ آنا تھا، مگر آئے

A-80/27, Noida - 201301

دیپک قمر

پھر سے پیڑوں کے نئے کپڑے سلے
بیل بوٹے بن کے رنگیں گل کھلے

چند چھینٹوں سے اُٹھی دل میں اُمس
دھرتی کرتی برکھا موسم سے گِلے

دیکھ لو جی بھر کے چہرہ بولتا
جانے والا کیا خبر پھر کب مِلے

روشنی کیسے ہو دل کے بام پر
جم کے بیٹھی دُھند تو پہلے مِلے

اور کوئی بات کیوں سوجھی نہیں
جب مِلے کرتے رہے شکوے گِلے

کرنیں لیتی چٹکیوں پر چٹکیاں
گدگدی سے صبح کا چہرہ کھلے

سوچتا ہے کیا کرے کیسے کرے
چند لمحے اس کو فرصت کے ملے

HIG - B/52 Panday Nagar, Meerut - 250002 (U P)

غزلیں

یوسف ناظم

جفا و جبر کی ضد میں ستم گروں کے خلاف
علم اٹھا نہیں سکتا ہے گر قلم تو اٹھا

نہیں کے حلقۂ شب سے نکل نہیں سکتا
کہیں تو ہوگا کوئی راستا قدم تو اٹھا

وہ خامشی وہ گھٹن کچھ عجیب لگتی ہے
خدا کا شکر کہ بستی سے شورِ غم تو اٹھا

ہم اپنی تشنہ لبی کا علاج کر لیں گے
ہمارے آگے سے اپنا یہ جام جم تو اٹھا

وہ رنج تھا یا دکھاوا ہمیں نہیں معلوم
ہماری بات وہ سن کے بہ چشم نم تو اٹھا

وہ میرے پاس نہیں آیا پر غنیمت ہے
جناب شیخ کے پہلو سے وہ صنم تو اٹھا

Mumbai

کرشن کمار طور

حصول درد تو ہے لذت بیاں سے بھی کم
ہماری خوں شدگی رونق جہاں سے بھی کم

میں اپنے آپ کو آئینہ کیا دکھاؤں اب
طریق عقل تو ہے صورت گماں سے بھی کم

کہاں سے سیکھیں یہ دل مارنے کے نسخے
زمیں عدو نہیں اپنی کچھ آسماں سے بھی کم

کچھ اس کی آنکھ بھی خود نعمتی میں ہے مصروف
ہیں نکلے حرف دعا کچھ مری زباں سے بھی کم

یہ کس سلوک وفا کی امید رکھتے ہیں
ہے دوستوں میں کوئی وصف دشمناں سے بھی کم

مثال دیں بھی تو کیا وسعت نگاہ کی طورؔ
ہے طول و عرض میں صحرا کسی مکاں سے بھی کم

134/E. Khanyara Road.
Dharam Shala - 176215 (H.P)

شعور گوپال پوری

غزلیں

جب خون آرزو کی کوئی بات چل گئی
بے ساختہ اک آہ جگر سے نکل گئی

مجھ کو خوشی یہ ہے کہ ملا تحفۂ شکست
لیکن یہ کائناتِ وفا کیوں بدل گئی

اب تو ہر ایک حسن ہے ممنون عشق کا
اے حسنِ عشق تاب تری دھوپ ڈھل گئی

بن کر نشاط درد تری یاد کی کرن
ہونٹوں کی ایک موج تبسم کچل گئی

اک بار فرط شوق میں دوشیزۂ جمال
بانہوں میں اپنے آئی سمٹ کر پگھل گئی

وہ اب بھی نکہت گل و گلزار ہیں شعورؔ
کس کے لیے بہار خزاں میں بدل گئی

○

سلگ رہا ہوں کسی عشق کے بدن کی طرح
مگر نزاکت گفتار ہے چمن کی طرح

دہان زخم سے پھر ہو نہ جوئے خوں جاری
بڑھا ہے دست جنوں آج کوہکن کی طرح

ہر ایک ظلم کو مجھ سے پناہ ملتی ہے
مری حیات ہے یوسف کے پیرہن کی طرح

ملے گا لطف خیالوں کے نرم پودوں سے
چلے بھی آو ذرا جھومتے پون کی طرح

لطافتیں تری باتوں کی قید کرتا ہوں
بکھر گئی ہیں جو آوارۂ وطن کی طرح

اگر چہ دل کو جلایا ہے آنسوؤں سے شعورؔ
غزل ہوئی ہے مگر نافۂ ختن کی طرح

○

فہیم جوگاپوری

غزلیں

اشک ہوں پلکوں پہ ٹھہرا ہوں ابھی رک جاؤ
چند لمحوں کا تماشا ہوں ابھی رک جاؤ

رات کہتی ہے تمہیں چھوڑ کے جانا ہوگا
اور میں رات سے کہتا ہوں ابھی رک جاؤ

تم بھی بے خواب کئی راتوں کے لگتے ہو مجھے
میں بھی کچھ نیند کا مارا ہوں ابھی رک جاؤ

وقت تو چاہئے کچھ مجھ کو سنبھلنے کے لئے
شاخِ امید سے ٹوٹا ہوں ابھی رک جاؤ

اپنی صورت تو ذرا دیکھ لوں آئینے میں
آئینہ خانے میں بیٹھا ہوں ابھی رک جاؤ

کون ہوں کیا ہوں ابھی خود کو نہیں جانتا میں
جھیل ہوں، ندی ہوں، دریا ہوں ابھی رک جاؤ

وقت منصف ہے تو انصاف کرے گا اک دن
ہوں برا میں کہ میں اچھا ہوں ابھی رک جاؤ

دونوں اک دوسرے کے ساتھ چلیں گے کتنا
سوچ کر فیصلہ کرتا ہوں ابھی رک جاؤ

○

تیار ہونے والی ہے تلوار پھول کی
سنتے ہیں خیریت نہیں اب کے ببول کی

اک بار ہم نے ہنسنے کی بھولے سے بھول کی
مت پوچھ زندگی نے جو قیمت وصول کی

دورِ رواں میں ایسی کی تیسی اصول کی
سودا کیا ضمیر کا دولت قبول کی

کل رات بھوک نے یہ جگا کر کہا مجھے
چڑھتی نہیں ہے شام کو ہانڈی اصول کی

ہر گل شکن کے ہاتھوں سے خوشبو لپٹ گئی
اللہ رے یہ جرأت اظہار پھول کی

تنہا ہمیں بچے تھے اک شبیر کی طرح
سب نے یزید وقت کی بیعت قبول کی

ہونٹوں پہ کربلا کی کتھا آئے گی فہیم
دنیا میں جب بھی بات چلے گی اصول کی

طالب زیدی

ڈاکٹر خاورؔ خان سرحدی

غزلیں

درد ہی درد ہے احساس کی تابانی بھی
زور میں آئے تو پتھر سا لگے پانی بھی

میری اک جرأت رندانہ پہ غصہ کے سوا
ان کی آنکھوں میں نظر آتی ہے حیرانی بھی

جانے کیا پوچھ لیا ان کی نگاہوں نے سوال
چپ ہے دانائی تو خاموش ہے نادانی بھی

یاد میں چاہِ زنخداں کے برستی آنکھیں
دل وہ کھیتی ہے کہ چاہی بھی ہے بارانی بھی

بادشاہوں کو فقیری کا سمجھنا مشکل
اور فقیروں کے لیے کھیل جہاں بانی بھی

آج وہ عہدِ وفا کے لئے آمادہ ہیں
کتنی دشوار ہوئی جاتی ہے آسانی بھی

کیا بتائیں کسی درویش صفت کے گھر کو
رونقیں بخش گئی زینتِ سلطانی بھی

کوئی طالبؔ اسے بتلائے نہ جانے کب سے
دل ترے در کا سوالی بھی زندانی بھی

Al-Murtaza Society
Meerut.

پانی میں کوئی آگ لگا کر تو دیکھنا
آواز کا طلسم جگا کر تو دیکھنا

ہے کون محفلوں میں سراپا جمالِ حُسن
جلتے ہوئے چراغ بُجھا کر تو دیکھنا

موتی بنا کے نذر کروں گا کسی کو میں
آنکھوں میں آنسوؤ! مری آکر تو دیکھنا

اُن آندھیوں میں شمع جلا کر تو دیکھنا
اُجلی سی کوئی یاد اندھیروں میں آئی ہے

خاورؔ ہماری ذات سے تردید کی اُمید
الزام کوئی ہم پہ لگا کر تو دیکھنا

Sarai Miyan Delhi Gate,
ALIGARH - 202001

اسد ثنائی

غزلیں

تری یادوں کو اپنے ہاتھ سے برباد کرنا ہے
خبر کیا تھی کہ دل کو تیشۂ فرہاد کرنا ہے

نئے لفظوں کو دیتے ہیں لہو اپنے جگر کا ہم
مضامین ادق کو کچھ نہ کچھ امداد کرنا ہے

تری قربت سے کچھ لمحے مرے آباد ہوجاتے
پھر اس کے بعد تو یہ زندگی برباد کرنا ہے

خلوص و مہر و الفت کو وفاؤں کو ترستے ہیں
اب ان سوئے ہوئے جذبوں کو زندہ باد کرنا ہے

پھنسے ہیں ڈارون کی بے تکی تھیوری میں ذہن و دل
پکڑ کر آدمی کو پھر سے آدم زاد کرنا ہے

ابھی تو شہر جاں کی سرحدوں میں گم ہیں دیوانے
بھٹکنے دو! خودی کو یوں مشرف باد کرنا ہے

غزل زلفوں سے چھٹ کر کارزاروں میں نکل آئی ہے
مزاج شاعرانہ کو اسدؔ فولاد کرنا ہے

خودی کو اپنے بھیتر کھوجنا ہے
یہاں باہر کسی کو کیا ملا ہے

لگا کر کان سن دیوار جاں سے
ترے اندر بھی کوئی بولتا ہے

سجے ہیں جا بہ جا ست رنگ جذبے
مرا دل جیسے کوئی آئینہ ہے

ملیں گے کو بہ کو زخمی عنادل
یہی میرے گلستاں کا پتا ہے

ہے پچھلے سال سے ان کا تقاضہ
مرے بچوں کو سرکس دیکھنا ہے

میاں تم اس گلی میں کیسے آئے
یہاں فنکار فن کو بیچتا ہے

اسدؔ شاعر ہے یا دیوانہ عاشق
جو یوں دن رات بیٹھا سوچتا ہے

○

Editor 'Al-Ansar' Reyasath Nagar, HYDRABAD - 500059

پون شرما شؔرر سیوانی

غزلیں

وہ خط نہیں تھا حرف وفا کا ظہور تھا
خوشبو تھی تازگی تھی اُجالا تھا نور تھا

تھا وقت مہربان وہ کاوش نہ تھی کوئی
اہلِ شعور ہو گیا جو بے شعور تھا

اک دھند کیا چھٹی کی فضا صاف ہو گئی
لگتا تھا جو قریب وہی سب سے دور تھا

رخسار صبح چوم لیا شب نے دفعتاً
کل رات اس کی یاد کا دل میں ظہور تھا

ٹکرا کے ہم فقیروں کے ایمان و دین سے
جو سر کہ پر غرور تھا وہ چور چور تھا

مجھ پر فدا جہاں تھا جہاں پر فدا تھا میں
جب تک مرے لبوں پہ شؔرر جی حضور تھا

یوں سلیقے سے وہ لفظوں کو سجا دیتا ہے
اپنے ہر شعر کو تصویر بنا دیتا ہے

جانب دوست جو بڑھتا ہوں تو ماضی میرا
اپنے آغاز کا انجام بتا دیتا ہے

شاعری کا وہ جنوں تیغ و تبر میں بھی نہیں
قصرِ ظلمت کی جو بنیاد ہلا دیتا ہے

جسم میں زہر تکبر کا اتر جائے اگر
فکر و احساس و ہنر کند بنا دیتا ہے

کاٹ کر پَر مرا جو خوش ہے اسے کیا معلوم
مجھ میں وہ ہمت پرواز بڑھا دیتا ہے

آگ بھڑکی تو شؔرر خود بھی جھلس جائے گا
دشمن امن جو شعلوں کو ہوا دیتا ہے

○

Vishvkarma Motors, Babunia Road, SIWAN (Bihar) - 841226

غزلیں

خلیل الرحمٰن قاسمی

کہاں سے لاوں نظر اور وہ نظر کا چراغ
کہے زمانہ جسے حسنِ معتبر کا چراغ

تمام عمر جو روشن رہے ہنر کا چراغ
کہاں سے لاوں دعاوں میں وہ اثر کا چراغ

حصارِ ذات میں، میں قید ہو گیا ورنہ
تمھیں دکھاتا کہ کیا ہے مرے ہنر کا چراغ

جلاوں شمع وفا کیوں نہ میں زمانے میں
زمانہ سمجھے جسے اپنے سفر کا چراغ

ہر ایک شہر میں چرچا ہے اِن دنوں اُس کا
لیے جو پھرتا ہے ہاتھوں میں اپنے سر کا چراغ

تمام عمر کٹی جس کی تیرگی میں خلیلؔ
اُسی کے خون سے جلتا ہے اُس کے گھر کا چراغ

Jail Road, Pakki Sarai Road,
Muzaffarpur.

مقبول منظر

زباں سے ایسا کوئی لفظ ادا نہ ہو جائے
عزیز جو ہے بہت وہ خفا نہ ہو جائے

خلوص دل کا کہیں برملا نہ ہو جائے
وفا کی راہ میں حائل جفا نہ ہو جائے

بدن سے روح کی خوشبو جدا تو ہوگی ہی
خدایا زیست کا مقصد قضا نہ ہو جائے

بڑھا رہے ہیں محبت کا ہاتھ وہ لیکن
ہمارے بیچ کوئی فاصلہ نہ ہو جائے

قدم قدم پہ رکاوٹ ملے گی رستے میں
سفر میں پست کہیں حوصلہ نہ ہو جائے

دعا کا رکھ تو رہے ہو تم اس کے سر پہ تاج
دعا تمہاری کہیں بددعا نہ ہو جائے

لبوں سے اپنے تبسم ہے اس لیے ظاہر
مرے غموں سے کوئی آشنا نہ ہو جائے

چراغ حق کا جلا تو رہے ہو تم منظرؔ
ہوا زمانے کی تم سے خفا نہ ہو جائے

○

غزلیں

منظر اعجاز

لمحہ لمحہ عذاب کا جھیلوں
غم اگر ٹوٹے خواب کا جھیلوں

پیاس ہونٹوں پہ جمتی جاتی ہے
کیسے صحرا سراب کا جھیلوں

اک تعلق ہے زندگی سے مجھے
ہر ورق اس کتاب کو جھیلوں

خوشبوؤں کو کھرچ کے سانسوں سے
زرد موسم گلاب کا جھیلوں

برگِ گل سے تو اڑ چکی شبنم
شعلہ میں آفتاب کا جھیلوں

درد جھیلوں میں آگہی کا مگر
زہر اپنے ہی خواب کا جھیلوں

خواب سے آنکھ جل گئی منظرؔ
زخم تعبیر خواب کا جھیلوں

H.O.D. of Urdu, A.N. College,
Patna-13

ڈاکٹر عبید الرحمٰن

منزلیں اور بھی ہیں وہم وگماں سے آگے
ہم کو آنا ہے سفر قید مکاں سے آگے

پیکرِ شعر کو ملبوس عطا کیا کیجے
جب تخیل کی ہو پرواز بیاں سے آگے

آب اور خاک کی یہ بزم ہمیں کیا راس آتی
ہم کو جانا تھا ستاروں کے جہاں سے آگے

کب تلک دَیر وحرم کی یہ حدیثِ بے سود
مسئلے اور ہیں ناقوس و اذاں سے آگے

جستجو اور ہے کچھ اہل جنوں کی ورنہ
کون کرتا ہے سفر جائے اماں سے آگے

کرب کو اپنے تماشا نہ بنایا جائے
ہے ادب گاہِ وفا آہ و فغاں سے آگے

نذرِ اندیشہ نہ ہو جائے کہیں زیست عبیدؔ
بات کچھ اور کریں سود وزیاں سے آگے

Gali-35, Zakir Nagar,
New Delhi-110025

غزلیں

قیصر سمستی پوری

طلسم جذبۂ عہدِ شباب ٹوٹ گیا
جگایا وقت نے ایسا کہ خواب ٹوٹ گیا

جو راس آ نہ سکی خار کی نگہبانی
تو اپنی شاخ سے خود گلاب ٹوٹ گیا

سہارا موجوں کا پاکر اٹھا تو تھا لیکن
ہوا لگی تو غرورِ حباب ٹوٹ گیا

لبوں کے ملتے ہی میخانہ کانپ کانپ اٹھا
نظر کے اٹھتے ہی جام شراب ٹوٹ گیا

نہ جانے کون سا پتھر تھا تیری آنکھوں میں
نہ جانے کیوں دلِ خانہ خراب ٹوٹ گیا

جہاں سے ہوش نگاہوں کو آگیا قیصرؔ
وہیں سے رشتۂ عالی جناب ٹوٹ گیا

Qaisara bad, Nawada, Samastipur

ظفر عدیم

دیوانگی کی تجھ کو بھی اے کاش خُو ملے
میں چار سُو، دکھائی دوں، تو چار سُو ملے

یہ انتہائے عشق ہے، یا ارتقائے حُسن
ہر شئے میں میرا رنگ ملے، تیری بُو ملے

جوشِ حیا سے پاک ہوئی آرزوئے دل
خلوت میں دو جوان بدن با وضو ملے

دو چار باتیں اور مکمل خموشیاں
ہم دونوں یوں تو دیر تلک رو برو ملے

واللہ تُو تو پھول ہے پہلی بہار کا
وہ کتنا خوش نصیب ہے جس کو کہ تُو ملے

یوں تو ترے خود اپنے ہی ارمان کم نہیں
اے کاش تیرے دل کو، مری آرزو ملے

○

شکیب ایاز

غزل

(در زمین شاد عظیم آبادی)

ہم رشتہ رہے ہیں مدت تک تہذیب کے رنگیں جام سے ہم
گھبرائیں گے کیا، کھیلے ہیں بہت اس گردشِ صبح و شام سے ہم

وہ رات جو آنے والی ہے وہ رات بہت ہی کالی ہے
لو دھیرے دھیرے تیز کرو، ڈرتے ہیں چراغِ شام سے ہم

ویران حویلی روتی ہے، دروازے ماتم کرتے ہیں
اس شہر کے ملبے کہتے ہیں، واقف ہی نہ تھے انجام سے ہم

صدیوں کے امانت دار ہیں ہم اب ایسے ہی ہجرت کیا کرتے
در اصل پریشاں خاطر تھے اسلاف کے اس نیلام سے ہم

پھر وقت ہمیں پہچانے گا، تاریخ ہمیں دہرائے گی
بوسیدہ کتابوں میں ہوں گے کچھ چہرے لیے بے نام سے ہم

بازارِ قیادت میں گم تھے ناکام تماشا بن بیٹھے
عجلت میں رہے، سوچا ہی نہیں آئے تھے یہاں کس کام سے ہم

○

رؤف خیر

غزلیں

ادراک۳ (سیوان۔ بہار) میں شایع شدہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی فارسی غزلوں کا منظوم اردو ترجمہ

آپ اپنے سے گزر جائے تو دیدار آپ کا
پہلے خود کو بیچ دیتا ہے خریدار آپ کا

دے نسیمِ ناتواں کو راہ گلزار آپ کا
ایک مدت سے تو میں خود بھی بیمار آپ کا

آپ کی بزمِ عُلا میں باریابی کے لیے
میرا ماتھا ہے فدائے پائے دیوار آپ کا

پی گئے ہم رات کیا کیا، صبح تھا ارشاد کیا
سب سمجھتے ہیں یہ مخلص، صدقِ گفتار آپ کا

ہے قصاص اپنے غلاموں کا تو مالک پر معاف
کس لیے ہے قتل پر میرے پھر انکار آپ کا

لازمی ہے کچھ نہ کچھ خوف الٰہی چاہیے
ایک عالم ہے شکارِ ظلم، سرکار آپ کا

جانِ من آزاد تو ہے آپ کا مارا ہوا
یہ تو دیوانہ ہے از خود نو گرفتار آپ کا

میں کہ ہوں امیدوارِ رحمت عام آپ کا
میں نے قبلہ، دور سے باندھا ہے احرام آپ کا

یہ سنا ہے سالکوں سے، ہے بڑا نام آپ کا
میں بھی حاضر ہوں کہ پاؤں کچھ تو انعام آپ کا

کر لیا اب ہند کو سیّاح نے جائے قرار
دل کا مسکن ہو گیا گیسو سیہ فام آپ کا

ہم برائی آپ کی لوگوں سے سن سکتے نہیں
ورنہ اپنے حق میں ہے اکرام - دشنام آپ کا

گفتگو سن کر صبا کی ہوش میرے اُڑ گئے
خون میں ڈوبا ہوا ہے طرزِ پیغام آپ کا

نقدِ دل رکھ لوں نہ سر ہی دوں، کوئی نادان ہوں!
عاشقِ جاں باز ہوں میں طالبِ بام آپ کا

دوستوں کی یاد ہی تو ہے مرا زادِ سفر
میں جہاں جاتا ہوں لے جاتا ہوں بس نام آپ کا

جام یہ پی لوں تو پھر ہر بزم گرماتا ہوں میں
مہرِ تاباں ہو گیا حلقوم میں جام آپ کا

حق عاشق کے ہے جنت سے سوا قید بُتاں
بلگرامی طالبِ سیرِ گل اندام آپ کا

Raoof Khair M.A., H.No. 9-10-202/19, Risala Bazar, Golconda Fort, Hyderabad-8

علیم صبا نویدی

غزلیں

لا مکانی کے اندھیروں میں مکاں جاگے گا
میری چپ میں کوئی اندازِ بیاں جاگے گا

ہر طرف بول اٹھیں گے کئی خاموش کنول
سوکھے تالاب میں جب آبِ رواں جاگے گا

وہ تبسم میں اٹھا لاوں گا گردوں کی طرف
جس تبسم سے دلِ کابکشاں جاگے گا

میرے اندر کی ابھی آگ ہے مدھم مدھم
گھر جلے گا تو ہر اک چھت پہ دھواں جاگے گا

کچے زخموں پہ نہ رکھ انگلیاں نفرت کی صبا
تیرے دل کا تو کبھی دردِ نہاں جاگے گا

○

میرے گھر کے آنگن کے پیڑ سب ہرے نکلے
پھول خوشنما نکلے، پھل بھی اَن ملے نکلے

میرا ''میں'' ہی صدیوں سے جسم میں مقیّد تھا
میرے بھاگ کے لشکر حد سے بھی پَرے نکلے

آسماں بتائے گا آسماں سے پوچھو تم
چھوڑ کر یہ بختی کتنے حوصلے نکلے

جس نگار خانے کا نام تھا زمانے میں
اُس نگار خانے کے لوگ دل جلے نکلے

یہ بھی عہدِ روشن کا ایک معجزہ کہیے
دیرینہ خیالوں کے نقشِ پا نئے نکلے

○

26, Ameerunnisa Begum Street, Chennai - 600002

فاروق سیوانی

غزل

اُس کا وجود باعث امن و امان ہے
بوڑھا درخت گاؤں کا کتنا مہان ہے

اُس کے پروں کی حد میں ہے یہ ساری کائنات
کیا پوچھتے ہو تم کہ کہاں تک اُڑان* ہے

صدیاں ہوئیں کہ کوئی ہوا تھا یہاں شہید
اس ریت پر لہو کا ابھی تک نشان ہے

میں بولتا تھا اس لئے میری زباں کٹی
اُس کو سزا ملی ہے کہ وہ بے زبان ہے

وہ شخص ٹوٹ کر بھی کبھی ٹوٹتا نہیں
اس کی اَنا میں اب بھی وہی آن بان ہے

جو دوسرے کے درد کو اپنا بنا سکے
کیا اس زمیں پہ ایسا کوئی مہربان ہے

کتنی قبولِ عام ہے کتنی ہے معتبر
فاروق ہر زبان پہ اُردو زبان ہے

○

فاروق سیوانی

غزل

زہر والے بھی لپٹ جاتے ہیں ناگن کی طرح
میری تہذیب کا ہر پیڑ ہے چندن کی طرح

اپنا ہر عیب و ہنر دیکھ لیا کرتا ہوں
تیرا چہرہ ہے مرے سامنے درپن کی طرح

وقت بھٹی ہے تو بھٹی میں بتاؤں خود کو
ایک دن تم بھی نکھر جاؤگے کندن کی طرح

تم جب آتے ہو تصور کے حسیں عالم میں
میری تنہائی مہک اٹھتی ہے چندن کی طرح

رہبرِ فن تو اُسے مل نہ سکا صدیوں تک
روحِ فنکار بھٹکتی رہی جوگن کی طرح

سنگِ حالات سے ٹکرا کے فریبی کا فریب
ٹوٹ جاتا ہے کسی کانچ کے برتن کی طرح

میری خوددار طبیعت کو نہ چھیڑو فاروقؔ
ہوگی مجروح تو ڈس لے گی یہ ناگن کی طرح

○

شاہد ماہلی

غزل

کوئی صدا، کوئی سایہ، نہ سلسلہ کوئی
تمام راہ دھندلکوں میں ڈوب گئی۔

بہت قریب سے دیکھا تو میرا سایہ تھا
جسے گلے سے لگائے ہوئے تھی تنہائی

عجب صدا تھی کہ دیکھی گئی نگاہوں سے
عجیب برق تھی کانوں سے آکے ٹکرائی

رگوں میں پھیل گیا زہر خود پسندی کا
نمو کی دھوپ سے دیوارِ جسم ٹوٹ گئی

خیال ریت کا صحرا، اُمید راکھ ہی راکھ
کوئی شرر بھی نہیں دل کی آگ ایسی بجھی

○

Director, Ghalib Institute
Aiwan-e-Ghalib Marg, New Delhi

ارمان نجمی

غزل

کب اپنے دل میں چھپا کر غبار رکھتے ہیں
ہم اپنے زخموں کو آئینہ دار رکھتے ہیں

گذرتے جھونکے پہ بھی اعتبار رکھتے ہیں
جلا کے شمع سر رہگزر رکھتے ہیں

کسی طرح بھی سکوں آشنا نہیں ہوتے
ہم اپنی خو میں عجب انتشار رکھتے ہیں

کہیں ملی نہ گھنی چھاؤں گر چہ سنتے تھے
کہ راستے شجر سایہ دار رکھتے ہیں

بھلا دیں کر کے وہ احساں تو ہے کرم اُن کا
ہم ایک ایک کا کر کے شمار رکھتے ہیں

جو لوگ کھل کے بغل گیر ہوں ڈروان سے
وہ اپنے پہلو میں پوشیدہ خار رکھتے ہیں

کبھی تو صورت تعبیر سامنے ہوگی
سجا کے خواب کے نقش و نگار رکھتے ہیں

وہ چاہتے ہیں کہ ہم سر بلند ہو نہ سکیں
کسی بہانے تمہیں شرمسار رکھتے ہیں

جو نا شناس ہیں کیوں اُن سے مل کے رسوا ہوں
ہم اپنے گرد انا کا حصار رکھتے ہیں

○

Pili Kothi, Moh, Baqarganj, Patna - 800004

پیمانے

(تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ھے)

نام کتاب : دکنی لغت وتذکرۂ دکنی مخطوطات

تالیف : پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا مرتب : پروفیسر مغنی تبسم

ناشر : آغا حیدر حسن مرزا ریسرچ سنٹر، حیدر منزل، روڈ نمبر ۵، بنجارا ہل۔ حیدر آباد-۳۴

صفحات : ۴۶۳ قیمت : تین سو روپے (مجلد)

''دکنی لغت وتذکرۂ دکنی مخطوطات'' کے مولف پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا دہلی کے ایک ذی مرتبہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے ایک عرصہ تک حیدر آباد کے نظام کالج میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ وہ نہ صرف اپنے طلبہ میں ہر دل عزیز تھے بلکہ ان سے ملاقات کرنے والا کوئی بھی شخص، ان کی پُرکشش شخصیت اور اُن کی گل افشانئ گفتار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ بات سے بات پیدا کرنا اور بات کی تہہ تک پہنچ جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہ قول پروفیسر جعفر نظام ''اُن کی زبان لال قلعہ کی ٹکسالی زبان تھی اور انھیں بیگماتی زبان پر نہ صرف عبور تھا بلکہ اس میں تنوع پیدا کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ یہ ایک باکمال ریختی نویس بھی تھے جس کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوسکا''۔ (پیش لفظ، ص ۱۱)

پروفیسر آغا حیدر حسن کو حیدر آباد کی تہذیب وثقافت کے علاوہ دکنی زبان اور خصوصاً بول چال کی دکنی اردو سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ جس کا اندازہ پیش نظر کتاب کے علاوہ ان کی دیگر مطبوعات ''پس پردہ''، ''ندرت زبان'' اور ''حیدر آباد کی سیر'' سے ہوسکتا ہے۔ آغا صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کے کتب خانے میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے علاوہ اردو اور خصوصاً دکنی زبان وادب سے متعلق نادر و نایاب مطبوعات اور مخطوطات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر زورؔ اور مولوی نصیر الدین ہاشمی کے علاوہ دکنی ادب کے دیگر محققین نے اپنی کتابوں میں آغا حیدر حسن مرزا کے ذخیرۂ مخطوطات کے جگہ جگہ حوالے دیے ہیں۔ آغا صاحب کے اس ذخیرۂ نوادرات کو، جس میں نادر و نایاب تصاویر، خطوط مشاہیر اور قلمی بیاضیں بھی شامل ہیں۔ ان کے داماد میر معظم حسین اور بیگم معظم حسین نے نہ صرف بڑے سلیقے سے آراستہ کیا ہے بلکہ آغا صاحب کی نادر علمی وادبی تحریروں کو مرتب کر کے منظر عام پر لانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ''دکنی لغت وتذکرہ دکنی مخطوطات'' پروفیسر آغا حیدر حسن کی سب سے اہم تالیف ہے اس کے مطالعہ سے ان کی علمی وادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پیش نظر کتاب کو اردو کے نامور نقاد، محقق اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم نے بڑی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے

مرتب کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین کی ذمے داری قبول کر کے اردو کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ مغنی تبسم صاحب نے آغا صاحب کی دکنی لغت کا ''دکنی اردو کی لغت، دکنی لغت، قدیم اردو کی لغت اور فیروز اللغات'' سے تقابل کر کے دیگر لغات میں دیے گئے ہر لفظ کے معنی و مفہوم کا قوسین میں اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس لغت کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا کی اس لغت کو اگرچہ ایک جامع لغت نہیں کہا جا سکتا تاہم اس قبیل کی دیگر لغات سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ آغا صاحب نے جس نہج پر اس کی تالیف کی ہے اور اپنی عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ بقول پروفیسر مغنی تبسم 'اس میں ایک تہائی سے زیادہ الفاظ ایسے شامل ہیں جو کسی اور دکنی لغت میں نہیں ملتے۔ ان میں ۷۵ فیصد الفاظ دکنی مخطوطات سے لئے گئے ہیں اور ۲۵ فیصد وہ الفاظ ہیں جو اس وقت حیدرآباد میں رائج تھے۔ اس جائزے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تا حال جو دکنی لغات مدوّن کئے گئے وہ نا مکمل ہیں'۔ (ص ۱۴)

جہاں تک ''تذکرۂ دکنی مخطوطات'' کا تعلق ہے آغا حیدر حسن مرزا نے اپنے کتب خانے میں محفوظ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی تیاری کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔ دکنی لغت کی طرح آغا صاحب کا یہ کام بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ انھوں نے اپنے تذکرۂ مخطوطات میں جملہ ۳۸ قلمی کتابوں کی توضیحات درج کی ہیں جن میں سے بعض نسخے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے ''تذکرۂ دکنی مخطوطات'' کو بھی بڑی محنت اور جاں فشانی سے مرتب کیا ہے اور جدید تحقیق کی روشنی میں ان مخطوطات کے بارے میں تا حال جو بھی نئی معلومات سامنے آئی ہیں انھیں ہر مخطوطے کے آخر میں قوسین میں درج کیا ہے۔

یہاں چند مخطوطات کے تعلق سے بعض اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس تذکرہ میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں، تاکہ دوسری اشاعت میں انھیں شامل کتاب کیا جا سکے۔

۱۔ ابلیس نامہ (علاول) : اس مثنوی کو ڈاکٹر مبارز الدین رفعت اور اکبر الدین صدیقی نے مرتب کر کے ''قدیم اردو'' (جلد دوم) ۱۹۶۷ء میں شایع کر دیا ہے۔

۲۔ اضراب سلطانی (عزت) : یہ مثنوی دو بار شایع ہو چکی ہے۔ پہلی بار اسے ڈاکٹر صبغت اللہ نے کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے کی مدد سے ۱۹۹۰ء میں بنگلور سے شایع کیا تھا اور دوسری بار ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ۵ نسخوں کی مدد سے ۱۹۹۹ء میں اسے لاہور سے شایع کیا۔

۱۵۔ عشق نامہ (عبد المومن) : اس مثنوی کا دوسرا نام ''اسرار عشق'' بھی ہے اور اس کا ایک نسخہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری میں ہے (فہرست مخطوطات جلد اول، ص ۲۰۵)۔

۲۷۔ **قصہ ملّا (شاہ تراب)**: اس مثنوی کا دوسرا نام "مہہ جبین وملّا" ہے اور اس کا ایک نسخہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری میں محفوظ ہے (فہرست مخطوطات جلد اول، ص ۱۳۸)۔

۳۰۔ **محی الدین نامہ (عبد الملک)**: اس مثنوی کے دوسرے نام "نامۂ سلطان" اور "وصیت نامہ حضرت سلطان محی الدین" بھی ہیں۔ اور ان کا ایک ایک نسخہ ادارے میں محفوظ ہے (دیکھئے مخطوطہ نمبر ۱۰۸ اور ۲۷۸)۔ جیسا کہ آغا صاحب نے لکھا ہے "اور لوگوں نے بھی محی الدین نامے لکھے ہیں۔ شبہ ہوتا ہے کہ کاتبوں نے اکثر اِدھر کے اشعار اُدھر اور اُدھر کے اِدھر کردیے ہوں"۔ اس مخطوطے کے ابتدائی اشعار افضل کی مثنوی محی الدین نامہ کے ہیں اور اختتامی اشعار عبدالملک بھروچی (گجراتی) کی مثنوی کے ہیں۔

محمد علی اثرؔ

نام کتاب : سخنِ معتبر (انتخابِ غزلیاتِ فارسی)

شاعر : علامہ سید غلام رسول قوسؔ حمزہ پوری مرتب : ناوک حمزہ پوری
ناشر : دارالادب حمزہ پور، شیرگھاٹی۔ گیا (بہار) اشاعت : نومبر ۲۰۰۱ء
صفحات : ۷۲ قیمت : ۲۵ روپے

حضرت غلام رسول قوسؔ صاحب بہار کی مردم خیز دھرتی کے ایک بیش بہا لال تھے۔ اُن کے رشحاتِ قلم سے اردو ہی نہیں فارسی شعر و ادب کی بھی بھرپور آبیاری ہوئی ہے۔ جلوہ گاہِ پیغمبر، سخن معتبر اور قوسِ قزح (رباعیات) ان کی مطبوعہ فارسی کتب ہیں۔ اردو میں بھی ان کا مجموعۂ غزلیات اور مجموعۂ رباعیات دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آدھی درجن کے قریب مسودات زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والے ہیں۔ حضرت قوسؔ کو مولانا نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، مولانا حالیؔ اور ڈاکٹر اقبال کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے چلائی گئی سر سید احمد کی علی گڑھ تحریک کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلام میں ثابت قدم رہ کر اپنی حیات کو نئے قالب میں ڈھالنے کی بات بھی کہتے ہیں۔ انھوں نے تقسیمِ ملک اور فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت کے ایسے خونریز سانحات بھی دیکھے ہیں جن کے بارے میں ان کے مذکورہ بالا ہم عصر حضرات سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ شاعر قوم کی شیرازہ بندی کے لئے سرسید جیسے کسی قافلہ سالار کا خواہاں ہے ؎

قوسؔ شیرازۂ قومی ست گسستہ بی او آہ سرسیدِ ما قافلہ سالار کجاست

انسانی محبت اور اُخوت کا قائل شاعر کفر و ایمان کی حد بندیاں نہیں جانتا ؎

نمی داند محبت اختلافِ کفر و ایماں را بیک آغوش سازد پرورش گبر و مسلماں را

اس کی وطن پرستی اس شعر سے عیاں ہے ؎

شکلِ برادرانِ خود خدمتِ ملک وقوم کن غنچۂ باغ ہند باش داغ دلِ وطن مشو

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات پر کہے گئے اُس کے دل سوز اشعار زمانہ حال کے المیۂ گجرات پر بھی صادق آرہے ہیں۔

این چہ آشوبِ قیامت ز نظر می بینم — آدمی را زدّد و دام بتر می بینم
سوی آغشتہ بخوں و ببرش زن مجروح — دُخت عصمت زدہ مقتول پسر می بینم
کشتۂ بی کفن و بی لحد و بی تابوت — لاشۂ بے تن و بیگانۂ سَر می بینم
خانہ جنگی و برادر کُشی و خوں ریزی — خوئ درندگی نوعِ بشر می بینم
دُخترِ زخم رسیدہ بہ کنارِ مادر — پسر کشتہ بہ آغوشِ پدر می بینم
مادرِ مردہ تپاں دُخترِ کشتہ بسمل — صفِ گرگاں بہ سرِ راہ گذر می بینم

ایسے جان لیوا حالات میں جگر مرادآبادی چلا اُٹھے تھے۔

شاعر نہیں ہے جو کہ غزل خواں ہے آج بھی

ویسے ہی قوسؔ فرماتے ہیں۔

دریں زمانہ ہر آنکس کہ شاغلِ غزل است — یقیں شناس کہ اندر دماغ او خلل است

شاعر 'پدرم سلطان بود' کی رٹ لگانے والے لوگوں کو انفرادی استعداد یا جوہرِ ذاتی کے بل بوتے پر اپنی زندگی سنوارنے کی تلقین کرتا ہے۔

ہر کہ از بارگہِ علم و ہنر مردود است — فخر بر جدِّ خود و نازِ پدر بی سود است

قوسؔ حضرت اقبال کی طرح شمشیر وسناں اول طاوس و رباب آخر کے قائل ہیں۔

کن ترک عشق بازی و بگذار نالہ را — بشکن بزورِ تیشہ ہمتِ ہمالہ را
در کارگاہِ زیست سراپا عمل بشو — بفکن صراحیِ مَہ و بشکن پیالہ را

جہاں اقبال شریعت کے پابند شاعر ہیں وہاں قوسؔ نے صوفیانہ مسلک اختیار کیا ہے۔

سبحہ را بگسل و زُنّار کشیدن آموز — سوی بیت الصنم از کعبہ رمیدن آموز

یا

بدَیر آتش زن و برباد بنما کعبہ را لیکن — حذر کن اے ستمگر از شکستِ شیشۂ دلہا

ایسے اشعار کی ان کے کلام میں فراوانی ہے۔ ہم مُشتے از خروارے پیش کر کے قوسؔ کی قادر الکلامی اور ان کی فارسی شاعری کی آج کے سائنسی عہد میں بھی پائی جانے والی افادیت کی طرف قارئین کی توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ ان کی اِن ۸۳ مطبوعہ فارسی غزلوں کا مطالعہ کر کے ہم ان کی شاعری کو نئی بوتلوں میں پرانی شراب نہیں بلکہ پرانی بوتلوں میں نئی شراب کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ علامہ اقبالؔ اور آزادؔ بلگرامی کے بعد فارسی شعر گوئی کی طرف کوئی کہنہ مشق شاعر بھی متوجہ نہ ہوگا۔ لیکن قوسؔ

کے کلام کے مطالعہ نے ہماری غلط فہمی کو دور کر دیا ہے اور فیضؔ کے اس شعر کو جھٹلا دیا ہے کہ: ''اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا''۔ اب تو اقبالؔ کا یہ شعر بیساختہ طور پر ہماری زبان پر آ گیا ہے ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی ؟

بندہ فارسی داں حضرات سے یہ سفارش کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اس کتاب کو خرید کر یا کہیں سے دستیاب کر کے ضرور پڑھیں۔ اس کا مطالعہ انھیں محظوظ کرے گا نہ کہ مایوس۔

ڈاکٹر پریتم سینی

نام کتاب : عزازیل (ناول)

مصنف	: یعقوب یاور	ناشر	: مصنف	سال اشاعت	: ۲۰۰۱ء
صفحات	: ۱۶۸	قیمت	: ۱۵۰ روپے	طباعت	: بھارت آفسیٹ، دہلی

زیر نظر ناول ''عزازیل''، ''دل من'' کے بعد یعقوب یاور کا تخلیقی میدان میں دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ جیسا کہ اہل نظر جانتے ہیں کہ یعقوب یاور نے ''دل من'' جیسے تاریخی ناول کی تخلیق سے لوگوں کو نہ صرف حیرت میں ڈال دیا بلکہ انھیں اپنی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرنے پر مجبور بھی کر دیا۔ ناول کی دنیا میں ''دل من'' پر بحث ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ مصنف نے فکری اعتبار سے ایک نہایت دلچسپ اور انوکھا ناول پیش کر کے لوگوں کو اپنی طرف مکرر متوجہ کر لیا ہے۔

''عزازیل'' کی کہانی تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''قیامت''، دوسرا ''پیش ازیں''، اور تیسرا باب ''بعدِ اذاں'' کے نام سے موسوم ہے۔ ''عزازیل'' کا فکری مرکز علامہ اقبال کی معرکۃ الآرا نظم ''جبریل اور ابلیس'' سے ماخوذ ہے۔ جہاں پہلے باب قیامت میں آسمان، زمین اور آدم کے علاوہ دیگر مخلوقات کا تذکرہ ہے وہیں دوسرا باب پیش ازیں طارہ نوث، اہرمن، جبریل جیسے کرداروں پر مشتمل ہے۔ ان تمام کرداروں کی حقیقت و ماہیت سمجھنے اور جاننے کے لئے عزازیل کا مطالعہ قارئین کے لئے از حد ضروری ہے۔ تیسرا باب بعدِ اذاں آدم کی تخلیق اور عزازیل کے ذریعہ حکم خداوندی کی تردید کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور یہی باب ناول کا وہ حصہ ہے جس نے مصنف میں ناول لکھنے کی تحریک پیدا کی ہوگی۔ یعقوب یاور نے جس دلچسپ انداز میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اس ناول کے پراسرار کردار، منظر نامہ اور صورت حال قارئین کو ایک ایسی دنیا کی سیر کراتے ہیں جس کا دھندلا سا عکس اس کے ذہن میں زمانۂ طفلی سے ہی رچا بسا ہوتا ہے۔ یعقوب یاور نے اس ناول میں صرف کسی ماہر فن کی طرح اس عکس کو صاف ستھرے کینوس پر پھیلا کر نمایاں شکل عطا کر دی ہے یہی اس ناول کی سب سے بڑی کامیابی بھی ہے۔

''عزازیل'' اس لئے بھی انوکھا ناول ہے کہ اس میں جس دنیا کی بات کی گئی ہے وہ آج کی اس ترقی یافتہ دنیا

سے بھی کہیں زیادہ ترقیاتی نظام پر قائم تھی مگر اس کے باشندوں کی اپنی بے راہ روی کے سبب خدا نے ان کے نظام حیات کو درہم برہم کردیا ہے۔ یعقوب یاور نے آج کی ہماری ترقی اور بے راہ روی کو زیر نظر رکھ کر ہم سب کو یہ بات ذہن نشیں کرائی ہے کہ شاید قدرت کے خلاف ہماری ترقی اور بے راہ روی بھی اس جہان کہن کی طرح ہماری اپنی کائنات کو درہم برہم کرا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بیان کردہ یہ سارے مسائل سنجیدہ ہیں۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو ادب کے صاحب نظر حضرات یعقوب یاور کی لسانی خوبیوں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ یعقوب یاور نے لسانی اعتبار سے ان تمام ترلوازمات کا خیال رکھا ہے جو ان کے سابقہ تاریخی ناول ''دل من'' کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

مجھے اس بات کی قوی امید ہے کہ اردو میں جو شہرت اور پذیرائی ''دل من'' کو حاصل ہوئی، انشاء اللہ وہی شہرت اور پذیرائی ''عزازیل'' کو بھی حاصل ہوگی۔

فرخ شاھدؔ

نام کتاب : نوید سحر (شعری مجموعہ)

شاعر : فہیم جوگاپوری اشاعت : نومبر ۲۰۰۱ء صفحات : ۲۱۷ قیمت : ۱۲۵ روپے

ناشر : مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، باقر گنج۔ سیوان (بہار)

'نوید سحر' فہیم جوگاپوری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو شاعر کے مستقبل کے تابناک ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ۱۰۸ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں فہیم جوگاپوری نے مختلف موضوعات کو اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ ان کے کلام پر نظر ڈالنے سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ ان میں عہد کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت کرنے اور مختلف موضوعات و مسائل کو اُجاگر کرنے کی زبردست صلاحیت پوشیدہ ہے۔ اس میں انھوں نے ایسے موضوعات کو جگہ دی ہے جن کی عہد حاضر اور مستقبل قریب کو ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فہیم صاحب کا یہ مجموعۂ کلام غیر معمولی دلکشی کا حامل ہے۔ زیر نظر کتاب کی پہلی غزل کا یہ شعر دیکھیے جس سے ان کے حوصلے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دستِ عدو میں تیغ ہے مجھ کو بھی ڈھال دے طوطاں سے میں چراغِ منور بچا سکوں

یہ بات سچ ہے کہ اچھے کلام کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اصلیت، داخلیت، ہمہ گیری اور اختصار ہو۔ فہیم کے یہاں یہ ساری باتیں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک سب سے بڑی خصوصیت جو انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ ہے مناسب اور منتخب الفاظ کا انتخاب و استعمال، مصرعوں کا باہمی ربط، روانی، بندش کی چستی، رعایت لفظی اور معنی آفرینی، جس سے کلام میں حسن پیدا ہوگیا ہے۔ شاعر کے کلام کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد قاری فکر کی گہرائی میں اترنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

زاہد کی طرح خواہش جنت نہیں کرتے — ہم لوگ عبادت میں تجارت نہیں کرتے

خود راہ بنانے کا ہنر آتا ہے جن کو — وہ لوگ زمانے کی شکایت نہیں کرتے

اس مجموعے میں ان کی ایسی بھی غزلیں ہیں جس سے ان کے ترقی پسند رجحانات کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ فہیم نے اپنی شاعری کے دامن کو نعرہ بازی جیسے اشعار سے بچائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں جوش سے کام لیا ہے تو ہوش کو بھی برقرار رکھا ہے۔

زبانیں کھینچ لو، آنکھیں نکالو، کاٹ دو بازو — مگر یہ یاد رکھنا سوچ پر پہرہ نہیں لگتا

تعلّی کا شعر ملاحظہ ہو۔

زبان میرؔ ہوں، غالبؔ کی شاعری ہوں میں — غزل کے روپ میں تصویر زندگی ہوں میں

ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری میں میرؔ کی طرح سہل و آسان الفاظ اور شیریں زبان کا استعمال ہوا ہے جس کی مدد سے ان کے ذہن و فکر کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جدید ترکیبوں اور تشبیہوں کا بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے کلام میں خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔ ان کا کلام طنز سے بھی خالی نہیں ہے۔

مفلسی فاقہ کشی ہو تو ضرورت کا ہنر — چھوٹے بچوں کو بھی چھوٹا نہیں ہونے دیتا

کیسے ہو فکر اہل سیاست کو فہیمؔ — جن کا احساس ہے مُردہ کسی پتھر کی طرح

شاعر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے غزل کی روایت کو برقرار رکھا ہے اور رجائیت سے اپنے فن کی پہچان قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ جب رکے تو زمانے کی چال بڑھ جائے — وہ جب چلے تو زمانہ رکا رکا سا لگے

اگر تمہارے ستم کی یہ ابتدا بھی نہیں — ہمارے ضبط مسلسل کی انتہا بھی نہیں

ہمارا جذبۂ سجدہ سلامت — جہاں میں اور بُت خانے بہت ہیں

دورِ حاضر میں وہ انسان جو ہنستا ہوگا — سوچیے کتنا بڑا اس کا کلیجا ہوگا

فہیمؔ دل کے جلانے کا وقت آپہنچا — چراغِ شام تو بجھتا دکھائی دیتا ہے

فہیمؔ جوگاپوری کا پہلا شعری مجموعہ ہر اعتبار سے خوب ہے۔ البتہ ان کی مشق سخن جاری رہی (اور انشا اللہ جاری رہے گی) تو اُردو کے شعری ادب میں وہ ضرور اضافہ کریں گے۔

سید الفت حسین

نام کتاب : **احوال و مقامات نوشہ گنج بخش**

مصنف : میرزا احمد بیگ لاہوری بکوشش : عارف نوشاہی

ناشر : مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد

سال اشاعت: ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء صفحات : ۴۰+۱۶۴ قیمت : تین سو روپے

برصغیر پاکستان و ہند میں سلسلۂ قادریہ کی شاخ نوشاہیہ کے بانی حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش (۹۵۹-۱۰۶۴ھ) کے حالات و کرامات پر ۳۶ فصلوں پر مشتمل یہ فارسی کتاب 'احوال و مقامات نوشہ گنج بخش' میرزا احمد بیگ لاہوری کی تصنیف ہے جسے مصنف نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ) میں ۱۱۰۷ھ میں تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے کتابخانۂ نوشاہیہ کے دو قلمی نسخوں کی مدد سے تصحیح و مقابلہ کر کے اس کا متن تیار کیا اور مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد نے شایع کیا ہے۔ عارف نوشاہی نے اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں بھرپور مقدمہ بھی لکھا ہے جو اردو زبان میں ہے۔ اس تذکرے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصحح نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے :

> ''اس تذکرے کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت نوشہ گنج بخش اور ان کے براہ راست مشائخ طریقت، اصحاب اور اولاد کا اولین تذکرہ ہے۔ یہ اُس وقت (۱۱۰۷ھ) حیطۂ تحریر میں لایا گیا جب حضرت نوشہ گنج بخش کی وفات (۱۰۶۴ھ) کو ۴۳ سال گذر چکے تھے لیکن ان کے بیٹے، پوتے اور اصحاب میں سے کئی افراد ابھی بقید حیات تھے جن میں سے بعض لوگوں سے مصنف ملا ہے''۔ (ص ۱۳-۱۴)

مصحح نے بہت محنت سے متن کی تصحیح کی ہے۔ اختلاف نسخ کتاب کے آخر میں فصل وار درج کیے ہیں اور اماکن، اقوام و اہل پیشہ اور رجال کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی کی مطبوعات کے معیار اشاعت کے مطابق صاف ستھری شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے حضرت نوشہ گنج بخش کے احوال سے متعلق ایک قدیم ماخذ ہماری دسترس میں آ گیا ہے اس کے لئے مصحح اور مدیر مرکز دونوں ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

سید حسن عباس

نام کتاب : **امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات**

مصنف : ڈاکٹر محمد ذاکر حسین سال اشاعت : ۲۰۰۲ء

صفحات : ۲۳۲ قیمت : ۱۵۰ روپے

تقسیم کار : کتابستان چندوارہ، مظفر پور (بہار)

مذکورہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کا شمار ہماری نسل کے جواں سال قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ اس

کتاب سے قبل ان کی کوششوں کا ثمر یہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تلمیحات و اشارات حافظ، خلاصہ انیس الطالبین، اختیار الرفیق لطلاب الطریق، مخزن فوائد، ملیشیا میں محفوظ اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی دستی فہرست، ہمدرد میں محفوظ اردو رسائل و اخبارات، خدا بخش کے نادر عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست (۳ جلدیں) دیوان اظہر علی کا کوروی اور نذر خدا بخش (مقالات کا مجموعہ)۔ ان کے علاوہ ابھی چند اور کتابیں منظر عام پر آنے کو ہیں جن میں محاورات نکہت، افکار ذاکر (مکاتیب کی روشنی میں) اور نکہت دہلوی حیات و خدمات۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعدد علمی و تحقیقی مقالے بھی ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔

زیر نظر کتاب، ان کی تازہ تصنیف ہے جس کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے :

عہد صہبائی۔ حیات صہبائی۔ صہبائی کی تصنیفات۔ اردو تخلیقات۔ فارسی نگارشات۔ صہبائی بہ حیثیت عروض داں/ترجمہ نگار۔ بہ حیثیت تذکرہ نگار۔ بہ حیثیت قواعد نگار/لغت نویس۔ بہ حیثیت اردو شاعر۔ اس کے بعد 'مراجع و مصادر' کے عنوان سے جن کتابوں/رسالوں سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے، ان کی فہرست درج کی گئی ہے۔

مصنف نے مذکورہ بالا ہر باب میں نہایت تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے اور جہاں جہاں الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں وہاں بحث چھیڑ کر تشنگی دور کرنے کی سعی کی ہے۔ مثال کے طور پر صہبائی کے سال ولادت کا مسئلہ۔

اس میں دو رائے نہیں کہ امام بخش صہبائی اپنے زمانے کے نابغہ تھے اور اپنے معاصرین میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے نیز تذکرہ نویسوں نے ان کے علم و فضل کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، ان کے باوجود انھیں وہ مقام و مرتبہ اور شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کی یہ کتاب اردو داں حلقے میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں صہبائی کی ادبی کاوشوں پر صاف و سادہ اور آسان زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر اعتبار سے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ البتہ اس کے آخر میں صہبائی کے کلام کا ایک انتخاب بھی ہوتا تو بہتر تھا۔

ایک خاص بات جس کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ صہبائی کی فارسی تصنیفات میں 'قول فیصل' اور 'رسالہ اعلاء الحق' بھی شامل ہیں۔ اول الذکر میں صہبائی نے شیخ علی حزیں کے اشعار پر سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کے اعتراضات 'تنبیہ الغافلین فی الاعتراض علی اشعار الحزین' کا محاکمہ پیش کیا ہے اور غیر جانبداری سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آرزو کے اعتراضات کہاں تک حق بہ جانب ہیں۔ لیکن رسالہ 'اعلاء الحق' کے بارے میں نہ صرف اس کتاب 'امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات' (۱۳۵) میں بلکہ اس کے پہلے صہبائی پر جن حضرات نے قلم اٹھایا

ہے انھوں نے بھی یہ لکھا ہے جیسا اس کتاب میں ہے کہ ''احقاق الحق کے نام سے خان آرزو نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں شیخ حزیں کے ۱۱/ اشعار پر اعتراض کیا تھا اسی کی تردید میں صہبائی نے 'اعلاء الحق' کی تصنیف کی''۔

یہ صحیح ہے کہ 'اعلاء الحق' صہبائی کی تصنیف ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس میں حزیں کے اشعار پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن خان آرزو کی تصنیفات میں 'رسالہ احقاق الحق' ملتا ہے یا نہیں؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔ اگر ملتا ہے تو وہ واقعی آرزو کا ہی لکھا ہوا ہے یا کسی اور کا۔ چونکہ حزیں اور آرزو کا معرکہ مشہور تھا اس لئے حزیں پر جس کسی نے اعتراض کیا وہ خان آرزو کے حساب میں لکھا گیا۔ یہ تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ واقعی اس رسالے کا مصنف کون ہے اور اس کے نسخے کہاں ہیں ؟

واضح رہے کہ وارستہ سیالکوٹی نے بھی ایک رسالہ 'احقاق حق' اسی موضوع پر لکھا تھا جس میں شیخ کے اشعار پر خان آرزو کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ وارستہ نے اسی موضوع پر ایک اور رسالہ 'جواب شافی' (رجم الشیاطین) بھی لکھا تھا جس میں حکیم بیگ حاکم لاہوری کے چند اشعار پر خان آرزو کے ایرادات و اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ (وارستہ کے مذکورہ دونوں رسالوں کے لئے دیکھیے راقم کا مقالہ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۷ء)۔

سید حسن عباس

نام کتاب : **خود نوشت سوانح عمری و سفر نامہ**

مصنف : حاجی سید جلال الدین حیدر مرتب : سبط محمد نقوی

طبع ثانی : ۲۰۰۲ء ضخامت : ۳۶۰ صفحات قیمت : نوے روپے

ناشر : توحید پرکاشن کیندر، امام باڑہ جناب غفران مآب، لکھنو

ادبی سفر نامے کا ذکر آتے ہی ذہن میں پانچویں صدی ہجری کے ایرانی مصنف حکیم ناصر خسرو کے مشہور سفر نامے سے لے کر پروفیسر احتشام حسین کے امریکہ کے سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' تک کا خیال آ جاتا ہے۔

اردو میں جو چند اہم سفر نامے لکھے گئے ان میں سفر نامۂ روس (جواہر لعل نہرو)، کولمبس کے دیس میں (جگن ناتھ آزاد)، جاپان چلو جاپان چلو (مجتبیٰ حسین)، لندن یاترا (مناظر عاشق ہرگانوی)، قصہ میرے سفر کا (شکیل الرحمٰن)، خوشبو کا سفر (ڈاکٹر کیول دھر)، گلستان حجاز (بہاء الدین کلیم)، یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ (کلیم عاجز) اور سفر نامۂ حرمین شریفین (طیب عثانی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اندرون ملک کے سفر ناموں میں شاہ محمد اکبر داناپوری کا سفر نامہ (سیر دھلی) مطبوعہ ۱۸۹۳ء۔ یہ پہلی کتاب ہے جو اُردو میں دھلی کا سفر نامہ ہے۔

اس کے بعد حافظ رضوان اللہ آروی کا سفر نامہ (ختم سفر کے بعد)، مطبوعہ ۱۹۹۱ء دھلی اور اجمیر کا سفر

نامہ ہے۔ (۱)

زیر نظر کتاب ''خودنوشت سوانح عمری وسفرنامہ'' کے دو حصے ہیں۔ سوانح عمری اور سفرنامہ حجاز وعراق۔ اس سفرنامہ میں دوران ملازمت کشمیر، مشہد، بمبئی اور ڈیرہ دون کا بھی تذکرہ ہے۔

صاحب تذکرہ الحاج سید جلال الدین حیدر ۲/فروری ۱۸۷۲ء کو دیوگام (اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم عربی میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے الہ آباد گئے۔ ۱۸۹۱ء میں انٹرنس پاس کیا اس کے بعد بی-اے اور ایم-اے کیا اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ جب ملازمت کرنے کا وقت آیا تو علی گڑھ کالج میں اُستاذ مقرر ہوئے لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش رہی۔ چیفس کالج لاہور میں ملازمت کی۔ حیدر صاحب نے دوران ملازمت پیش آنے والے مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انگریز عام طور پر ہندوستانیوں سے دُور دُور رہتے تھے اور ہیچ نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ حیدر صاحب نے چیفس کالج (لاہور) کی ملازمت کو اپنے عروج کا زمانہ لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب تک جن لوگوں سے مجھے سابقہ پڑا خواہ وہ میرے افسر رہے ہوں یا ماتحت، استاد رہے ہوں یا شاگرد، یا ساتھ کام کرنے والے، ان سب میں ان کا خاص وقار تھا اور لوگ مجھے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

یہ سوانح عمری اس مردِ مجاہد کی ہے، جس کی زندگی (۱۹۴۸ء-۱۸۷۲ء) میں ہندوستان کی جنگ آزادی شباب پر تھی لیکن اس کی تحریر میں کہیں بھی سیاست کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ اپنے زمانے کا سرسید تھا جس کی علمی وخداداد صلاحیت کا زمانہ معترف تھا۔ سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں انھوں نے grass roots کا کام کیا ہے۔ ان کا اہم کارنامہ ''انجمن وظیفہ سادات'' کا قیام ہے، جس کی ابتدا آٹھ-آٹھ آنے کی قلیل رقم جمع کر کے ہزاروں کے وظائف دیئے جاتے رہے۔ ان وظائف سے قوم کے سینکڑوں افراد نے انجینئر، ڈاکٹر، وکیل، عالم، مجتہد بن کر اپنا اور اپنی قوم کا نام روشن کیا۔ یہ وظائف لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی دیئے گئے۔ اس طرح لکھنو جو شاہان اَودھ کی وراثت کا امین ہے یہاں کی خاتون خانہ کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ اس طرح حیدر صاحب نے علامہ راشد الخیری کے مشن کو آگے بڑھایا —— مبارک باد کے مستحق ہیں جناب سبط محمد نقوی صاحب جن کی مساعی جمیلہ سے حاجی حیدر صاحب کا کام آج بھی جاری ہے۔ اس مشن سے وابستہ حضرات میں لسان العلوم مولانا سید علی نقی صفی مرحوم (۱۹۵۰ء-۱۸۶۲ء)، شیخ مختار حسین جون پوری (۱۹۶۴ء-۱۸۸۱ء) اور الحاج سید مقصود حسین نقوی (-۱۸۹۸ء) شامل ہیں۔

حاجی سید جلال الدین حیدر معمر ہونے کے باوجود بڑے جواں ہمت اور جفاکش تھے۔ انھوں نے انتقال سے قبل پاکستان کے مختلف شہروں کا لمبا سفر کیا اور بیمار بھی پڑے، پھر کام میں لگ گئے۔ پاکستان سے واپسی کے بعد

۱۔ ان کے علاوہ بھی سفرنامے ملتے ہیں جن کا نام گنوانے سے مبصر نے صرف نظر کیا ہے۔ [ادراک]

آنتوں کے اترنے کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اپنے مکان محلہ متھوئی ٹولہ (لکھنو) موسومہ بہ جلال منزل انتقال فرمایا۔ ان کے وصیت نامہ کے بموجب مولانا محمد سعید صاحب نے ان کو غفران مآب کے امام باڑہ کے صحن میں دفن کر دیا۔

وہ قبر میں آہ! میری آئیں گے حیدر بیشک
اپنے مرنے کی خوشی ہے کہ زیارت ہوگی

زیرِ نظر کتاب کے دوسرے حصے ''سفر نامہ'' میں مختلف اسلامی ممالک اور ہندوستان کے بڑے شہروں اور ریاست کے سفر اور مقصد سفر کو سمیٹنے سے گیارہ بڑے سفروں کا تذکرہ ہے۔ اس میں عراق کے چار سفر، حجاز کے دو، ایران کے دو اور ہندوستان کے شہر و ریاست کے تین سفر شامل ہیں۔

اس سفر نامے کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقامات مقدسہ کا پہلا سفر ۱۸۹۴ء میں کیا گیا، اس کے بعد ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۳۶ء اور آخری سفر ۱۹۳۸ء میں تمام ہوا۔ اس طرح ۴۴ سال میں تمدن اور معاشرت میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے متعلق خاصا تاریخی مواد بھی ان سفر ناموں میں موجود ہے۔

کشمیر کا پہلا سفر ۱۹۰۵ء میں اور صوبہ بہار اور ممالک متحدہ آگرہ واَودھ کے بعض اضلاع کا دورہ جو ۱۹۲۳ء میں رفاہ عام کی غرض سے کیا گیا وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ سفر نامہ مقامات مقدسہ کا خوشنما مرقع ہے۔ مکہ، مدینہ، دمشق، فلسطین و شام کے ساتھ بے شمار نام اور مقام کا اس سفر نامے میں ذکر آتا ہے۔ ان میں حضرت مسلم اور ان کے بے گناہ پسران کی شہادت، زندانِ شام، مزار حضرت زینبؑ، حضرت عیسیٰؑ کو سولی دیئے جانے کی جگہ، حضرت سلیمانؑ کی عبادت گاہ، بنی اسرائیل کی قربان گاہ، حضرت فضہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ام کلثوم، حضرت سکینہ، حضرت سیدہ، حضرت خدیجہ وغیرہ کے مزارات کے ساتھ مولد نبیؐ، مولد فاطمہؑ، زیتون کے سات درختوں کا ذکر جن کے نیچے کبھی حضرت مسیحؑ بیٹھتے تھے۔ اس کے ساتھ مختلف مقامات کے قدرتی مناظر، قدرتی جھیل، آبشار، لبنان کی پہاڑی، تبوک کے چشمے کا تذکرہ۔ تاریخ و جغرافیا کے پُر بہار دامن کے وہ مایہ ناز گوہر ہیں جو ایک مشتاق دل اور لبریز دیدہ کے بے چین کر دینے کے لئے کافی ہیں اور گھر بیٹھے اس سفر نامے کے پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہلکے ہلکے نور کی اِدھر اُدھر بارش ہو رہی ہے۔

اس طرح اس سفر نامے میں یہ بات کہ حج کی غرض سے ایک دولت مند بزرگ جو ملازم کے ساتھ تشریف لے گئے تھے مگر پھر بھی کچھ تکلیفیں ہوئیں تو پردۂ خانہ کعبہ پکڑ کر انھوں نے یہ دعا فرمائی —— ''پروردگار اب پھر آئندہ نہ بلانا''۔ یا یہ کہ ہیضے سے جہاز پر دو آدمی مر گئے تھے۔ ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے: ''آدمی تو دو مرے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سبھی کی روح نکل گئی''۔ یہ طرز نگارش کس قدر دلچسپ اور پُر اثر ہے۔

حاجی صاحب کے مزاح کی شگفتگی ملاحظہ فرمائیں۔ مدینے کا واقعہ ہے کہ میں جن عرب صاحب کے مکان میں کرایہ پر رہتا تھا ان کے عقد میں ایک حبشن عورت بھی تھی اس کے پہلے شوہر سے ایک جوان لڑکی تھی۔ اس لڑکی کو یہ عورت ایک روز میرے پاس لائی اور خواہش کی کہ میں (حیدر صاحب) اس سے شادی کرلوں۔ مجھے جو شرارت سوجھی تو میں نے اپنی خوش دامن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میری اماں ہیں اگر یہ میرا عقد اس لڑکی سے کردینا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ خوش دامن صاحبہ کے پاس باقاعدہ درخواست کرنے گئی۔ آگے کیا ہوا بس اتنا کہ میں دور سے تماشا دیکھتا رہا۔ بعد میں حبشن کی چند صلواتیں سننے میں مجھے مزہ ہی آیا۔ (ص ۱۳۱)

اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حاجی صاحب نے کشمیر کا پہلا سفر ۱۹۰۵ء میں کیا تھا۔ تقسیم ملک سے قبل کشمیر جانے کا راستہ لاہور سے بذریعہ ریل راولپنڈی اور وہاں سے بذریعہ سڑک مری اس کے بعد دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ سڑک سری نگر تک جاتی تھی۔ (ص، ۱۶۰)۔ اب یہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ اب پٹھان کوٹ سے جموں تک ریل جاتی ہے اس کے بعد بذریعہ سڑک کشمیر کے دوسرے حصّوں میں جایا جا سکتا ہے۔ حاجی صاحب نے ہاؤس بوٹ کرایہ پر لیا اور کشمیر کے مختلف حصّوں کی سیر کی۔

''ایک روز محض اتفاق سے ایک اسکول میں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ کرنیل سنگھ صاحب کا ہائی اسکول ہے۔ کرنیل صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب دونوں سے ملا۔ دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ تقریباً چار سو طلبہ میں سے مسلمان فقط بیس تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کی آبادی شہر میں ۹۰ فیصدی ہے۔ [ص ۱۶۶]

شری نگر کی تاریخی عمارتوں میں جامع مسجد قابل دید ہے۔ شاہ ہمدان کا روضہ بھی مشہور جگہ ہے۔ حضرت بل کی درگاہ مقدس ہے۔ یہاں رسول اللہ صلعم کے چند موئے مبارک اور خلفا کی بعض یادگاریں رکھی ہوئی ہیں جن کی زیارت خاص تاریخوں میں کی جاتی ہے۔

الغرض! حاجی حیدر صاحب کی کتاب ''خودنوشت سوانح عمری اور سفر نامہ'' کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ سید شاھد اقبال

حیات مبارک عظیم آبادی بہاری

۱۹۳۸ء

مصنّف

ابوالخیر خیؔر رحمانی

ساکن موضع قاضی بھیڑہ، ضلع دربھنگہ

(مدیر "الپنچ")

پیشکش

ڈاکٹر سید حسن عباس

شعبہ فارسی ۔ بنارس ہندو یونیورسٹی

2004

بہ اہتمام

مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، باقرگنج ۔ سیوان (بہار) ۸۴۱۲۸۶

مقدمہ

ہماری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا　　نہ دیکھے آج، نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

(خیرؔ رحمانی)

عظیم آباد کے مشہور اخبار ''الپنچ'' کے اڈیٹر ابوالخیر رحمانی متخلص بہ خیرؔ بہیروی کی مختصر مگر گراں قدر تصنیف ''حیات مبارک عظیم آبادی'' پیش کی جارہی ہے۔ حضرت مبارک، داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس کا مخطوطہ پروفیسر نادم بلخی سابق صدر شعبۂ اردو جی-ایل-اے کالج (رانچی یونیورسٹی) ڈالٹن گنج کی علم دوستی، ادب پروری اور ادارے کے ساتھ ان کے عملی تعاون کی علامت کے طور پر ہم تک پہنچا ہے۔ ابوالخیر رحمانی کی تصانیف میں اس رسالے کا ذکر نہیں ملتا (۱)۔ کیونکہ یہ مخطوطہ ان کے سرمایۂ ادب میں شامل ہونے کے بجائے دست بدست پھرتا رہا۔ ہمارے یہاں اس طرح کے حادثے آئے دن ہوا کرتے ہیں اور ہم آئے دن سنا کرتے ہیں کہ فلاں ادیب، شاعر، مصنف، مولف، صحافی، مترجم، محقق، ناقد وغیرہ وغیرہ کے آثار ضائع ہوگئے۔ اپنے بزرگوں کے آثار کے تحفظ کے لئے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ ادارے کے ترجمان مجلّے ادراک کے صفحات بھی اس خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

زیر نظر مخطوطہ جس کا سائز ۱۵×۲۴ سینٹی میٹر اور صفحات کی تعداد صرف بیس ہے، بخط مصنف ہے۔ پختہ نستعلیق میں لکھے اس مخطوطے میں ایک دو جگہوں پر سرخ روشنائی سے عنوانات لکھے گئے ہیں جب کہ متن کے لیے نیلی روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے۔ ہر صفحے میں سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ مخطوطے کا عنوان تاریخی ہے جس سے ۱۹۳۸ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ رسالے کے آغاز میں ایک اور عنوان ''ذکر مبارک صاحب دیوان'' بھی تاریخی عنوان ہے جس سے ۱۳۵۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ لہذا قیاس ہے کہ ابوالخیر رحمانی نے ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں اسے لکھنا شروع کیا ہوگا اور یہ رسالہ ۱۹۳۸ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا ہوگا۔ سرورق پر مصنف نے اپنا نام مع تخلص اور پورا پتا بھی درج کیا ہے۔ تیسرے صفحے سے متن شروع ہوتا ہے۔ سرورق کے بعد والا صفحہ جو صفحہ نمبر دو ہے پہلے سادہ رکھا گیا تھا لیکن صفحہ تین پر مصنف کو اضافی عبارتیں لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور جگہ نہ ہونے کی صورت میں ۱۴ سطریں صفحہ دو کے نصف حصے میں لکھی گئی ہیں۔ مخطوطے کا کاغذ عام کاغذ ہے جو امتداد زمانہ کے ساتھ بوسیدہ ہوتا چلا گیا۔ کچھ صفحات کے نیچے اور اوپر کے گوشے پھٹ گئے ہیں جن کی وجہ سے کچھ عبارتیں، الفاظ، اشعار اور مصرعے متاثر ہوئے ہیں۔ اشعار اور مصرعوں کو کلیات مبارک سے

۱۔ ملاحظہ ہو مضمون۔ اخبار الپنچ کے مدیر خیر بہیروی کا تذکرہ۔ از ابوالخدر قاضی، مطبوعہ ترجمان شمارہ ۲، ص ۱۹۱-۲۰۵، پٹنہ، نومبر ۱۹۹۹ء (مدیر پروفیسر جابر حسین)

مکمل کرلیا گیا ہے یا وہ اشعار مکمل نہیں کئے جا سکے جو کلیات میں موجود نہیں ہیں اور ایسے مقامات پر تین نقطے لگائے گئے ہیں۔ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ لیکن اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے رسالے کے آخر میں کلام مبارک سے ایک انتخاب ''انتخاب خیر'' کے عنوان سے درج کیا تھا جو شاید ضائع ہوگیا یا درج کرنا چاہا تھا اور نہ کر سکے۔

رسالے کا مطالعہ مصنف کے سلسلے میں بھی کافی مفید ہے، کیونکہ مصنف نے جا بجا اپنے بارے میں بھی بیش قیمت اطلاعات درج کردی ہیں۔ مثلاً مبارک عظیم آبادی کی تاریخ ولادت کے ذکر کے دوران مصنف نے اپنی تاریخ ولادت اور تاریخی نام بھی لکھ دیا ہے۔ اسی طرح مصنف نے اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۸ء تک الپنچ کے ایڈیٹر رہے تھے۔ (۱)

اس مختصر رسالے کو مبارک عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری پر ان کی حیات میں ان کے ایک ہم عصر ادیب کا جامع اور بھرپور تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ غالباً حضرت مبارک کی شاعری کا یہ پہلا محاکمہ ہے جو ابوالخیر رحمانی کے ذہن وقلم کا نتیجہ ہے۔ اس رسالے سے پہلی بار یہ اہم اطلاع سامنے آتی ہے کہ مبارک عظیم آبادی اردو کے ساتھ فارسی گو شاعر وادیب بھی تھے۔ فارسی شاعری کے نمونے تو اس رسالے میں آگئے ہیں لیکن ان کی فارسی نثر حوادث کا شکار ہوگئی۔ فارسی شاعری میں وہ حکیم عبدالحمید پریشاںؔ کے شاگرد تھے۔ اس رسالے میں فارسی اردو کے جو اشعار آئے ہیں اُن میں سے اکثر کلیات مبارک (مطبوعہ) میں نہیں ملتے۔ اس طرح اس رسالے کی اہمیت حضرت مبارک کے اشعار کے تحفظ کے اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔ رسالے کے آخر میں حواشی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ مصنف کی شگفتہ بیانی اور ناقدانہ بصیرت نے حضرت مبارک کی جو تصویر پیش کی ہے وہ دبستان داغ کے شعرا کی صف میں سب سے نمایاں نہیں تو دھندلی بھی نہیں کہی جا سکتی۔

واضح رہے کہ اس رسالے سے پہلا استفادہ پروفیسر نادم بلخی نے اپنے مضمون ''مبارک عظیم آبادی'' مشمولہ شعائع نقد (مطبوعہ اگست ۱۹۹۳ء) میں کیا۔ پھر یہی مضمون ''کلیات مبارک عظیم آبادی'' مطبوعہ کراچی اگست ۱۹۹۹ء میں بھی شامل ہوا۔ آج ہم ابوالخیر رحمانی کا یہ رسالہ ادبی دنیا میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے لئے راقم السطور خاص طور پر پروفیسر نادم بلخی کا بے حد ممنون ہے۔ امید ہے کہ مبارک عظیم آبادی پر تحقیق وتنقیدی نقطۂ نظر سے کام کرنے والوں کو اس رسالے سے خاطر خواہ روشنی اور مدد ملے گی۔ میں نے مبارک عظیم آبادی کا رسائل سے کچھ ایسا کلام بھی یکجا کیا ہے جو ان کے مطبوعہ کلیات میں آنے سے رہ گیا ہے۔ ارادہ تھا کہ اسے رسالے کے آخر میں ضمیمہ کردیا جائے گا لیکن صفحات کی تنگ دامانی کے سبب اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے معذور رہا۔

ڈاکٹر سید حسن عباس

۱۔ الپنچ کی ادارت سے خیر رحمانی کی سبک دوشی کی تاریخ ۱۵/ جنوری ۱۹۰۲ء بتائی جاتی ہے لیکن مصنف کی مذکورہ تحریر کے منظر عام پر آجانے سے اب خود بخود اس کی تردید ہوجاتی ہے۔ (سید حسن عباس)

ذکرِ مبارک صاحبِ دیوان

۱۳۵۵ھ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ونصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم

عظیم آباد (پٹنہ) کا اگلا عظیم الشان علمی اور ادبی دور خدا جانے کیسا ہوگا۔ کیسے کیسے باکمال ادیب اور جید علماو فضلا کی پرکیف صحبتیں ہوں گی۔ کتابوں میں کچھ ان کے تذکرے ہیں مگر سب تشنہ۔ ہاں، اُس دور میں کوئی محمد حسین آزاد ہوتا تو ان کو "آبِ حیات" پلاتا۔ آہ! آہ!

حریفان بادہ ہا خوروند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کروند و رفتند

درمیانی دور میں حضرت مولانا حکیم عبدالحمید صاحب پریشاںؔ علیہ الرحمہ، جناب شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب اثرؔ، جناب ادیب الملک نواب نصیر حسن صاحب خیالؔ، خان بہادر سید علی محمد صاحب شادؔ، حاجی مولانا حافظ سید فضل حق صاحب آزادؔ، جناب ڈاکٹر مبارک حسین صاحب مبارکؔ، جناب مولانا ظہیر احسن صاحب شوقؔ نیموی، جناب عنایت حسین صاحب امدادؔ، جناب محمد باقر صاحب باقرؔ، جناب شیخ علی باقر صاحب آبادؔ، جناب مولانا سید عبدالغفور صاحب شہبازؔ بلند پرواز، جناب مولانا حافظ سید نذر الرحمٰن صاحب حفیظؔ، جناب مولانا سید رحیم الدین صاحب مدیر الپنچ بانکی پور، جناب لاڈلے صاحب بیتابؔ، جناب ننا صاحب موجؔ کی پر لطف صحبتوں کا نقشہ آج تک آنکھوں میں پھر رہا ہے، آہ!

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

بقول حضرت مبارک :

خالی ہے آج بزمِ سخن دوستوں سے آہ
کل کی ہے بات تھے یہیں ہمدم بھرے ہوئے (۱)

ان ولولہ انگیز صحبتوں کا خیال آتا تھا کہ تصور نے بزم احباب کا مرقع نظر کے سامنے پیش کر دیا۔ نظر نے دل کو دکھایا۔ دل نے کہا :

گزشتہ صحبتوں کو پھر دلانا یاد کیا حاصل
قفس پر برگ گل رکھنے سے او صیاد کیا حاصل

اب نہ وہ صحبتیں میسر آسکتی ہیں اور نہ وہ دَور چل سکتا ہے :

ہم بزم تھے جو اپنے مبارک وہ اٹھ گئے
بزم سخن میں ہوتے ہیں اب ہم تو کم شریک (۲)

اسی بزم احباب کا ماتم حضرت مبارک کی اکثر غزلوں میں نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ جناب دیوان شاہ حامد حسین صاحب عظیم آبادی سجادہ نشین حضرت شاہ ارزاں قدس سرہٗ کے یہاں مشاعرے کی طرحی غزل میں جس کا انتخاب آگے آتا ہے، آپ نے ذیل کا قطعہ پڑھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عظیم آباد کے اکثر مشاہیر اٹھ چکے تھے۔ صحبتیں پھیکی پڑتی جارہی تھیں۔ تین بجے شب کو جب شمع آپ کے سامنے آئی تو آپ نے اپنی غزل شروع کی۔ جس وقت آپ نے قطعہ کا پہلا شعر پڑھا، جلسے کا رنگ پلٹ گیا۔ پہلے واہ، واہ ہورہی تھی۔ اب آہ، آہ ہونے لگی۔ ساری بزم متاثر تھی اور اکثر آنکھیں اشکبار۔

نہیں آساں نہالانِ چمن کا پھولنا پھلنا — بہت مشکل ہے فن باغ سخن کی باغبانی کا *
جہاں تھے لالہ وگل اب وہاں خار مغیلاں ہیں — یہ نقشہ آج ہے افسوس گلزار معانی کا
یہ کل کی بات ہے تھے کیسے کیسے اہل فن ہم میں — سخن دانی کا یہ ماہر، تو وہ تھا نکتہ دانی کا *
خموشی مہر لب ہیں آج وہ شہر خموشاں میں — کہ کل بلبل بھی دم بھرتا تھا جن کی خوش بیانی کا*
جگہ خالی نظر آتی ہے اگلے ہم صفیروں کی — غزل خوانی کی صحبت اب ہے جلسہ نوحہ خوانی کا
جو شمعیں رہ گئی ہیں بزم میں وہ جھلملاتی ہیں — کہ دَورِ آخری ہے دَور ان کی زندگانی کا *

دم رخصت مبارکؔ یوں تہِ دل سے دعا گو ہے
نوانجو! خدا حافظ گلستانِ معانی کا (۳)

اب صرف دو مشاہیر و مغتنم ہستیاں حضرت آزادؔ اور حضرت مبارکؔ اُس مبارک دَور کے یادگار باقی ہیں۔ ان کو دیکھ لو۔ ان کو سن لو۔

سن لو آزادؔ و مبارکؔ کو تم اب جی بھر کر — پھر یہ بلبل کا ترانہ نہ سنے گا کوئی

یہ صحبت بھی درہم برہم ہونے والی ہے۔ شمع مجلس جھلملا رہی ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

حضرت آزادؔ معنی ایجاد نے جب وہ اپنے مکان واقع محلہ پیر بہوڑ بانکی پور میں تھے، اپنی لائف خود لکھی تھی اور مجھے سنائی بھی تھی۔ شاید وہ اس کو کسی وقت طبع کرائیں۔ رہے ڈاکٹر مبارک (یہ 'قاضی مبارک' مشہور ہوتے تو اچھا تھا۔ آخر ان کے مورث اعلیٰ قاضی ہی تھے)۔ یہ حضرت کچھ ایسے لااُبالی ہیں کہ ان سے یہ توقع ہی نہیں ہوسکتی کہ کچھ لکھیں۔ یوں تو ہمارے ملک کے اہل کمال (ص ۳) حضرات کی یہ عام فطرت رہی ہے کہ کبھی کسی نے اپنی شہرت نہیں چاہی اور نہ ملک کو

اپنے کمال سے روشناس ہونے کا موقع دیا۔ جس نے جانا جانا۔ جس نے سنا سنا۔ ہمارے حضرت مبارک اس کلیہ سے کس طرح مستثنیٰ ہوتے۔ یہ خیال کر کے میں نے ارادہ کرلیا کہ لاؤ ان کی مختصری لائف لکھ کر ملک کو اُن سے روشناس کراوں۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ اپنے خاندانی حالات اور واقعات لکھ کر مجھے دیجیے۔ مگر مرد خدا نے اس میں بھی بخل کیا اور ہنس کر یہی کہتے رہے کہ میرے حالات کیا اور واقعات کیسے؟ آخر جب میرا اصرار حد سے بڑھا تو بادلِ ناخواستہ اور خدا جانے اپنے دل پر کتنا جبر کر کے چند سطریں لکھ بھیجیں جو اس سوانح کی بنیاد اور میری معلومات اور اپنا مشاہدہ اس کی عمارت کی تعمیر کی موید ہیں۔

نام و سنہ ولادت : مبارک حسین نام، مبارک تخلص۔ آپ ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۷ھ میں ۲۷ محرم کو جمعہ کے دن بوقت عصر ضلع دربھنگہ کے سابق سب ڈیویزن تاج پور میں، جہاں آپ کے والد ماجد مولوی فدا حسین مرحوم منصف تھے، پیدا ہوئے۔ اس وقت تک آپ دنیا کی اڑسٹھ بہاروں سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ یہ مجھ سے ایک سال چھوٹے ہیں۔ مگر غزل گوئی میں بہت بڑے ہیں۔ میں ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوا ہوں (۱)۔ میرا تاریخی نام 'مظہر عالم' ہے۔ اس حساب سے حضرت مبارک کا نام 'مظاہر عالم' ہونا چاہیے۔

حلیہ اور وضع : میانہ قد، چھریرا بدن، بیضاوی چہرہ، گندمی (2) رنگ، کشادہ پیشانی، داڑھی کے مختصر بال اور وہ بھی وبال، مونچھیں گھنی، لمبی نہیں مگر اُلجھی ہوئی۔ اپنی مونچھوں کی نسبت خود حضرت مبارک فرماتے ہیں ؎

بڑھائی تو ہیں تم نے مونچھیں مبارک
شریعت کی قینچی کی بھی کچھ خبر ہے
تراشیں گے سو تہمتیں شرع والے
یہ مقراض حجام سے تیز تر ہے (۴)

یہ خاندانی اثر ہے کہ حضرت مبارک شریعت سے خائف ہیں اور اپنے جرم کو جرم سمجھتے ہیں۔ اب بال قریب قریب سفید ہو چکے ہیں مگر طبیعت اس بڑھاپے میں بھی شباب کی اُمنگیں اور جوانی کی اٹکھیلیاں دکھا رہی ہے۔ جوانوں ہی کی صحبت میں ان کو لطف آتا ہے :

مانا کہ دن سدھارے مبارک شباب کے
رنگیں طبیعتوں سے ملاقات بھی گئی (۵)

---

۱ جناب ابوالخیر رحمانی قاضی نے سال ولادت ۱۸۶۸ء کے بجائے ۱۸۶۹ء لکھا ہے (ترجمان ۲/۱۹۱)۔ ابوالخیر رحمانی نے اپنی پیدائش کا سال خود لکھا ہے۔

۲ گندمی کو کسی نے پنسل سے دائرے میں گھیر کر اوپر 'گورا' لکھ دیا ہے۔ غالباً پروفیسر نادم بلخی نے لکھا ہوگا جنھوں نے ڈاکٹر مبارک کو دیکھا ہے۔ (عباس)

وضع کے پابند، سر پرتر کی ٹوپی، شیروانی اور کبھی نیچا کوٹ، پتلون نما پائجامہ، چال میں متانت، چلتے ہیں تو کچھ سوچتے جاتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں تو کچھ فکر ہی کرتے رہتے ہیں۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ظریف، ہنس مکھ، بذلہ سنج، ملنسار، دوستی کے پکے، بات کے دھنی اور سچے۔

۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۸ء تک میں اخبار 'الپنچ' بانکی پور کا ایڈیٹر رہا۔ یہ زمانہ عظیم آباد کے عجب ادبی ذوق کا زمانہ تھا۔ وہ مشاعروں کی دھوم دھام۔ وہ ادبی ذوق وشوق۔ کہیں کسی سے نوک جھونک۔ کہیں کسی سے چشمکیں۔ کچھ بھی ہو، تھا عجب پُر لطف سماں۔ یہی وہ مبارک زمانہ تھا جس میں مجھ سے حضرت مبارک کے ساتھ زمانہ دراز تک لطف صحبت رہا۔ اب میں خسرو پور میں ہوں اور وہ پٹنہ میں۔ گاہے ماہے ملاقات ہو جاتی ہے تو وہی لطف اٹھتا ہے۔

مذهب و ملت : حضرت مبارک اور آپ کا خاندان قدیم الایام سے حنفی المذہب اور قادری المشرب چلا آتا ہے۔ آپ کو حضرت مولانا شاہ بدرالدین قدس سرہٗ سجادہ نشین خانقاہ مجیبی سے قادریہ سلسلہ میں بیعت کا شرف حاصل ہے۔ ہمیشہ سے آپ کا طریقہ صلح کل ہے۔ کسی غیر مذہب سے نہ تعرض نہ تعصب۔ عاشقانہ مزاج ہونے کی وجہ سے 'ہمہ اوست ہمہ زاوست ہمہ دوست' آپ کا مسلک رہا۔ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام۔

بقول حضرت مبارک :

محبت کے پجاری تو کسی سے بل نہیں رکھتے

مساوی ہیں مراسم ان کے ہر شیخ و برہمن سے (ص۴)، (۶)

خاندانی حالات : آپ عظیم آباد کے ایک معروف وممتاز قدیم خاندان کے قابل فخر رکن ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب چند پشتوں کے بعد حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد مولوی فدا حسین مرحوم منصف تھے اور حضرت مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ عظیم آبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ وامقؔ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کو فن تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ ملا قاضی یار محمد مغفور ایک عالم باعمل اور فاضل اجل، صاحب دل بزرگ تھے۔ آپ کو حضرت شاہ تراب قدس سرہٗ العزیز سے خلافت کی اجازت حاصل تھی۔ ہندوستان میں اس وقت علم دوست اور علم پرور مغلیہ سلطنت کا عہد تھا۔ مراحم خسروانہ کی بارش ہو رہی تھی۔ اہل کمال مالا مال اور ذی علم نہال تھے۔ صاحب علم ڈھونڈھ کر عہدۂ جلیلہ پر ممتاز و سرفراز ہو رہے تھے۔ ہر چند ملا یار محمد قدس اللہ سرہٗ ایک عزلت نشین اور مرتاض بزرگ تھے مگر ان کا علم وفضل کب ان کو ارا کین سلطنت کی دور بین نگاہوں سے نہاں رکھتا۔ بہ عہد عالمگیری ۱۰۸۵ھ میں آپ کو عہدۂ قضایائے عظیم آباد تفویض ہوا۔ ہر چند آپ نے بہت کچھ انکار کیا اور معذرت چاہی مگر سلطنت کے اصرار اور مراحم خسروانہ نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ آپ کو یہ خدمت قبول کرتے ہی بنی۔ چار و ناچار کچھ دنوں اس منصب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آخر منصب کی ذمہ داریوں سے گھبرا اٹھے اور سب سے بڑھ کر یاد الٰہی میں خلل پڑتے دیکھ کر مستعفی ہو گئے۔ مردم شناس اور علم دوست

سلطنت کی نگاہ انتخاب جس کو چن لیتی ہے پھر اس کا چھٹکارا کہاں؟ قضایا سے مستعفی ہوئے تو حضرت شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے چھوٹے شہزادے محمد مراد کی اتالیقی کے لئے بلائے گئے۔ ملاّ کا خطاب ملا اور جاگیر و تمغے عطا ہوئے۔ سارا خاندان شاہی عطیات سے اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ جب آپ اتالیقی سے سبکدوش ہوکر اپنے وطنِ مالوف پہونچے تو ۱۱۳۹ھ میں ایک رفیع الشان مسجد بنوائی جو خواجہ کلان کی اس سڑک کے وسط میں واقع ہے جو شاہراہ سے گھاٹ کو گئی ہے۔ اس مسجد نے بھی زمانہ کے انقلاب اور سلطنت مغلیہ کے زوال کا ساتھ دیا اور سو برس کے قیام کے بعد آخر سر بہ سجود ہو ہی گئی۔ حضرت مبارک کے والد حضرت وامقؔ مرحوم نے ۱۲۹۹ھ میں اس کو از سر نو بر وضع قدیم تعمیر کرائی جس کی خود یہ تاریخ لکھی۔

جدِ امجد من قاضی این شہر عظیم — صاحب مست از مے نابِ توحید
علامۂ وقت و بہ اوامر آمر — ناھی ز نواھی بہ ہزاران تہدید
ملا لقب و یار محمد اسمش — شیرین ثمر نخل شکر گنج فرید
کحلِ بصرِ دیدۂ حق بین ہمہ تن — خاکِ قدمِ شاہِ ترابش گردید
بالجبر باو کار قضا شد تفویض — آخر شدہ مستعفی و خود دست کشید
او کرد بنا مسجدی عالی و رفیع — تا کعبہ ہم آوازِ اذانش برسید
بگذشت ز صد سال چو افزون بقیام — جبید ز پا راکع و ساجد گردید
صد شکر کہ بر وضع ہمایونِ قدیم — تعمیر شد از فضل خداوند مجید

از روی ادب سال بنا وامقؔ گفت
این مسجدِ کہنہ شدہ تعمیر جدید (ص۵)

۱۲۹۸ + ۱ = ۱۲۹۹

تحصیلِ علم : آپ نے فارسی درسیات بڑے ذوق وشوق سے تمام کی۔ اس کے بعد آپ کو عربی شروع کرائی گئی۔ جیوں تیوں صرف ونحو تمام ہوئی تھی کہ آپ ضرب زید عمرا کی معرکہ آرائی سے گھبرا اٹھے۔ بھلا گداز طبیعت اور عاشق مزاج دل اس ترکیب کا کب متحمل ہوسکتا تھا۔ آخر آپ کی خمیر انگریزی تعلیم کی طرف راجع کی گئی۔ خیر اس تعلیم کو آپ نے انٹرنس تک پہونچا کر چھوڑا۔ چند ہی سال کے بعد آپ کے والد ماجد کا وصال ہوا۔ آپ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ اس وقت آپ بالکل بے یار و مددگار تھے۔ ساری رنگ رلیاں کافور ہوگئیں اور ساری آزادی اور بے پروائی معدوم۔ نہ کوئی سرپرست تھا نہ کوئی مربی۔ ترقی کی ساری راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ آپ کو انقلاب عظیم کا مقابلہ پیش تھا۔ اس وقت آپ نے نہایت اضطراب اور انتشار کی حالت میں ایک بڑی ہستی کو اپنا مربی سمجھ کر ایک عریضہ 'عرض حال' لکھا۔ جس میں آپ نے نہایت

موثر الفاظ میں اپنی پریشانی کا خاکہ کھینچا ہے اور نہایت ہی لطیف اشاروں میں اپنی خانہ جنگی کا تذکرہ کیا ہے اور ضمناً بڑے سلیقے سے اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں پر اس 'عرض حال' کا اعادہ لطف سے خالی نہیں۔

افسرِ خاندان بجائے پدر — سایۂ عاطفت عزیزوں پر
خیر کن خیر خواہ خیر اندیش — حامی بیکساں حمایت کیش
سرِ آفت رسید خم کر کے — لخت لختِ جگر بہم کر کے
عرض کرتا ہے یوں یہ سینہ فگار — کہ زمانہ ہے درپے آزار
اٹھ گیا جب سے باپ کا سایا — سر پہ ادبار جھوم کر آیا
خانہ جنگی نے اپنا کام کیا — گھر کا قصہ مرے تمام کیا
رات آفت کی، دن مصیبت کا — ہر گھڑی سامنا قیامت کا
آنکھ رونے کو لب فغاں کے لئے — منتظر مرگِ ناگہاں کے لئے
خارِ حسرت کے دل فگاروں میں — ناوکِ یاس کے شکاروں میں
اس مصیبت میں مبتلا ہیں ہم — آپ اپنے لئے بلا ہیں ہم
سر پرست اپنا کھو کے بیٹھے ہیں — بخت و دولت کو رو کے بیٹھے ہیں
ہاں! اگر سرپرست ہو کوئی — تو مرا بندوبست ہو کوئی
خاندانی ہے خدمتِ شاہی — اور بہ دل شاہ کی ہَوا خواہی
نام آور ہوئے بزرگوں میں — جوڈیشل افسر بزرگوں میں
عہد وکٹوریا میں باپ نے بھی — کرسی عدل، منصفی پائی
نوکری تیس سال کی ساری — بعد ازاں پنشنر تھے سرکاری
جو ہوا خیر سے ہوا نامی — اک مجھی کو ہوئی ہے ناکامی
سب تھے خدمت گذار سرکاری — میں ہوں خدمت گذار بیکاری
اس کو سرکار میں قدامت ہے — اس کو دربار میں قدامت ہے (ص ٦)
خوگر لطفِ خسروانہ ہے — جانتا اس کو اک زمانہ ہے
ہے گورنمنٹ پر ہمارا حق — ہم جتاتے نہیں یہ حق ناحق
امپرر میرا لطف کا خوگر — میں سزاوار اسپشل فیور
آپ اگر میری سعی فرمائیں — کیا عجب میرے دن بھلے آئیں

میرا ساتھی نہیں کوئی صد آہ — خضر منزل نہیں کوئی ہمراہ
یاس و حسرت کا سامنا ہر گام — مجھ کو ہونا قدم قدم ناکام
اے مرے خضرِ منزلِ مقصود — اے مرے رہبرِ رہِ بہبود
ایک صحرائے ہولناک میں ہیں — سو درندے ہماری تاک میں ہیں
شب تاریک و موج طغیانی — مبتلائے بلائے طوفانی
ڈوبتی ناؤ کی خبر لینا — پار اے ناخدا لگا دینا (۷)

اس 'عرض حال' کا انداز بیان اور لطفِ زبان حضرت داغ کی مثنوی 'فریادِ داغ' سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔ لکھتے لکھتے مجھے یہ خیال ہوا کہ میں 'فریادِ داغ' ہی کے اشعار نقل کر رہا ہوں۔ سبحان اللہ! جب اس 'عرض حال' سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور کشتی مراد ساحل مقصود تک نہ پہونچی اور مربی بنانے پر بھی مربیہ میسر نہ ہوا تو آپ کی مایوسی کی حد نہ رہی۔ آخر آپ کی صبر آزما طبیعت نے اس مایوسی کا کچھ علاج نکالا تو یہ نکالا کہ طب کی طرف توجہ کی جائے۔ چنانچہ آپ نے فارسی میں صرف دو سالیں 'میزان الطب' اور 'طب اکبری' پڑھی تھیں کہ ادھر سے طبیعت اچاٹ ہوگئی تو چھ برس تک ہومیوپیتھی پڑھ کر اس کی تکمیل کی اور مطب کرنے کی ٹھان لی۔ خود مریض عشق تھے مگر مسیحائی کرنے کا شوق ہوا۔ جب آپ نے مطب شروع کیا تو واقعی مسیحائی ہی کی۔ 'خود مرض و جملہ مرض را دوا' ثابت ہوئے۔ آپ مطب میں 'یک انار و صد بیمار' کی مثال تھے اور جب کبھی آپ فکرِ شعر میں آسمان سے تارے توڑ لانے کی فکر میں ہوتے تو غریب مریض یہ کہتے سنے جاتے:

مسیحا بھی فلک پر جا کے بیٹھے — ہمارا عارضہ مشکل سمجھ کر

اس وقت تک آپ کا مطب ایک اچھے انداز پر جاری ہے۔

مذاقِ فارسی: آپ فارسی کا بھی مذاقِ سلیم رکھتے ہیں۔ فارسی نظم ونثر میں صوبۂ بہار کے مایۂ ناز مسلم الثبوت ادیب، افضل العلما، اکمل الحکما حضرت مولانا حکیم عبدالحمید صاحب پریشاںؔ کے تلمذ کا آپ کو شرف حاصل ہے۔ آپ نے اپنے فارسی مکتوبات کا مجموعہ 'مکتوبات مبارک' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کو کیڑے قند پارسی سمجھ کر اس طرح چاٹ گئے کہ ہم ناظرین کو اس کی شیرینی سے لطف اندوز کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ آپ قدیم طرز کی انشا پردازی کے مشاق اہل قلم ہیں۔ رہی فارسی نظم، اس بیاض کا اس سے بھی بُرا حال ہے۔ اس کو تو کیڑے قند مکرر ہی سمجھ کر قطعاً صاف کر گئے۔ خدا جانے کس طرح کچھ قطعات اور کچھ قطعات تاریخ بچ رہے۔ انھیں کرم خوردہ مکتوبات میں جہاں جہاں موقع سے آپ نے قطعات لکھے تھے، اُن میں سے چند کیڑوں کی نگاہ بد سے محفوظ رہے جن کو میں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ اسی سے ان کے فارسی مذاق اور زورِ قلم کا پتا چل جائے گا۔ افسوس یہ ہے کہ ایک مکتوب بھی سلامت نہیں کہ نمونہ کے طور پر پیش کروں۔ اگر ان کے یہ سب مکتوب سلامت ہوتے تو ان کی

خانگی زندگی اوران کی انتظامی صلاحیت پر بہت کچھ روشنی پڑتی (ص ۷)۔ مگر فارسی نظم ونثر کا دفتر ہی ''گاؤخورد'' نہیں ''کرم خورد'' ہوگیا۔ ذیل کے قطعات انہیں کرم خوردہ مکتوبات سے لئے گئے ہیں اور کتنے قطعات کو تو کیڑوں نے اس طرح کھالیا ہے کہ کوئی مصرع سلامت نہیں۔ ان قطعات کا لطف انھیں مکتوبات میں تھا جہاں یہ چسپاں اور نثر سے دست وگریباں تھے۔

آنکہ ہر نخلِ تمنا ے کسے خنجر زند ۔۔۔ بیخ نخلِ آرزوے خویش را خود بر کند

تا بہ کے ماند نہالِ ظلم او سر برفلک ۔۔۔ سیلِ آبِ چشم مظلوم آخر از پا افگند

خوشا وقتی، خوشا روزے، خوشا سال ۔۔۔ خوشا ساعت کہ آمد پیک خوش حال

نشان از خرمی و خوشدلی داد ۔۔۔ دلِ غمگینِ من خوش گشت و خوش حال

بیاد آرند ما را ہم صفیرانِ چمن گاہے ۔۔۔ مبارکؔ نالہ ہاے چند باشد یادگارِ ما

بے خندۂ غنچہ و گل این است ۔۔۔ نے نغمۂ نے و بلبل این است

حالِ دلِ ریش را زبان نیست ۔۔۔ افسانۂ خویش را زبان نیست

از خانہ خرابیم چہ گویم ۔۔۔ بے نام و نشانیم چہ گویم

روداد ہمین کہ رو بہ دیوار ۔۔۔ می مانم و آہ و نالۂ زار

وارفتگیم حکایتے ہست ۔۔۔ آوارگیم روایتے ہست

گویم چو بہ سنگ آب گردد ۔۔۔ آہن شنود خراب گردد

آپ کے ایک فارسی منظوم مکتوب کا اندراج اس ضمن میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو آپ نے اگست ۳۵ء میں جناب سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفانؔ رئیس اسلام پور پٹنہ کو آموں کی رسید میں لکھا تھا۔

چہ خوش نام نامی کہ اکرام دین ۔۔۔ بانگشترِ دل بُوَد خوش نگین

تخلص ترا بسکہ عرفان خوش است ۔۔۔ لقب افتخارِ سخنداں خوش است

ہنر پرور و قدردانِ سخن ۔۔۔ سخن گو، سخندان و جانِ سخن

سراپا نوازش مبارک نواز ۔۔۔ سلامِ مبارک بہ عجز و نیاز

بدست آمدہ نامۂ شایگان ۔۔۔ بشکرش سرافگندہ کلک و زبان

ز آره همان روز باز آمدم　　به لطف شما سر فراز آمدم
چه خوش انبه هر دانه اش خوب بود　　بکام و دہن بسکہ مرغوب بود (ص ۸)
مبرّا ز کرم مبرا و منزه ز داغ　　بهر وصف سرمایهٔ ناز باغ
بسے زعفرانی و کم سبز پوش　　همه در حلاوت کم و بیش نوش
مگر هر یکے کوزهٔ قند بود　　که شهد مصفا در آن بند بود
بزرگ آنچنان بود هر دانه اش　　نگنجد به الفاظ پیمانه اش
شگل پیش و بسیار راقم بخورد　　همین بر همه گوی سبقت ببرد
شنیده ندیده چو من مردِ پیر　　بجا گویمش انبهٔ بی نظیر
سزد هر یکی را هزاران سپاس　　مرا یک زبان عاجزم بی قیاس
بایجاز مدحش رقم داشتم　　بصد عجز تخم سخن کاشتم
همین است پیانهٔ همتم　　به سوگند محبوب و شرمنده ام
خدایت دهد عمر پایندگی　　بباغت قیام و برومندگی
چه گویم چه خوش بیتها گفته ای　　گهرها بسلک سخن سفته ای
فرستادهٔ گرچه اشعار چند　　همه با ثمر های فکرِ بلند
همین است مشتی ز خروارها　　که بسیار داری جگر پار ها
هزار آفرین صد هزار آفرین　　به فکر شما بی شمار آفرین
مبارکؔ که فکرش کهین و پسین　　چه تحسین کند پیشکش بیش ازین
به عارفؔ هزاران سلام و نیاز　　که او هم چو عرفانؔ مبارک نواز
بود مخلص و قدر افزای من　　بود مست صهبای شعر و سخن
به میخانه اش خوش حریف آمده　　که طبعش نفیس و شریف آمده
منم شاعر هند و هندی نژاد　　نیَم حافظؔ و سعدیؔ خوش نهاد
ز فیضِ پریشانؔ خلد آشیان　　بباغ دری کلکِ من گلفشان
همین شوخیِ توسنِ خامه ام　　که آراسته از دری نامه ام
به اردو زبانم چنان تیغ تیز　　به پیکارِ اہل زبان در ستیز
خدائے سخن داغؔ استاد هست　　به اردو زبانم خدا داد هست

کنون فکر پستش بپایان رسید
مبارک ازان دست آخر کشید

اردو مذاقِ شاعری : ابتدائی تعلیم ہی کے زمانے سے آپ کی طبیعت اردو شاعری کی طرف مائل تھی۔ پدر بزرگوار کی خفگی کے خوف سے چپکے چپکے نظم کرتے اور چاک کر ڈالتے۔ برسوں یہی سلسلہ رہا۔ نہ کسی سے مشورہ نہ کسی سے اس کا تذکرہ۔ جب کچھ مشق بڑھی تو آپ نے اپنا کلام تقریباً دو سال تک سہسرام کے مولوی حسن جان خان صاحب (ص ۹) حسن مرحوم کو دکھانا شروع کیا۔ پھر آپ نے ۱۳۱۰ھ میں فصیح الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی کے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ جب تک حضرت داغ زندہ رہے برابر اپنا کلام انھیں دکھاتے رہے۔ حضرت داغ کے خاتمہ بالخیر کے ساتھ ۱۳۲۲ھ میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ حضرت داغ کے قلمِ اصلاح نے گل کاری اور ان کے دیوان نے تحقیق زبان اور بندشوں کی چستی کی رہنمائی کی۔ آپ کے لئے یہی کافی اور بس تھا۔ حضرت مبارک جو کچھ دیکھتے انھیں کی آنکھوں سے دیکھتے اور جو بولتے انھیں کی زبان سے بولتے ہیں۔

آپ نے اپنے دونوں استادوں حضرت پریشاں علیہ الرحمہ اور حضرت داغ کے مرثیے لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں :

مرثیہ داغ

اہل زمیں ہی ایک نہیں اشکبارِ داغ — یہ چرخ نیلگوں بھی تو ہے سوگوارِ داغ
اگتے رہیں گے لالہ و گل اس کی خاک سے — پھولا پھلا رہے گا یوں ہی لالہ زارِ داغ
تا حشر نام صفحۂ ہستی پہ رہ گیا — کس کے مٹائے مٹتے ہیں نقش و نگارِ داغ
ہر دل میں داغ داغ کا ہے نقش کالحجر — ہر دل میں یاد داغ کی ہے یادگارِ داغ
ہم تو کہیں گے صاحبِ تسخیر تھا کوئی — دیکھو کہ ہے کہاں سے کہاں تک حصارِ داغ
اک خضر تھا کہ راہ پہ سب کو لگا گیا — اک خلق جا رہی ہے سرِ رہگذارِ داغ
گھٹتی ہوئی تھی خاک سے بھی کچھ فروتنی — بڑھتا ہوا تھا کوہ سے بھی کچھ وقارِ داغ
اب ایسا دَور گردشِ دوراں دکھا چکی — اب ہو چکا سخنور ہم افتخارِ داغ
وہ مر گیا کہ مر گئی اردو زبان آج — یہ کیا بنا مزارِ سخن یا مزارِ داغ
جی ڈھونڈھتا ہے ہائے اسی سحر کار کو — لائیں کہاں سے خامۂ جادو نگارِ داغ
پڑتی نہیں نگاہ کسی گل عذار پر — آنکھوں میں بس رہی ہے کچھ ایسی بہارِ داغ
دیکھیں نہ آنکھ اٹھا کے مسیحا ہی کیوں نہ ہو — وہ جاں نثار داغ ہیں ہم دلفگارِ داغ

معلوم ہے کہ ایسوں کا ملنا محال ہے کھینچیں گے تا بہ روز جزا انتظارِ داغ
کیا شخص آج خاک میں افسوس مل گیا رو رو کے کہہ رہی ہے یہ شمع مزار داغ
ہوتی ہے دل کے پار مبارکؔ یہ آہ آہ
اللہ صبر دے تجھے اے سوگوارِ داغ (۸)

استاد کے ساتھ جیسا غلو تھا اس کا اظہار کس موثر الفاظ میں کیا ہے۔

معلوم ہے کہ ایسوں کا ملنا محال ہے کھینچیں گے تا بہ روز جزا انتظارِ داغ

سبحان اللہ! سارا مرثیہ جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔

مرثیہ حضرت پریشان علیہ الرحمہ

داد ای دورِ روزگاران داد داد ای جورِ روزگاران داد
الامان ای جہانِ پُر آشوب الامان ای زمانِ پُر آشوب
حسرت ای دورِ گردشِ ایام حسرت ای روزگارِ نافرجام (ص ۱۰)
حسرت ای انقلابِ دل خون کن حسرت ای اضطرابِ دل خون کن
آہ علامۂ پریشان آہ نہ رہا اس لقب کا شایان آہ
آہ ای منبع علوم و فنون آہ ای مرجع علوم و فنون
آہ ای قبلۂ ہنرمنداں آہ ای کعبۂ ہنرمنداں
آہ ای مہرِ آسمانِ کمال آہ ای جان وای جہانِ کمال
آہ ای شمع بزم ذی ہنراں جلوۂ محفل خرد منداں
آہ ای آبشار فیض علوم آہ ای رودبار فیض علوم
آہ مقصودِ کاسبانِ ہنر آہ مطلوبِ طالبانِ ہنر
تھا پریشانؔ وہ برائے نام جامعیت کا تھا وہ ماہ تمام
سر پہ عمامۂ ہمہ دانی زیب تن جامۂ ہمہ دانی
وہ طبیبِ یگانۂ دوراں کہ مسیحا دم و مسیح زماں
تازگی بخشِ طبِ یونانی بو علی و ارسطوے ثانی
تھا نہ آلاتِ طب کا وہ محتاج یہ مہارت تھی طب میں، یہ معراج

تھرمامیٹر تھیں انگلیاں اُس کی — سینہ میں دستگاہیاں اُس کی
بلبلِ خوش نوائے باغِ سخن — ہو گیا آج گل چراغِ سخن
عہد کا اپنے تھا وہ قاآنی — آپ اپنا جواب اور ثانی
فارسی صاف اہلِ فارس کی — عربی اُس کی تھی عرب کی سی
تھا تغزل میں حافظِ شیراز — نثر سعدی تھا نثر کا انداز
مثنوی کے وہ آبدار اشعار — تھا قلم اس کا ابرِ گوہر بار
تھے خدا داد اس کے ذہن و ذکا — عرش پیما تھی اس کی فکرِ رسا
لکھتا تھا نظم و نثر برجستہ — طبع تھی ہر گھڑی کمر بستہ
تھا وہ حاضر دماغ بے ہمتا — الغرض ہر صفت میں تھا یکتا
ہے یہ اس بے مثال کی رحلت — کہ ہے فضل و کمال کی رحلت

اس کا ماتم ہے اور عظیم آباد
اس کی میت ہے اور فغاں، فریاد (۹)

اوپر حضرت داغؔ کا مرثیہ تھا اور یہ حضرت پریشاںؔ کا مرثیہ ہے۔ ذرا اس کی جامعیت کو دیکھنا اور اس میں چوٹ کھائے ہوئے دل کے جذبات کے مزے لینا، کتنا اثر میں ڈوبا ہوا مرثیہ ہے۔ بات... پریشاںؔ کی خاص شفقت و محبت اور رات دن کی صحبت کی یاد نے (ص ۱۱) حضرت مبارک کے دل کو بے چین کر کے یہ مرثیہ لکھوایا ہوگا۔ اس مرثیہ میں بھی داغؔ کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔

تصانیف : آپ کے فارسی تصنیفات میں 'مکتوبات مبارک' تھا جس میں تقریباً تیس مکتوب تھے۔ شایع ہونے سے پہلے کیڑوں کے دندانِ آز نے صاف کر دیا۔ دوسرا مجموعہ فارسی نظم کا تھا جس میں قطعات وغیرہ تھے۔ وہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اردو میں ''مسدس فتح کمال''، ''مرقع سخن حصہ اول''، ''مرقع سخن'' حصہ دوم طبع ہو کر شایع ہو چکے ہیں۔ مرقع کے دونوں حصے وزارت تعلیمات بہار واڑیسہ کی سرپرستی سے شایع ہوئے ہیں۔ ان دونوں حصوں میں غزلوں اور رباعیوں کے سوا تقریباً ہر قسم کی اخلاقی، تعلیمی، معاشرتی نظمیں ہیں۔ مرقع کا دوسرا حصہ پٹنہ یونیورسٹی نے میٹرک کے امیدواروں کے لئے منظور کیا ہے۔

آپ کا اردو دیوان قریب قریب مرتب ہے۔ اس میں غزلوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے مگر اب تک اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ خدا کرے ان کی زندگی میں شایع ہو جائے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگے۔ آپ کا کلام اکثر ہندوستان کے ماہانہ رسالوں اور گلدستوں میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کی بیشتر نظمیں اخبار الپنچ بانکی پور میں شایع ہوتی

ہیں۔اس کے بعد اخبار اتحاد پٹنہ میں۔

فی البدیہ گوئی : آپ کی مشق اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر موقع پر آپ ایسے برجستہ اور چبھتے ہوئے شعر موزوں کر کے پڑھ جاتے ہیں کہ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔آپ ایک مرتبہ خان بہادر مولوی محمد حامد صاحب سے جو سابقاً ایڈشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پٹنہ اور انچارج پٹنہ میونسپلٹی تھے اور اس وقت لوکل سلف گورنمنٹ کے سکریٹری تھے (اب بالاسور کے کلکٹر ہیں) رانچی ملنے گئے۔وہاں آنریبل مسٹر سید عبد العزیز صاحب وزیر تعلیمات سے بھی ملے۔انھوں نے دوسرے دن کھانے پر مدعو بھی کیا۔جب آپ رانچی میں پہاڑی چشمہ کی جو ہنڈروفال کے نام سے مشہور ہے، سیر کو گئے وہاں خوش منظروں کے منظر سے متاثر ہوئے اور بے ساختہ آپ کی زبان پر یہ شعر آیا :

دل لوٹنے والے بھی مبارک نظر آئے   کہسار بھی رانچی کا پرستاں نظر آیا (۱۰)

رانچی سے خان بہادر موصوف بہ نظر سیر آپ کو کلکتہ لے گئے۔آپ کو خان بہادر رضا علی صاحب وحشتؔ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔خان بہادر نے جناب وحشتؔ کو لکھا کہ ''حضرت مبارک عظیم آبادی ہمارے ہمراہ رانچی سے کلکتہ تشریف لائے ہیں اور آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ہم لوگ کس وقت آپ کے یہاں حاضر ہوں''۔حضرت وحشتؔ نے لکھا کہ '' مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ سے ملنے کا موقع ملا اور مسرت بالائے مسرت یہ ہے کہ میں ہمیشہ حضرت مبارک عظیم آبادی کی غزلیں پڑھ کر محظوظ ہوتا تھا ان سے مل کر بھی محظوظ ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔انشاء اللہ کل میں خود دوپہر کو آپ حضرات سے ملنے حاضر ہوں گا''۔جس وقت جناب وحشتؔ پہونچے حضرت مبارک نے فی البدیہہ قطعہ پڑھا :

یہ کرم ملنے کو خود حضرت وحشتؔ آئے

کیا کہیں ہائے کس اخلاص و مسرت سے ملے

سیر کلکتہ کی اس سیر پہ سو بار نثار

یہ بڑی سیر ہوئی حضرت وحشتؔ سے ملے (ص۱۲)، (۱۱)

اسی سیر کلکتہ کے دوران میں جناب حکیم عبد العلی صاحب فغاںؔ پروفیسر سینٹ زیویرس کالج کلکتہ کے ہاں کی صحبت میں حضرت آرزوؔ لکھنوی سے بھی ملاقات ہوئی۔اولین ملاقات کے موقع پر حضرت مبارکؔ نے جناب آرزوؔ سے خطاب کرتے ہوئے برجستہ یہ قطعہ پڑھا :

آرزو مند تھے زیارت کے   ہمہ تن محو آرزو ہم ہیں

ہاتھ آیا ہے کعبۂ اردو   جس طرف بھی ہیں قبلہ رو ہم ہیں (۱۲)

قطعہ سن کر آرزوؔ صاحب فرمانے لگے کہ'' قطع نظر اس سے کہ یہ قطعہ ہماری مدح میں فرمایا گیا ہے، میں برجستہ گوئی کی داد کے ساتھ اس کی داد دیتا ہوں کہ جو مفہوم موزوں فرمایا گیا ہے اس کی موزونیت کا پہلو لاجواب ہے''۔اور

جب حضرت مبارکؔ کی غزلیں سنیں تو فرمایا ''آپ داغؔ کی زندہ تصویر ہیں''۔

مذکورہ بالا قطعہ کا آخری شعر :

جس طرف بھی ہیں قبلہ رو ہم ہیں — ہاتھ آیا ہے کعبۂ اردو

ایک اور قطعہ میں آپ نے فرمایا :

اب ایسی ہستیاں ہیں مبارکؔ کہاں نصیب

وحشتؔ یہاں ملے کہ سخن کا خدا ملا (۱۳)

موقع کی مناسبت مضمون کی لطافت اور فی البدیہہ گوئی کے اعتبار سے اِن قطعات کے کیا کہنے ہیں مگر حضرت مبارکؔ کی غیور طبیعت کو خیال کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ سوائے اپنے استاد حضرت داغؔ کے کسی کو خدائے سخن کیا معنی، ناخدائے سخن بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

آنکھوں میں بس رہی ہے کچھ ایسی بہارِ داغؔ — پڑتی نہیں نگاہ کسی گل عذار پر

وہ جاں نثارِ داغ ہیں ہم دلفگارِ داغؔ — دیکھیں نہ آنکھ اٹھا کے مسیحا ہی کیوں نہ ہو

کس طرح انھوں نے اپنے کلام کی خود تعریف کی۔ ممکن ہے بے ساختگی میں ایسا کہہ گئے ہوں۔ میرے خیال میں حضرت مبارکؔ حدِ مدح سرائی سے تجاوز کر گئے ہیں جو خود ان کی شان کے خلاف ہے۔

شعرا سے ملاقات : قیام کلکتہ میں مبارکؔ کو یہاں کے مشاہیر شعرا جناب خان بہادر رضا علی خان وحشتؔ، حضرت آرزو لکھنوی، حضرت ماِئر، جناب مولوی عبدالرحیم صاحب سی آئی ای، جناب مولوی اکمل علی صاحب اکملؔ، جناب جمیل صاحب مظہری، جناب سید نظیر الدین صاحب رضوی، پروفیسر عبدالصمد صاحب قمرؔ، مولوی عبدالرحمٰن صاحب آصفؔ، مولوی محمد سلیمان صاحب واصفؔ، سید اصغر علی صاحب غافلؔ، پروفیسر مولوی محمد طاہر صاحب طاہرؔ رضوی، حکیم مولوی عبد العلی صاحب فغاںؔ، جناب محمد مرزا صاحب شوریدہؔ، جناب انور صاحب انورؔ، جناب ظریف صاحب برادر خرد جناب صفیؔ صاحب لکھنوی سے تبادلۂ خیالات اور کلام سنانے اور سننے کا خوب خوب موقع ملا۔ آپ کے اعزاز میں مشاعروں کی دھوم تھی۔ جناب وحشتؔ اور جناب اصغر علی صاحب غافلؔ رئیس کلکتہ اور آپ کے میزبانوں نے ایک خاص صحبت پھر یہاں کی ایک ادبی بزم موسومہ 'بزم احباب' کی طرف سے جس کے صدر جناب وحشتؔ اور معتمد جناب محمد بشیر مرزا صاحب علیگ ہیں، مولوی عبدالرحیم صاحب سی آئی ای کے دولت کدہ پر ایک پُر لطف صحبت منعقد ہوئی۔ جس کی روداد مسلم گزٹ کلکتہ کی دو اشاعتوں میں شایع ہوئی۔ پہلی اشاعت مورخہ ۱۵ نومبر ۳۵ء میں جو کیفیت شایع ہوئی اس کو ہم بجنسہ یہاں پر ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کرتے ہیں۔

✦✦✦

علامہ مبارک عظیم آبادی

"... عرصے سے کلکتہ میں اردو زبان کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر یعنی (ص ۱۳) علامہ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی فروکش ہیں۔ آپ حضرت داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ آپ کو صحیح معنوں میں اردو زبان کا بے بدل نغز گو شاعر اور داغ مرحوم کا سچا جانشیں کہہ سکتے ہیں۔

ہمیں بزم احباب کلکتہ کے مشاعرے میں جو ۱۰/ نومبر کو منعقد ہوا تھا حضرت علامہ کا کلام بلاغت نظام سننے کا اتفاق ہوا۔ اللہ اکبر! دلّی کی زبان اور وہ بھی داغ والی دلّی کی زبان، روز مرہ، بول چال، ٹکسالی محاورے، چست بندشیں، دل نشیں ترکیبیں، الغرض طبیعت ایسی خوش ہوئی کہ گویا خود حضرت داغ نور اللہ مرقدہٗ اس بزم میں تشریف لائے ہیں اور اپنا فصیح و سلیس کلام پڑھ رہے ہیں۔ علامہ مبارک کی شرکت کے باعث 'بزم احباب' کا یہ جلسہ حق تو یہ ہے کہ ایک یادگار جلسہ ہے۔ ہم اس جلسہ کی مفصل کاروائی اور حضرت علامہ کا کلام انشاء اللہ بہت جلد شایع کریں گے۔ آج ہم اُن کا وہ قطعہ شایع کر رہے ہیں جو انھوں نے حضرت وحشت اور کلکتہ کے دوسرے سخن گو اور سخن فہم ارباب ادب کے لئے لکھا ہے اور بزم احباب کے مشاعرہ میں پڑھا تھا۔ یہ قطعہ یقیناً مبالغہ کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ آپ کی کما حقہ قدر و منزلت جیسی کہ ہونی چاہیے تھی نہیں ہو سکی اور کلکتہ والوں نے آج تک آپ کے اس درجہ اور رتبہ کو نہیں پہنچایا جس پر علم شعر کی خداداد قابلیت نے آپ کو پہونچادیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

وہ قطعہ جو آپ نے اس بزم میں پڑھا تھا، درج ذیل ہے :

اللہ ری یہاں کی مسافر نوازیاں — جو دل مجھے ملا یہاں مہماں سرا ملا
میں زیر بارِ منتِ اربابِ قدر ہوں — خلعت ہر ایک سے مجھے اعزاز کا ملا
ذرے کو اس نے مہر درخشاں بنا دیا — میری بساط سے مجھے رتبہ سوا ملا
اِن قدر دانیوں نے نوازا اور اس قدر — میدانِ شاعری مجھے ہمت فزا ملا
جس پر نظر پڑی نظر آیا صفا سرشت — جس سے ملے وہ پیکر مہر و وفا ملا
اہل سخن یہاں کے تعصب سے پاک ہیں — یعنی کہ جو ملا وہ خلوص آشنا ملا

یہ وہ ہیں جن سے آج سخن ہے عروج پر — اِن کے سخن سے اوجِ سخن کا پتا ملا
ہر ایک اِن میں صاحبِ فکرِ بلند ہے — ہر ایک اِن میں صاحب طبع رسا ملا
ترکیب بھی نئی نئی، مضمون نئے نئے — لطف آیا بندشوں کا زباں کا مزا ملا
جو نغمہ زن ملا مجھے گلزار نظم میں — باغ سخن کا بلبل رنگیں نوا ملا

اب ایسی ہستیاں ہیں مبارک کہاں نصیب
وحشت یہاں ملے کہ سخن کا خدا ملے

اب ہم ذیل میں 'بزم احباب' کے جلسہ کی مفصل روداد جو مسلم گزٹ کلکتہ مورخہ ۱۸/ نومبر ۳۵ء میں شائع ہوئی تھی، درج کرتے ہیں :

''بزم احباب کا ایک جلسہ ۱۰/ نومبر ۱۹۳۵ء یوم یکشنبہ ۹ بجے شب کو بہ مکان جناب عبد الرحیم صاحب سی آئی ای ممبر بزم احباب منعقد ہوا۔ علاوہ ممبران کے ۱۷ معزز مہمان بھی مدعو تھے۔ ان میں جناب مائر صاحب، جناب پروفیسر عبد الرحیم صاحب، جناب عبد الرسول صاحب، جناب سیٹھ...(ص ۱۴)، جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اور جناب مولوی سید شاہ محمد حسن صاحب بسمل عظیم آبادی تلمیذ رشید حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

جلسے کا پروگرام روئداد جلسہ گذشتہ پڑھنے کے بعد جناب عبد الرحیم صاحب ممدوح کا سراپائے رسول جو انھوں نے لکھا تھا، سنانا تھا جس کو آپ نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد ممبر بزم احباب گوہر صاحب کو ان کا اپنا لکھا ہوا ڈراما سنانا تھا مگر ڈاکٹر مبارک حسین صاحب کے کلام سننے کے ممبران اور حاضرین مشتاق تھے۔ اس لئے ڈراما کا پڑھا جانا ملتوی ہوا اور اول ڈاکٹر صاحب موصوف کے شاگرد نے اپنا کلام سنایا پھر بزم کی خوش قسمتی سے جناب محمد حسن صاحب بسمل عظیم آبادی بھی جو کلکتے میں مقیم تھے اور مدعو کیے گئے تھے، تشریف لائے تھے۔ ان کا کلام سنا۔ کیا کہنے! اعلیٰ خیالات، عمدہ بندشیں اور اچھے مضمون، سب نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مبارک حسین صاحب مبارک نے جو داغ دہلوی کے شاگرد رشید ہیں، اپنا کلام سنایا۔ کیا کہنے! زبان کے لحاظ سے تو گویا خود داغ بول رہے تھے۔ بندشیں سادی مگر مزین، نگینے کی طرح جڑی ہوئی۔ غرض غزل پر غزل پڑھوائی جاتی تھی اور کسی طرح پیاس نہیں بجھتی تھی۔ سات غزلیں پڑھوائی گئیں جن میں سے چند اس اخبار کے صفحہ اول پر ناظرین کے

واسطے لکھی جاتی ہیں... آخر جلسے میں معتمد بزم نے سب حاضرین اور خاص کر ڈاکٹر مبارک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور آپ کے کلام کی تعریف کی"۔ راقم۔ محمد بشیر مرزا (علیگ)

معتمد بزم احباب

اتباع استاد : جناب مبارک کی کوئی غزل پڑھو ہر ایک میں حضرت داغ کا رنگ غالب پاوگے۔ وہی انداز بیان، وہی بندشوں میں برجستگی، وہی بے ساختہ پن۔ استاد کے اتباع میں آپ کو غایت درجہ شغف ہے۔ آپ اپنی غزلوں کے لئے زمینیں بھی ایسی ہی پیدا کرتے ہیں جس میں حضرت داغ کے رنگ کی کھپت ہو اور زبان کا لطف پیدا ہو سکے۔ آپ حقیقی معنوں میں داغ کے معنوی فرزند ہیں۔ آپ خود بھی اپنی زبان و بیان کے حق بجانب مدعی ہیں :

مبارک فیض یاب بلبل ہندوستان ہوں میں
یہ دعویٰ حق بجانب ہے بیاں میرا زباں میری

زبان کی تحقیق و تدقیق : آپ کو ابتدا ہی سے زبان کی تحقیق کا شوق ہے۔ آپ جس اہل زبان یا زبان داں سے تبدیل خیالات کرتے ہیں تو اکثر زبان کی تحقیقات ہی کے متعلق گفتگو ہوتی ہے یا شعر و شاعری موضوع بحث ہوتی ہے۔ اس خصوص میں فرماتے ہیں :

میں کلمہ گو تو داغ سے اہل زباں کا ہوں
مجھ کو تو چھان بین مبارک زباں کی ہے (۱۴)

خصوصیات کلام : آپ کے دیوان پر غائر نظر ڈالنے سے یہ خصوصیت بیّن طور پر عیاں ہوتی ہے کہ آپ کے کلام میں ابتذال کا نام و نشان نہیں۔ آپ کا کلام بازاری زبان اور سوقیانہ محاورات سے بالکل پاک ہے۔ آپ عامیانہ تخیل سے بہت بچتے ہیں۔ جو جذبات آپ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اس کو جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ ایسا بے ساختہ... کہ سننے والے کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ بے ساختہ پن جس کے سادہ پن پر (ص ۱۵) ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام میں جذبات دلی اور واردات قلبی کا عنصر غالب ہے۔ خود فرماتے ہیں :

جو دل پہ گزرے کھنچے اس کی صفحہ پر تصویر
قلم اٹھے نہ مبارک خیال بندی پر (۱۵)

۔ داغ کی زبان کے اتباع کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام میں معنویت بھی ہے اور خاندانی تصوف کی پٹ بھی کہ جس سے آپ کا ایک خاص رنگ ہے :

خاص ہے اپنی مبارک روش راہ سخن
یہ وہ کوچہ نہیں جو رہ گزر عام رہے (۱۶)

خمریات : آپ کے دیوان میں خمریات کے تین چار سو سے کم اشعار نہ ہوں گے۔ مگر اس خمریات میں ایسا کچھ کہہ گئے ہیں کہ بس سنا ہی کیجیے۔ فرماتے ہیں :

لپکا ہے محتسب کو غضب دار و گیر کا — اللہ ہی ہے بس مرے دورا خیر کا (۱۷)

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا (۱۸)

آپ مئے و مینا سے رزق مراد لیتے ہیں اور اپنے اس اصطلاح کے پردہ میں بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں رمضان کے افطار کے وقت کا کس خوبی سے سماں کھینچا ہے۔ سارا سامان کھانے پینے کا چنا ہوا ہے مگر حکم الٰہی کے انتظار میں ہاتھ نہیں بڑھتا۔ دیکھو خمریات میں کیا بات پیدا کی ہے :

ہر مست سمجھتا ہے ہشیار ہمیں ہیں — اے میکدے والو! تمہیں کیا بے خبری ہے (۱۹)

اس خمریات میں اخلاقی سبق کا لطف دیکھو۔

میرا آنا ہی ہے کیا اے ساقی — تیری خیرات چلی جاتی ہے (۲۰)

انّ اللّٰہ ھو خیر الرازقین کی تفسیر ہے۔ رازق مطلق کی عام رزاقی کو جو بے منّ و اذیٰ ہو رہی ہے کس سادگی سے ادا کیا ہے :

لگا دے حرمتِ مئے میں یہ قید اے واعظ

اُسے حرام ہے جس کو کہ امتیاز نہیں (۲۱)

خمریات میں کس خوبصورتی سے **اَرئیتم ما انزل اللّٰہ لکم من رزقٍ فجعلتُھم منہ حراماً و حلالاً** کی تلمیح کی ہے۔ سبحان اللہ!

خدا جانے کہاں سے کھنچ کے میخانے میں آتی ہے

خبر اتنی تو ہے شیشے سے پیانے میں آتی ہے (۲۲)

کتنا بلند پایہ مضمون ہے۔ **یرزقہ من حیث لا یحسب** اور **یرزقھا رغداً من کل مکانٍ** کی اس سے اچھی تفسیر نہیں ہو سکتی۔ شاعری کا چوکھا رنگ اور پھر خمریات میں ایسی پیاری تفسیر سبحان اللہ! سبحان اللہ! اب ذرا سر اقبال کی **ان الابرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جھیم** کی تفسیر ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

سے موازنہ کرو۔ اس میں شاعری کی بو باس بھی نہیں ہے۔ اسی خمریات میں ایک اور شعر سنو :

ملی روز ہم فاقہ مستوں کو مئے — خدا جانے مہنگی کہ سستی رہی (۲۳)

اندازِ بیان کی داد دو۔ اللہ یرزق من یشاءُ بغیر حساب کی کتنی پیاری اور چست تفسیر ہے۔
'بغیر حساب' کی تفسیر خدا جانے مہنگی کہ سستی رہی کتنی دلکش..... (ص۱۶)

.....اشعار میں صرف جام وسبو کے شکست کا بیان ہے۔مگر اندازِ بیان اور..... بیان کی برجستگی اور ندرت کو دیکھتے جاو۔

رندوں کی یہ شکست بھی ہے فتح محتسب ٹوٹا سبو تو ٹوٹ کے پیمانہ بن گیا
توڑ کر ساغر مرا کیا محتسب نادم ہوا اس کے سب ٹکڑے مجھے اجزاے ایماں ہو گئے
کسی میکش کے دل سے پوچھ کیا ہیں یہ ٹکڑے محتسب جام و سبو کے
محتسب جام نہ تھے دل تھے قدح خواروں کے زیرِ پا آئے نہ ٹکڑا کسی پیمانے کا (۲۴)

اب توبہ کی شکست دیکھو اور حضرت مبارک کی شوخ بیانی کی داد دو۔

نثارِ موسمِ گل جو نہ ہو شیخ مرے مشرب میں وہ توبہ ہی کیا ہے (۲۵)
مری توبہ ٹوٹ جائے تو مجھے معاف کرنا یہ قصور مجھ سے واعظ سرِ ہر بہار ہوگا (۲۶)
جام مئے شیخ مرے ہاتھ میں ہنگام بہار اور ترے دوش پہ توبہ کا جنازہ ہوگا (۲۷)
توبہ تو مجھ سے آج بڑی چال چل گئی کم بخت یاد آ گئی بوتل اتار کے (۲۸)

خمریات میں ایک لفظ سے شعر کو کہاں پہونچا دیتے ہیں۔فرماتے ہیں :

ہم رند مشربوں میں تو اول وہی رہا
ساقی نے جس کو دے دی مبارک اخیر کی (۲۹)

دیکھو 'اخیر' کے لفظ نے کس خوبصورتی سے ختم رسالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔حضرت مبارک کا یہ مبارک اور اچھوتا خیال واقعی قابل داد ہے :

آتی ہے بوے مۓ ترے جامے سے آج شیخ
اُتری ہوئی قبا کسی پیرِ مغاں کی ہے (۳۰)

ذرا اس شعر میں شوخ بیانی کا انداز دیکھو۔شیخ کی حرمت ملحوظ رکھتے ہوئے کھلے لفظوں میں شیخ پر مے نوشی کا اتہام نہیں لگاتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ 'جامے سے بوئے مۓ آتی ہے' شاید آپ نے پیر مغاں کا خرقہ عاریت لے لیا ہوگا۔
سبحان اللہ! کیا اسلوب بیان ہے ذرا دوسرا شوخ شعر بھی سن لو۔

کل کے لئے بھی آج لگا رکھی شیخ نے
تم تو اک آدمی ہو بڑے بند و بست کے (۳۱)

'تم بڑے بندوبست کے آدمی ہو' کیسی خوبصورت چٹکی لی ہے۔

جس نے چاہا پی لیا پیر مغاں کی ہے سبیل

بادہ خوار آیا تو کیا، پرہیزگار آیا تو کیا (۳۲)

رازق مطلق کی عام رزاقی کو اس خمریات میں کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور **ما مِن دابّۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** کی کیسی چبھتی ہوئی تفسیر ہے۔ ذیل کے اشعار میں ذرا تشبیہ کا لطف دیکھو۔

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا

مرے ساغر میں مئے دیکھی ہے یا خونِ ناب دیکھا ہے (۳۳)

قطرہ قطرہ ہے گل رنگ دیکھ اے زاہد

خوشنما ہے تری تسبیح کے ہر دانے سے (۳۴)

تہِ محراب ابرو ہیں بتِ مئے نوش کی آنکھیں

کہ یہ دو مسجدیں آباد ہیں اک اک شرابی سے (۳۵)

.....پھلواری شریف (پٹنہ) کی مسلم اکاڈمی کے مشاعرہ میں شریک ہوئے..... پیرومرشد کا آستانہ ہے۔ سامنے میز تھی۔ آپ غزل پڑھنے کو کھڑے ہوئے (ص ۱۷)۔ آستانہ سامنے ہے۔ عقیدت وارادت کے جذبات دل میں امنڈے چلے آتے ہیں۔ اُس غزل (کے شعر) شکستِ توبہ میں لکھ آیا ہوں :

مری توبہ ٹوٹ جائے تو مجھے معاف کرنا　　　یہ قصور مجھ سے واعظ سر ہر بہار ہوگا

اس کے بعد آپ نے یہ شعر پڑھا :

مری خاک بھی اڑے گی بہ ادب تری گلی میں

ترے آستاں سے اونچا نہ مرا غبار ہوگا (۳۶)

اور آستانہ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ پر رقت طاری ہوئی اور اسی عالم میں مقطع پڑھتے ہوئے میز پر سر ڈال دیا۔

درِ میکدہ پہ سجدہ یہ زہے نیازمندی

جسے کہتے ہیں مبارکؔ وہی بادہ خوار ہوگا (۳۷)

اس وقت مشاعرہ کا عجب عالم تھا۔ سب کے قلوب مکیف اور سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ خمریات کا ایک اور شعر سنو :

اک جام اڑا کے شیخ حرم کیا بدل گیا

آیا جو میکدہ میں وہ سانچے میں ڈھل گیا (۳۸)

جام معرفت کی تاثیر کو 'سانچے میں ڈھل گیا' سے کس پیارے انداز میں بیان کیا ہے، سبحان اللہ! اسی خمریات میں ایک مزے دار چٹکی لی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ حضرت یوں بھی ہیں مشہور مے خواروں کی ٹولی میں
کہ نام اک محتسب بھی ہے بلائے ناگہانی کا (۳۹)

محتسب پر بلائے ناگہانی کی پھبتی کس قدر چست ہے۔ خمریات میں اخلاقی رنگ دیکھئے ؎

ہر مست سمجھتا ہے ہشیار ہمیں ہیں　　　اے میکدہ والو تمہیں کیا بے خبری ہے

خمریات میں اپنے رنگ کا ایک ہی شعر ہے۔ خوب کہا ہے ؎

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے (۴۰)

مستی میں ڈوبا ہوا شعر ہے۔ مے نوشی کا یہ سماں مجھے کسی کے کلام میں نظر نہیں آیا۔ کالی گھٹا کا اٹھنا اور گہرا ہوتا جانا کس قدر دلکش سماں ہے۔ اس پر سامان یہ کہ صراحی پر صراحی بھری جارہی ہے اور مے خوار اس کو خالی کرتے جارہے ہیں۔ ایک سلسلہ ہے کہ جاری ہے۔ فارسی میں کسی کا یہ مشہور شعر :

تند و پُرشور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشان مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

ایک خاص لطف رکھتا ہے مگر اس میں یہ لطف کہاں؟ کہسار سے ابر سیاہ کا اٹھنا پہاڑ سے سیاہ ریچھ کا لڑھکنا معلوم ہوتا ہے۔

جدت : حضرت مبارک سامنے کے پامال مضمون کو اپنی خاص ترکیب بیان سے بالکل اچھوتا بنا دیتے ہیں۔

شعبدہ طور کا منسوب بہ دیدار ہوا　　　نہ کیا تم نے کلیم اس کا نظارہ نہ کیا (۴۱)
شکر کر شکر کہ اے برق خدا نے تجھ کو　　　خیر گزری دلِ بیتاب ہمارا نہ کیا (۴۲)
مجھ پہ آوازے مبارک یہ کسے جاتے ہیں　　　تم نے غیبت کی کہ نالہ پسِ دیوار کیا (۴۳)
وہ کہہ رہے ہیں تجھے صاف دل سے ہے اغماض　　　غضب ہوا مرا سینے پہ ہاتھ دھر لینا (۴۴)
کہتے ہیں کیا دیں اپنے دل کا ہم صبر و قرار　　　کوئی بے دل بے جگر... (۴۵)، (ص ۱۸)
دل کا چور آپ کو کہا لیکن　　　یہ وہ چوری ہے آبرو نہ گئی (۴۶)

ذرا دیکھنا اخلاقی مضمون کو کس جدت طرازی سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

دیکھ کہتا ہے یہ پانی کا ہوا ہو جانا　　　تو بھی یوں راہِ عمل میں ہو سبک گام ابھی (۴۷)

شوخی : آپ کے کلام میں حضرت داغ مرحوم کی طرح شوخی ہے مگر آپ کی شوخی کا انداز ہی جدا ہے۔

ساقی و بادہ و پیمانہ وخم کی سوگند — شیخ اک جام میں تو مرشد کامل ہوتا (۴۸)
کسکی تڑپ کے رات کٹی؟ اک سوال ہے — اس کا جواب زاہدِ شب زندہ دار دے (۴۹)
ملی داد یہ داستانِ وفا کی — بہت ایسے قصے سنائے گئے ہیں (۵۰)
دستار آپ کی جو ہوئی رہنِ میکدہ — تو یہ ہماری قبلۂ حاجات بھی گئی (۵۱)
شیخ صاحب کیلئے شرط ہے تنہائی بھی — رات کو پیتے ہیں، پابندیٔ اوقات بھی ہے (۵۲)

دن بھی ہے رات بھی ہے صبح بھی ہے شام بھی ہے
اتنے وقتوں میں کوئی وقتِ ملاقات بھی ہے (۵۳)

مئے طہور کو میرا اسلام اے واعظ — یہ پاک اپنے لئے پاک باز رہنے دے (۵۴)
کہہ دو انصاف سے خدا لگتی — تم ہو یا ہم وفا شعار نہیں (۵۵)
شرکتِ صحبتِ رندانِ خرابات ہوئی — کیا مدارات وہاں قبلۂ حاجات ہوئی (۵۶)

مدارات کا لفظ کیسی چبھتی ہوئی شوخی ہے۔

صوفیانہ رنگ : یوں تو آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں جس میں تصوف کا چوکھا رنگ نہ ہو اور مجاز میں حقیقت کی جھلک نظر نہ آتی ہو۔ آپ حقیقت کو مجاز میں اپنے انداز سے خوب رنگتے ہیں۔

جہاں سر جھکے گا وہی در ہے تیرا — تیرے نام کے آستانے بہت ہیں (۵۷)
چھپنا جو سو حجاب میں آتا ہے آپ کو — جاتے کہاں ہیں مجھ سے بھی پہلو سراغ کے (۵۸)
پھر لے چلی ابھار کے مجھ کو ہوائے شوق — آئے تھے ہم جہاں سے ابھی پھر وہاں چلے (۵۹)
یا دور مرا حجاب کر دے — یا اپنے کو بے نقاب کر دے (۶۰)
ہزار پردے میں دیکھا ہزار بار مگر — وہی حیا کی ادائیں وہی حجاب کا رنگ (۶۱)
ملے جو پیر مغاں سے چڑھا اسے ناصح — یہاں تمیز یہاں امتیاز رہنے دے (۶۲)
کیا کہیں کس شوخ سے آنکھیں لڑیں — ہم ہیں ایسے ویسے شاہد باز کیا (۶۳)

اخلاقی رنگ :

یہ کہتے گئے رہروانِ عدم — رہے گی کسی کی نہ ہستی رہی (۶۴)
ہائے آ نکلے کس چمن میں ہم — ہے خزاں ہی خزاں بہار نہیں (۶۵)
کرے جو راز کو افشا وہ راز دار نہیں — وہ راز دار ہے جو دل میں راز رہنے دے (۶۶)
مرحبا لیتے ہیں جو دردِ تمنا کے مزے — آفریں جس نے کہ اس درد کا چارا نہ کیا (۶۷)
گھر مبارک یہاں بن بن کے بگڑتے دیکھے — اس پہ نافہم تجھے حسرتِ تعمیر بھی ہے (۶۸)

نہ بقا غم کو مبارک نہ خوشی کو ہے ثبات — کوئی مغموم ہے کیوں اور کوئی مسرور ہے کیوں (۶۹)

پرائی آگ میں بھی ہم تو کود پڑتے ہیں — بلائیں غیر کی آتی ہیں اپنے سر لینا (۷۰)

بے ثباتی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا ہے — دل کو وابستہ نہ کر عالم اسباب کے ساتھ (۷۱)

ہو رہا ہے یہاں دن رات تماشا کیا کیا — حسرت اُس پر ہے جسے دیدۂ بینا نہ ملا (۷۲)

لطفِ زبان : اب ذرا حضرت مبارک کی زبان کا لطف اٹھاؤ اور چٹخارے لو۔ گویا داغ مرحوم بول رہے ہیں :

نام نکلا ہے وفا میں کہ جفا کاری میں — منصفی سے تمہیں فرماؤ کہ مشہور ہے کیا (۷۳)

اِسے سودا، اُسے سودا، یہ دیوانہ، وہ دیوانہ — ہوا کیا موسم گل کی جنوں انگیز ہوتی ہے (۷۴)

تازہ آزار کا ارمان کہاں جاتا ہے — پھر ستالے، ترے قربان کہاں جاتا ہے (۷۵)

الٰہی اپنی پرستش کو دوسرا دل دے — بتوں کے قبضے میں دل ہے خدا کے بندوں کا (۷۶)

اس پہ بگڑے ہیں کہ میرے روبرو — کیوں لیا بوسہ مری تصویر کا (۷۷)

تو تو زاہد مجھے کہتا ہے کہ توبہ کر لے — کیا کہوں گا جو کہے گا کوئی پیتا ہوگا (۷۸)

بدیہہ گوئی : شاعری کی طرف آپ کی طبیعت ہر وقت حاضر رہتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے خود میر کی غزل ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا'' پر غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ قلم اٹھایا اور ایک گھنٹے میں سات آٹھ شعر کی غزل لکھ کر رکھ دی۔ خوب شعر نکالے ہیں۔ اس کے بعض اشعار انتخاب میں آگے آتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ نواب سید شاہ واجد حسین صاحب خان بہادر کے فرزند مسٹر سید شاہ جعفر حسین صاحب کینٹب سے ملنے کو آئے۔ دو تین دن قیام رہا۔ ایک دن صبح ہی میرے کمرے میں آئے۔ میں نماز فجر اور اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ ان کو بھی چائے اور ناشتہ میں شریک کیا۔ یہ اپنا کلام سناتے رہے۔ یکایک ان کو خیال ہوا کہ مسٹر جعفر کہیں ناشتہ میں میرا انتظار نہ کرتے ہوں۔ دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ناشتہ اور چائے سے فارغ ہو چکے ہیں۔ فوراً انھوں نے برجستہ ایک پرچہ پر یہ دو شعر لکھ بھیجے۔

ساقیا آج صبوحی سے میں محروم رہا — مے نہ تھی کیا مری تقدیر کے پیمانے میں (۷۹)

نامبارک ہوا مجھ کو تو مبارک مرا نام — عید کا دن رمضاں ہے مجھے میخانے میں (۸۰)

جس وقت میں ان کے کلام کا انتخاب کر رہا تھا تو اس انتخاب کو دیکھ فی البدیہہ یہ شعر پڑھا :

جان غزلوں کی مبارک ''انتخاب تیر'' ہے

روح کھینچی ہے تغزل کی مرے دیوان سے

میں نے بھی اسی شعر کو اپنے انتخاب کا عنوان بنانا موزوں اور مناسب سمجھا۔ ●●●

حواشی

۱۔ یہ شعر کلیاتِ مبارک عظیم آبادی مطبوعہ کراچی (اگست ۱۹۹۹ء) میں نہیں ہے۔ اس کلیات میں صرف اردو کلام ہے۔

۲۔ یہ شعر بھی کلیاتِ مبارک میں موجود نہیں ہے۔

۳۔ کلیاتِ مبارک میں شامل ۸ اشعار کی اس غزل کا مطلع ہے :

گلے پینے وہ جن کو مشغلہ ہے سبحہ خوانی کا — لگائے دیتے ہیں یہ حکم ہم مے کی گرانی کا

لیکن نشان زدہ (*) چار اشعار اس غزل میں موجود نہیں ہیں۔ رک: کلیاتِ مبارک، ص ۳۷-۳۸۔

۴۔ یہ اشعار بھی کلیات میں نہیں ملے۔

۵۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۰۱

۶۔ کلیاتِ مبارک میں موجود نہیں۔

۷۔ کلیاتِ مبارک میں نہیں۔

۸۔ 'مرثیۂ داغ' بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۹۔ 'مرثیۂ پریشان' بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۱۰۔ یہ شعر بھی کلیات میں شامل نہیں ہے۔

۱۱۔ یہ قطعہ کلیات میں نہیں ملتا۔

۱۲۔ یہ قطعہ بھی موجود نہیں ہے۔

۱۳۔ یہ شعر بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۱۴۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۱۵۔ کلیات میں یہ شعر نہیں ہے۔

۱۶۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۰۶

۱۷۔ کلیاتِ مبارک، ص ۷۶

۱۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۷۳

۱۹۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۸۳

۲۰۔ یہ شعر کلیات میں نہیں ہے۔

۲۱۔ یہ شعر بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۲۲۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۲۰

۲۳۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۸۱

۲۴۔ یہ چاروں اشعار کلیات میں نہیں ہیں۔

۲۵۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۷۸

۲۶۔ کلیاتِ مبارک، ص ۶۴

۲۷۔ یہ شعر کلیات میں نہیں ہے۔

۲۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۵۴

۲۹۔ یہ شعر کلیات میں نہیں ہے۔

۳۰۔ یہ شعر بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۳۱۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۳۲۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۳۳۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۱۰

۳۴۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۱۸

۳۵۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۳۸

۳۶۔ کلیاتِ مبارک، ص ۴۶

۳۷۔ کلیاتِ مبارک، ص ۴۶

۳۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۷

۳۹۔ کلیاتِ مبارک، ص ۳۸

۴۰۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۲۸

۴۱۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۴۲۔ کلیاتِ مبارک، ص ۶۶

۴۳۔ کلیاتِ مبارک، ص ۵۴

۴۴۔ کلیاتِ مبارک، ص ۵۶

۴۵، ۴۶، ۴۷۔ یہ اشعار کلیات میں نہیں ہیں۔

۴۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۵۳

۴۹، ۵۰۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۵۱۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۰۱

۵۲، ۵۳۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۸۰

۵۴۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۹۹

۵۵۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۵۶۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۸۹

۵۷۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۵۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۲۹

۵۹۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۶۰۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۱۳

۶۱ تا ۶۴۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۶۵۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۴۲

۶۶، ۶۷۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۶۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۲۴۲

۶۹۔ کلیات میں نہیں ہے۔

۷۰۔ کلیاتِ مبارک، ص ۵۶

۷۱۔ کلیاتِ مبارک، ص ۱۴۶

۷۲۔ کلیاتِ مبارک، ص ۶۷

۷۳ تا ۷۶۔ کلیات میں یہ اشعار نہیں ہیں۔

۷۷۔ کلیاتِ مبارک، ص ۷۷

۷۸۔ کلیاتِ مبارک، ص ۴۷،
کلیات میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے ۔
''کیا کروں گا جو کہے گا کوئی پیتا ہوگا''

۷۹۔ یہ دونوں اشعار بھی کلیات میں نہیں ہیں۔

◉◉◉

تسلیمات

(مکتوب نگاروں کے خیالات سے ادارے کا اتفاق یا اختلاف محفوظ ہے)

✦ مشفق خواجہ۔ کراچی

آپ کا ارسال کردہ ادراک کا شمارہ ۳ موصول ہوا۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک طویل مدت کے بعد رابطے کی کوئی صورت نکالی۔ پرچے کا معیار ماشاءاللہ بہت عمدہ ہے اور معیار کیوں نہ عمدہ ہو کہ آپ کو ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہے۔

حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کا گوشہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ چند برس پہلے حکیم صاحب کراچی تشریف لائے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جیسی علم و عمل کی یکجائی ان کی ذات میں دیکھی، ویسی کم دیکھنے میں آئی ہے۔ خدا انھیں تا دیر سلامت رکھے۔

محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے بہت اچھا کیا کہ اپنے نام نظیر صدیقی مرحوم کے خطوط شایع کر دیے۔ نظیر صدیقی بہت اچھے مکتوب نگار ہیں۔ ان کے خطوط مرتب ہو کر شایع ہونے چاہیئں۔ اگر کوئی یہ کام کرے تو میں اپنے نام کے سیکڑوں خطوط دینے کو تیار ہوں۔ ۱۹/اپریل ۲۰۰۴ء

✦ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ علی گڑھ

رسالہ بہت اچھا شائع ہوا ہے کیا باعتبار مضامین اور کیا باعتبار طباعت۔ (۶/ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر نیر مسعود۔ لکھنو

ادراک شمارہ ۳ مل گیا۔ ممنون ہوں۔ آپ نے اچھی تحریریں جمع کر لیں۔ نظیر صدیقی کے خطوط کا آف پرنٹ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے مجھے بھیج دیا تھا۔ اسی سے ادرک کے چھپنے کا پتا چلا تھا۔ کچھ دن بعد شاید آپ کے لیے کوئی مضمون بھیجوں۔ فی الحال لکھنا بہت مشکل ہے۔ (۱۱/اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ باقر مہدی۔ ممبئی

ادراک نمبر ۳ پا کر حیرت ہوئی۔ کتنے عرصے بعد آپ نے پرچہ مرتب کیا۔ ایک زمانے میں مَیں ''اظہار'' کا مرتب تھا۔ وہ بھی طویل مدت کے بعد نکلتا تھا۔ محترمی رشید حسن خاں، حضرت وارث علوی، پروفیسر نیر مسعود سے مضامین حاصل کرنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے خطوط لکھنے پڑتے تھے پھر جا کر مضامین ملتے تھے۔ اشتہارات تو

ملتے ہی نہیں تھے۔ دس برس میں پانچ شمارے نکال پایا۔ تنگ آ کر پرچہ بند کرنا پڑا۔ خیر میں تو صرف ادراک کی رسید بھیج رہا ہوں۔ رائے پھر کبھی دوں گا۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے کہ پرچہ اچھا معلوم ہوتا ہے صرف بہار کے ادبا و شعرا زیادہ ہیں۔ (۳۰ر ستمبر ۲۰۰۳ء)

● آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ کیا عرض کروں گا عمر ۷۷ سال ہے۔ مسلسل بیماریوں کی آفت آئی ہوئی ہے۔ پھر بھی 'ادراک' اِدھر اُدھر سے پڑھا۔ پرچہ ہمیشہ کی طرح بلند پایہ ہے خاص کر پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مضمون۔ ہر بار تعریفی خطوط لکھنا اچھا نہیں مگر کیا کروں ایسا کوئی رسالہ نکلتا ہی نہیں۔ (یکم نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر قمر رئیس۔ دہلی

'ادراک' کا تازہ شمارہ اور آپ کا خط ملا۔ شکر گزار ہوں۔ اس سے قبل جہاں تک مجھے یاد ہے 'ادراک' کا ایک شمارہ ملا تھا اور اس کی رسید میں نے آپ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اگر نہیں ملی تو سمجھئے میرا قصور ہے یا حافظے کا فتور ہے۔

یہ شمارہ آپ نے جس محنت، سلیقہ، لگن اور ذوق و شوق سے مرتب کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ نظیر صدیقی اور پروفیسر گیان چند جین کے مکاتیب شائع کر کے آپ نے ادیبوں کی ان بے ساختہ تحریروں کی اہمیت کو جتایا ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ ادراک کا جو کردار بن رہا ہے وہ علمی اور تحقیقی ہے۔ حکیم ظل الرحمان کے بارے میں گوشہ بھی دل چسپ ہے۔ ایسی علم دوست اور روشن دماغ شخصیت اب عنقا ہوتی جارہی ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں ڈاکٹر ظفر کمالی بھی ایک بڑی خلّاق، خود آگاہ اور Versatile ادبی شخصیت لے کر ابھرے ہیں۔ ان کی تحریر جہاں بھی ملتی ہے شوق سے پڑھتا ہوں۔

جس اعلا معیار کا مجلّہ آپ نکال رہے ہیں اس کے لیے ایک خاص دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مالی اعتبار سے یہ خسارہ کا سودا ہے۔ اس پرچہ میں کوئی اشتہار بھی نہیں کہ مصارف کی کچھ بھرپائی ہو۔

آپ سے وعدہ ہے کہ احمد جمال پاشا پر خصوصی شمارہ جو آپ نکالنے جارہے ہیں اس میں لکھوں گا کہ بلکہ جمال مرحوم کے بعض دوسرے احباب مثلاً سبط اختر اور رتن سنگھ وغیرہ سے بھی لکھواؤں گا جن سے میرا رابطہ ہے۔ عابد سہیل کا مضمون تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ ادراک کے لئے ترکی چغتائی ادب پر بھی ضرور کچھ لکھوں گا۔ (۷ر نومبر ۲۰۰۳)

✦ پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال

'ادراک' شمارہ ۳ ملا، شکریہ۔ یہ شمارہ بھی حسب سابق بہت مفید ہے۔ آپ نے اچھا کیا پرانے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ خطوط کے مطالعے سے بھی مفید نتائج سامنے آتے ہیں۔ 'حکیم سید ظل الرحمٰن' کے 'گوشہ' کے ذریعہ میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب علم و ادب کی خدمت نہایت خاموشی کے ساتھ

عرصہ سے کر رہے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کی خدمات سے لوگ آگاہ ہوں تا کہ دوسروں میں بھی خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔ (۵؍نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر شمیم حنفی۔ دہلی

ادراک ۳ کے لیے شکر گزار ہوں۔ انتخاب مضامین بہت عمدہ ہے۔ فارسی زبان و ادب سے متعلق مضامین برابر شائع ہوتے رہیں تو کیا خوب۔ زیادہ تر اردو رسائل میں اس طرف توجہ کم ہے۔ دعا ہے کہ آپ نے اپنے رسالے کے لیے جو معیار مقرر کیا ہے، قائم رہے۔ میں اس سے یقیناً استفادہ کروں گا۔ (۲۶؍اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر شکیل الرحمٰن۔ گڑ گانو

ادراک کا تازہ شمارہ ابھی ابھی موصول ہوا ہے۔ شکریہ۔ پڑھنے کے بعد خط لکھوں گا۔ آنکھیں بہت کمزور ہوگئی ہیں اس لیے ایسی پرنٹنگ میں رسالے کا مطالعہ کچھ مشکل ہوتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدانخواستہ پرنٹنگ میں کوئی نقص ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ ایسا ہوتا ہی ہے۔

(۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۳)

✦ مولانا حسن عباس فطرت۔ پونے

آپ کی تحقیقاتی کاوشوں کو ملک میں سراہا جا رہا ہے۔ ادراک ۳ نصف سے زائد پڑھ چکا۔ نظیر صدیقی کے خطوط مزہ دے گئے۔ ظفر کمالی بھی بڑے کمال کے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں اور سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔

(۳۰؍ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر خلیق انجم۔ دہلی

آپ نے 'ادراک' کا تحفہ پیش کیا جس کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس سے پہلے کے دو شمارے بھی کہیں نہ کہیں سے پڑھنے کو مل گئے تھے۔ یاد نہیں کہ آپ نے بھیجے تھے یا کہیں اور سے ملے تھے۔ اس شمارے میں خوبی یہ ہے کہ آپ نے ایک اچھے رسالے کے معیار کو قائم رکھا ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے مختار الدین احمد (کے نام) اور گیان چند جین صاحب کے خطوط پڑھے۔ ان میں کئی باتیں بہت اہم ہیں۔ فارسی کے موضوع پر بھی دونوں مقالے بہت اچھے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایسے لوگوں سے لکھوائے ہیں جنھیں فارسی زبان پر قدرت حاصل ہے۔ عابدی صاحب کا مضمون 'رباعیات سحابی استر آبادی کا نسخہ علی گڑھ' بھی اہم ہے۔ اس کے جو تنقیدی مضامین ہیں، ان میں ڈاکٹر ظفر کمالی کا مضمون بھی بہت اچھا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ نے پروفیسر سید ظل الرحمن کا گوشہ بھی شائع کیا ہے۔ میں اُن کا مداح ہوں۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو میں ان پر مضمون لکھتا۔ اس شمارے کے

بارے میں کہاں تک لکھوں۔ اگر دل نکالنے بیٹھ جاؤں تو اتنی ہی بڑی کتاب بن جائے جتنا کہ 'ادراک' ہے۔ میری طرف سے اس رسالے کی کامیابی پر دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ خدا کرے اس کا معیار اسی طرح قائم رہے۔
(۲۱/اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ یوسف ناظم۔ ممبئی

آپ کا ادراک ۳ جو ۳۰۰ صفحات سے کچھ زیادہ صفحوں پر مشتمل ہے، آپ کے محبت نامے کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ نے لکھا ہے کہ رسالہ بہت تاخیر سے شائع ہوسکا جس کے لیے آپ (شاید) نادم ہیں۔ نادم ہونا آپ کے شوق کی بات ہو تو الگ بات ہے ورنہ آپ کو خوش اور خوش کے علاوہ خرم ہونا چاہئے۔ آپ نے ایسا نادر اور نہایت وقیع رسالہ شائع کر ڈالا۔ رسالہ از اول تا صفحۂ آخر کہکشاں صفت ہے۔ محترم مختار الدین احمد صاحب کے نام نظیر صدیقی کے خطوط کا باب (باب ہی کہوں گا) نہایت دلچسپ اور تقریباً تاریخ ہے۔ نظیر صدیقی صاحب کے ایک یا دو خط میرے پاس بھی ہوں گے۔ کیا معرکے کے خط لکھتے تھے۔ مختار الدین صاحب کے فٹ نوٹ نے تو ان خطوں میں گفت وشنید کی کیفیت پیدا کر دی۔ گیان چند صاحب کے خط بالعموم دفتری نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف اس شق میں کسی مکتوب نگار سے پیچھے ہیں۔ اپنا اپنا مزاج ہے اور وہ تو مزاح نگار اور مزاح گو بھی رہے ہیں۔ بس بات جب اردو۔ ہندی اور رسم الخط کی آتی ہے تو وہ گیان لفظ کی حرمت کو کیوں الوداع کہہ دیتے ہیں۔

آپ کا یہ رسالہ ہر لحاظ سے قاموس الادب کا منی شمارہ ہے۔ کیا کیا مضامین آپ نے حاصل کر لیے۔ حیدرآباد بھی موجود ہے اور بہار تو ہے ہی۔ علی گڑھ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آپ نے تو اردو کے ساتھ ایک شعبہ فارسی بھی قائم کر دیا۔ اس کے سارے مندرجات تو میں نہیں پڑھ سکا لیکن پروفیسر اولاد احمد صدیقی کا مختصر مضمون مزا دے گیا۔ فیضی کی تاریخ میں نے کبھی کہیں پڑھی تھی اس کا پس منظر پیش کر کے فاضل مقالہ نگار نے آنکھیں روشن کر دیں۔ اکبر کے دربار میں اگر فیضی تنہا بھی ہوتے تو نو کے نورتنوں کے فرائض تنہا ادا کر دیتے (گانا شاید نہ گا سکتے)۔

ڈاکٹر زور کے متعلق معلومات شایع کر کے آپ نے دکھنیات کا حق ادا کر دیا اور ڈاکٹر ظفر کمالی نے نثر و نظم دونوں کی لاج رکھ لی۔ تحقیق کے تو خیر وہ آدمی ہیں ہی لیکن نظم گوئی میں بھی نشتریت مسلم ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اکبر الہ آبادی بھی پیدائشی عظیم آبادی تھے۔ رضا نقوی واہی نے نظمیہ مزاح گوئی میں اپنا جواب پیدا نہیں ہونے دیا۔ لیکن ظفر کمالی اسی راہ پر چل پڑے ہیں۔ میں کوئی موازنہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن بہار کی سرزمین مزاح کے لیے کافی زرخیز رہی ہے خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ ہر دو پودے وہاں شجر سایہ دار بنے ہیں۔ ظفر کمالی ذرا تاخیر سے اِدھر متوجہ ہوئے ہیں۔ مزاح میں تاخیر ہمیشہ باعث برکت ثابت ہوئی ہے۔ یہ پختگی اور فرزانگی کی علامت ہے۔ اپنے اس شعور کو وہ اپنا شعار بنالیں تو اچھے مزاح گو شاعروں میں ان کا شمار ہونا اُن کا مقدر ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر میں اور بھی بہت کچھ لکھ سکتا

ہوں۔ لیکن ان سے متعلق پتا نہیں میرے دل میں یہ شبہ کیوں سر اُٹھاتا ہے کہ اُن میں 'دل جمعی' آتی جاتی رتوں کی طرح کی کوئی چیز ہے۔ آپ نے اپنے رسالے میں پورے برصغیر کو مقید کرلیا ہے۔ (۷/اکتوبر۲۰۰۳ء)

✦ مجتبیٰ حسین۔ دہلی

برادرِ عزیز ظفر کمالی نے پچھلے مہینے عزیزی اظہار احمد ندیم کے ذریعہ ادراک کا جو شمارہ ۳ روانہ کیا تھا، وہ مجھے مل گیا۔ مکروہاتِ زندگی نے مہلت نہ دی کہ آپ کو بر وقت جواب دیتا۔ اس شمارے کو پاکر واقعی جی خوش ہوگیا۔ یہ سچ مچ ایک مکمل اور بھرپور رسالہ ہے۔ میری دلی مبارک باد قبول کیجئے۔

نظیر صدیقی اور گیان چند جین کے مکتوبات بہت دھیان سے پڑھے۔ نظیر صدیقی کے خطوط پڑھ کر ادب سے ان کے والہانہ اور بے لوث سروکار کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ میرے کرم فرما تھے۔ ۱۹۸۶ء میں جب وہ دہلی آئے تھے تو مجھ جیسے کم سواد سے ملنے کے لئے بطور خاص میرے دفتر آئے تھے۔ ادب ان کے لیے جنون کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔

اس شمارے کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کلاسیکی ادب کے ساتھ دکنی ادب کے بھی نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور دکنی ادب کے خط و خال واضح کرتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر شریف حسین قاسمی کے مضامین پسند آئے۔ ظفر کمالی کمال کے آدمی ہیں۔ ادب کے ہر شعبے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ میں ان کی طنزیہ شاعری کا قائل اور قتیل ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اس طرف زیادہ توجہ دیں۔ رضا نقوی واہی کے انتقال کے بعد سے ہندوستان میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے میدان میں سناٹا ہے۔ بھونڈے لطیفوں کو شعر کے قالب میں ڈھال کر ہمارے بیشتر مزاحیہ شعرا داد وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے سامنے مشاعرے ہوتے ہیں۔ جہاں اچھل کود اور زبان کی بھونڈی تحریف کے ذریعہ داد حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظفر کمالی میں وہ کس بل ہے اور چابکدستی ہے جو ایک اچھے طنزیہ شاعر کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ آپ کی بھی ساری ہی تحریریں پسند آئیں خاص طور پر 'شادؔ عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری' اور 'چین میں اُردو'۔ حسین الحق کی کہانی 'فساد رُک گیا' بہت پسند آئی۔ سچ پوچھئے تو ہمارے ہاں فساد رکنے کا نام نہیں لیتا۔ شکلیں بدل کر جاری رہتا ہے۔ حسین الحق نے اس کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ (۹/اکتوبر۲۰۰۳ء)

✦ جسٹس آفتاب عالم۔ پٹنہ

رسالہ دیکھ کر خوشی کے ساتھ حیرانی بھی ہوئی کہ آپ گوپال پور، سیوان سے اس حسن و خوبی کے ساتھ رسالہ شائع کررہے ہیں۔ ادراک معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے آراستہ پیراستہ نظر آتا ہے۔ آپ کی کاوش قابلِ تعریف ہے۔
ایک بار پھر آپ کا شکریہ اور پرچہ نکالنے کے لیے آپ کو مبارک باد۔ آپ کی کوششوں پر یہی کہہ سکتے

ہیں کہ ؎

حلقہ کیے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو   کچھ روشنی باقی تو ہے، ہر چند کہ کم ہے

(ب ت)

✦ سید لطیف حسین ادیب۔ بریلی

آپ کا ارسال کردہ ادراک شمارہ نمبر ۳ موصول ہوا۔ اس شمارے کے مضامین میں کافی تنوع ہے۔ ہر مضمون معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ میں ڈاکٹر رضوان اللہ آروی صاحب کا مضمون 'فارسی شاعری - انقلاب اسلامی سے آج تک' پڑھ کر محظوظ ہوا۔ اگر نامناسب نہ ہو تو جدید فارسی ادب پر دو ایک مضامین ہر شمارے میں شائع کرتے رہیں۔ 'خصوصی مطالعہ' کے ضمن میں حکیم سید ظل الرحمٰن پر مضامین کی پیش کش قابل قدر ہے۔ آپ اس سلسلے کو بھی دراز کریں۔ بہار کے علمی و ادبی ذخیرے کی بازیافت بھی ضروری ہے۔ بہار کے علمی خاندانوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں محفوظ فارسی، عربی اور اردو کے نسخہ ہائے خطی کے تعارف کے لیے ادراک میں ایک گوشہ قائم کر دیجیے۔ اس کار خیر سے محققین کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ (۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ مظہر امام۔ دہلی

ادراک کا تیسرا شمارہ مجھے بر وقت مل گیا تھا۔ تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا تھا کہ آنکھ کے آپریشن کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ مجتبیٰ حسین صاحب نے آپ کے خط کا ذکر کیا۔ تفصیلی خط لکھنے کا انتظار کروں گا تو اور تاخیر ہو جائے گی۔ اسے ادراک کی رسید کے طور پر قبول فرمایئے۔ رسالہ اچھا ہی نہیں، بہت اچھا ہے۔ اس کی تحقیقی اور علمی جہت بطور خاص متوجہ کرتی ہے اور اسے دوسرے عام ادبی رسالوں سے ممیز کرتی ہے۔ کئی مقالات اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے استفادہ کروں گا۔

کاش! ادراک کی اشاعت میں اتنی تاخیر نہ ہوا کرے۔ میں آپ کی ذاتی دشواریوں اور وسائل کی کمی کا اندازہ کرتا ہوں اور آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ (۴/ نومبر ۲۰۰۳ء)

● 'ادراک' کی علمی اور تحقیقی جہت اب مستحکم ہوگئی ہے۔ شمارہ ۳ بلا شبہ پہلے دو شماروں سے کافی آگے ہے۔ جب ایک ہی شمارے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی، نثار احمد فاروقی، جگن ناتھ آزاد، یوسف ناظم، باقر مہدی، فضا ابن فیضی، کاوش بدری، نادم بلخی، حسین الحق، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر ظفر کمالی، پروفیسر وارث کرمانی، اولاد احمد صدیقی، پروفیسر محمد علی اثر، ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، سید حسن عباس جیسے مستند، معتبر اور معروف ادبا و شعرا موجود ہوں تو اس کے معیار کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی، احمد جمال پاشا اور جذب گوپال پوری کی اہم نگارشات ہمارے لیے گراں قدر تحفے ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے نظیر صدیقی کے خطوط کو بڑے سلیقے سے قیمتی حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس طرح کا کام وہی کر سکتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے بہت سارے خطوط میرے پاس بھی محفوظ ہیں۔ ان سے میرے دوستانہ مراسم ڈھاکہ میں ۱۹۵۸ء میں قائم ہوئے تھے اور تا عمر برقرار رہے۔ انتقال سے ساڑھے چار ماہ پہلے وہ دہلی میں میرے یہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کا آخری خط ان کی وفات سے دو ماہ پہلے آیا تھا۔ میرے نام آئے ہوئے مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط کا مجموعہ 'نصف ملاقات' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ دوسرے بہت سے اہم خطوط بھی زیر ترتیب ہیں۔

'ادراک' کے تازہ شمارے کے مشمولات پر الگ الگ اظہار خیال کرنے کا یہ موقع نہیں، البتہ آپ کے مضمون 'شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری' کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا۔ اس سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے شاد کی عمر کے آخری ۲۵-۳۰ سال مرثیہ گوئی میں گزرے۔ ان کی تمام مشہور غزلیں پچاس پچپن سال کی عمر تک کہی جا چکی تھیں۔ 'مثنوی قطب مشتری' کے تنقیدی مطالعے بہت سے ہوئے ہیں، ایسے ہی ایک 'مطالعہ' کا تنقیدی محاکمہ ڈاکٹر ظفر کمالی نے خوبی سے کیا ہے۔ فہیم جوگاپوری پر بھی ان کا تعارفی مضمون عمدہ ہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے ۲۰۰۰ء میں وفات پانے والے اہل قلم کا تعارف اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ کرایا ہے۔

میں 'ادراک' کی درازی عمر کا خواہاں ہوں۔ (۶ ردسمبر ۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ مدیر کوہسار جرنل، بھاگلپور

ایک اور بے حد معیاری شمارے پر مبارک باد قبول کریں۔ سبھی مضامین انکشافی ہیں جن سے بار بار استفادہ کیا جائے گا۔ ایسے مضامین ہی 'ادراک' کی پہچان ہیں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور داد دے رہا ہوں کہ اس طرح کے مواد کے لیے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ میری تین کتابوں پر تبصرے کے لئے ممنون ہوں۔ (۲۲ راکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس۔ حیدر آباد

ادراک ۳ موصول ہوا۔ پرچہ آپ کی محنت اور حسن ترتیب کا آئینہ دار ہے۔ ٹائٹل کا رنگ دلکش اور گٹ اَپ شاندار ہے۔

سرورق پر رسالے کا نام شاید بہت اوپر چلا گیا ہے بقدر پاؤ انچ نیچے اتاریے۔ معنوی اعتبار سے بھی مجلہ بہت وقیع اور بلند پایہ ہے۔ منظومات اور غزلیات خوب ہیں۔ نظیر صدیقی کے مکاتیب نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مقالہ 'امیر خسرو کی مثنوی نگاری' بہت مختصر ہے۔ شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری پر آپ کا مقالہ بہت جاندار ہے۔ 'یاد رفتگاں' کا گوشہ بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ میری

جانب سے ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کو مبارکباد۔ 'کتاب شناسی' کے موضوعات بھی تحقیقی ژرف نگاہی پر دال ہیں۔ مصنفین تحسین کے سزاوار ہیں۔ (۱۱ر ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر عبدالواسع۔ مظفر پور

رسالہ ادراک ملا۔ ایک سرسری نظر ڈالی اور محسوس ہوا کہ یہ بہت کارآمد اور معلوماتی رسالہ ہے۔ نظیر صدیقی اور گیان چند کے خطوط کے مطالعے سے بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھتا معلوم ہوا۔ اس کے ماسوا ان بزرگوں کی شخصیت کے بہت سے پہلو بھی سامنے آئے۔ واقعی خطوط انسان کو عریاں کر دیتے ہیں اگر وہ اشاعت کی غرض سے نہ لکھے گئے ہوں۔ آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں اور ادراک کے لیے بھی۔ خدا اسے موسم کے سرد و گرم سے محفوظ رکھے اور چمن اردو کی آبیاری کے لیے زندہ رکھے، آمین! (۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر امام اعظم۔ دربھنگہ

عرصہ دراز کے بعد آپ کا ضخیم ادبی جریدہ 'ادراک' موصول ہوا، شکریہ۔ رسالہ معیاری ہے اور اس کی تزئین و ترتیب بھی سلیقے سے کی گئی ہے۔ مواد کے اعتبار سے بھی بھرپور ہے۔ یہ ادبی رسالہ سے زیادہ تحقیقی جرنل ہے۔ اس رسالے میں سب سے پہلے میں نے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب کے نام پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم کے خطوط پڑھے۔ بڑے دل چسپ اور معلوماتی خط ہیں۔ اس پر آرزو صاحب کا حاشیہ کافی معلوماتی ہے۔ میرا بھی ایک دو جگہ ذکر ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی صاحب کے تقریباً ۵۰ خط میری فائل میں ہیں جو میں 'تمثیل نو' میں قسطوں میں شائع کر رہا ہوں۔ بعد میں کتابی صورت میں لاؤں گا۔ آپ نے بڑے سلیقے سے یہ خط شائع کیے ہیں۔ طبیعت خوش ہوگئی۔

(۴ر نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ سرسوتی سرن کیف۔ بھوپال

ادراک نمبر ۳ کا نسخہ نظر نواز ہوا۔ رسالہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ نظیر صدیقی اور گیان چند کے خطوط بہت اہم ہیں۔ دیگر مضامین بھی بصیرت افروز ہیں۔ 'دکنی ادب کے فروغ میں ڈاکٹر زور کا حصہ'، 'شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری' اور 'مضامین اکبرالہ آبادی' سے بہت محظوظ ہوا۔ تحقیقی نوعیت کے مقالے بھی خوب ہیں۔ حصۂ نظم میں ہر قسم کی نظمیں موجود ہیں اور افراط سے موجود ہیں۔ غرض ہر طور پر بہت ہی قابل قدر رسالہ ہے۔ خدا کرے اسے عمر دوام نصیب ہو۔ (۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ اظہار خضر۔ پٹنہ

برادرم مظفر کمالی صاحب کے توسط سے ادراک ۳ ملا۔ اندازہ ہوا کہ اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔ یہ شمارہ

آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں پر دال ہے۔

✦ کاوش بدری۔آمبور

۲۵؍ستمبر کو ادراک ۳ وحی غیر متلو کی طرح ناچیز پر نازل ہوا۔ روحانی سامان فراہم ہوا۔ جتنی اپنائیت اس جریدے میں محسوس ہوئی اتنی شاید ہی کسی اور ... ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور مختار احمد عاصی کے حمدیہ اشعار بارگاہ الٰہی میں پھول بن کر بچھ گئے ہیں۔ علی احمد منظر کی نعت بہت خوب ہے خاص کر یہ شعر ؎

وسعت تاب نظر اپنی بہت محدود ہے ورنہ ہم نور نبی امت کے اندر دیکھتے

اختر نقوی چھپروی کا قصیدہ در مدح پنجتن کا ہر لفظ آب کوثر سے دھلا ہوا ہے۔ نظیر صدیقی کے خطوط بنام مختار الدین احمد سے پہلے تمہید بڑی عرق ریزی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ نظیر صدیقی کے خطوط کے حواشی میں مختار الدین صاحب نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر بڑے معنی خیز نکات بیان کئے ہیں۔ پروفیسر گیان چند کے خطوط میں وہ گہرائی نہیں جو نظیر صدیقی کے خطوط میں ہے۔ شاید میری نظر میں اتنی گہرائی نہیں کہ میں ان خطوط کا محاسبہ کرسکوں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مقالہ 'امیر خسرو کی مثنوی نگاری' تشنہ لگا۔ کاش ہر مثنوی کا تعارف اور کھل کر فرماتے تو انسب تھا۔

ادراک میں جو فارسی غزلیں شامل کریں ان کے اردو تراجم بھی شامل کر کے احسان عظیم فرمائیں۔ ادراک ۳ کا غائر مطالعہ ہنوز جاری ہے۔ اس کے مشمولات پر سیر حاصل تبصرے کے لیے وقت درکار ہے چونکہ ہر مقالہ پُر مغز، فکر انگیز اور محققانہ ہے۔ (یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ ششی ٹنڈن۔آگرہ

ناچیز نے ادراک ۳ کا معتدبہ حصہ پڑھ لیا۔ مشاہیر کے خطوط جہاں ان کی نجی زندگی کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں وہیں ان کی فکر ونظر، علم وعرفان، آرام ومصائب، آسودگی وزبوں حالی اور تاثرات وتعصبات سے آگہی حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ خطوط مشاہیر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی ادبی حیثیت ہوتی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی اور پروفیسر گیان چند جین کے مکاتیب بھی اسی زمرے میں رکھے جانے چاہئے۔ آپ نے اچھا کیا کہ انھیں شائع کردیا۔ فارسی شاعری سے متعلق ڈاکٹر رضوان اللہ آروی کا مضمون وقیع پُر از معلومات ہے۔ طرز تحریر بھی شگفتہ ہے۔ یوسف ناظم صاحب کا مضمون بھی اُن کے بیشتر مضامین کی طرح دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ طنز و مزاح اور ظرافت ہر کس وناکس کا حصہ نہیں ہوتا۔ قسام ازل سے یوسف ناظم صاحب کو بہت کچھ ملا ہے اور اس میں وہ اصحاب ذوق ودل کو اپنا شریک وسہیم بنارہے ہیں یہ کیا کم بات ہے۔ غزلیات کا بیشتر حصہ اساتذہ اور ممتاز شعرا کے کلام پر مشتمل ہے۔ جناب ظفر کمالی کی نظم بھی خوب ہے۔ نظم پڑھ کر دلاور فگار کی یاد تازہ ہوگئی۔ ڈاکٹر ظفر کمالی یقیناً داد

ستائش کے مستحق و سزاوار ہیں کہ انھوں نے ایک سنجیدہ، حساس، متین اور باصلاحیت سخنور فہیم جوگاپوری کی شخصیت و شاعری سے قارئین کو متعارف کرایا۔ فہیم جوگاپوری کی شاعری روایت و جدیدیت کا امتزاج ہے۔ فکر میں متانت و ذکاوت اور طرز تکلم میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انتخاب میں شامل تقریباً بھی شعر متاثر کرتے ہیں اسے حسنِ کلام کہیے یا حسنِ انتخاب۔ بہر حال شاعر اور مرتب، دونوں ہی ستائش کے حقدار ہیں۔

ادراک صوری و معنوی حسن سے مزین جریدہ ہے جس کی جاذبیت کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں۔ جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے ادراک جیسے خالص ادبی جریدہ کی اشاعت و ادارت کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ کوہ کنی جیسے کارِ گراں سے کم نہیں۔ (۱۹ر ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ فاروق راہب۔ موتی ہاری

ادراک کا شمارہ ۳ باصرہ نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی گوناگوں خصوصیات سے بھرا ہوا ہے۔ ادب کے کئی ایسے گوشے یا کئی ایسے چہرے جن کی تابنا کی ماند ہوتی جا رہی تھی، آپ انھیں پھر سے جلا بخش رہے ہیں۔ یقیناً آپ کی یہ کوشش ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔ فارسی سے بے توجہی نے ہمیں اپنے اصل اثاثہ سے محروم کر دیا ہے۔ اردو ادب کا بیشتر حصہ سیدھے فارسی سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم و جدید کے بیچ کا جو پل ٹوٹ گیا تھا، ادراک کی شکل میں آپ نے پھر کھڑا کر دیا ہے۔ خدا کرے آپ کا یہ حسین و جمیل سفر، رکاوٹ کے ہر بریکر کو توڑتا، نیست و نابود کرتا، اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔ آمین! (۲۷ر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

✦ محمد احرار ہندی۔ دھنباد

اچھے اور وقیع مضامین پر مشتمل یہ گلدستہ بہت خوش رنگ اور خوشبودار ہے۔ نظیر صدیقی کے خطوط جناب مختار الدین احمد کے نام، یادِ رفتگاں، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کا مضمون اور آپ کے تحقیقی مضامین پسند آئے۔ بہت سی چیزیں ابھی دیکھنا باقی ہیں۔ جناب ظفر کمالی واقعی کمال کر رہے ہیں۔ جلد ہی وہ اپنا مقام بنالیں گے۔ اگلے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم کے خطوط پروفیسر نذیر احمد کے نام، میرے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ شاید ان خطوط میں میرے لیے کوئی گوہرِ آبدار بھی ہو۔

اس بار کا شمارہ کافی ضخیم ہے... کاش! ادراک مالی حیثیت سے مضبوط ہوتا۔ میرزا عبد العطوف سنجر تہرانی خوش نویس بھی تھے۔ خوش نویسوں کے زمرے میں احترام الدین شاغل نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان پر آپ کی کتاب کا اشتہار ادراک میں دیکھا۔ میرے لیے معلوماتی چیز ہوگی۔ اس کتاب کو پڑھنا چاہوں گا۔ (۲۸ر ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ اسد ثنائی، مدیر الانصار۔ حیدرآباد

محترم نادم بلخی کے توسط سے ادراک شمارہ ۳ موصول ہوا۔ جیسے جیسے مطالعہ آگے بڑھا اس خوبصورت

رسالے کو میں نے اپنا ہم مزاج پایا۔ محترم! اس پُر آشوب دَور میں اُردو میں پرچہ نکالنا کسی جہاد سے کم نہیں۔ ایسے میں آپ نے خالص تحقیقی پرچہ نکال کر بڑا کرم کیا ہے۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار تحسین کے مستحق ہیں اور میں آپ سب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تخلیقات کا انتخاب آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ یقین ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ (۱۰ ستمبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر حنیف نقوی۔ بنارس

ادراک کا شمارہ ۳ موصول ہوا۔ اتنی مختلف النوع تحریریں اور سب کی سب معیاری، معلومات افزا اور دلچسپ۔ ان کا جمع کرنا اور سلیقے کے ساتھ شائع کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ تنہا یہ سب کام کیسے کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کا حوصلہ اسی طرح برقرار رہا اور حالات بھی آپ کا ساتھ دیتے رہے تو امید ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد اردو کے اہم ترین جرائد میں شمار ہونے لگے گا۔ (۱۲/نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ جموں

ادراک نمبر ۳ موصول ہو چکا ہے اور میں اس کے اکثر مندرجات سے محظوظ اور مستفید ہو چکا ہوں۔ یہ شمارہ بھی اول سے آخر تک پسند آیا۔ نظیر صدیقی کے خطوط اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہیں۔ میری بھی نظیر صدیقی کے ساتھ پرانی ملاقات تھی جو مدت تک جاری رہی۔ کراچی کی متعدد ملاقاتوں کے علاوہ ایک ملاقات اور خاصی مفصل ملاقات علی گڑھ میں بھی ہوئی۔ رات کو ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ مجھے وہ جوش صاحب کے نئے لطیفے سناتے رہے۔ اُن کے خطوط کے ذریعے اور بھی کتنے دوستوں کے نام سامنے آئے اور کتنی ہی پرانی یادیں تازہ ہوئیں اور کئی بار آنکھیں نم ہوئیں۔ اپنا یہ شعر بھی بہت یاد آیا ؎

کہاں ہو کارواں والو! کہاں ہو　　　تلاشِ کارواں ہے اور میں ہوں

کامل بہزادی کی کتاب 'تلوک چند محروم ایک مطالعہ' پر تبصرہ پسند آیا۔ جزاک اللہ۔ (۹/دسمبر ۲۰۰۳ء)

✦ ضیاء الدین اصلاحی، مدیر معارف۔ اعظم گڑھ

آپ کا رسالہ 'ادراک' (تیسرا شمارہ) مجھے بہت پہلے ملا تھا.... رسالہ تو آپ نے بہت متنوع، جامع، پُر مغز، عالمانہ اور اچھا نکالا ہے۔ اس کی داد و تحسین جتنی بھی آپ کو دی جائے کم ہے۔ اردو فارسی ادب سے متعلق قابل قدر مضامین، مکتوب اور کتاب شناسی وغیرہ عنوان کے تحت آپ نے بہت ہی قیمتی اور کم یاب چیزیں جمع کر دی ہیں پھر طنز و مزاح، افسانے، منظومات اور غزلیات، قند پارسی وغیرہ کیا کہنا۔ غرض ہر ذوق اور مذاق کے لوگوں کے لیے آپ نے نہایت اچھا سامان 'ادراک' میں جمع کر دیا ہے۔

بہر حال ادراک کا یہ تیسرا شمارہ ہر لحاظ سے پسند آیا۔ آپ کی صلاحیتوں اور اچھے علمی و ادبی ذوق کا میں بہت پہلے سے معترف ہوں۔ اب یہ رسالہ نکال کر اور بھی اپنا گرویدہ اور مداح بنالیا ہے، اللھم زد فزد۔ 'معارف' میں اس کا تعارف بھی کرایا جائے گا۔ (۲۵/دسمبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر سید احسان الرحمٰن، جے این یو۔ نئی دہلی

ادراک کا شمارہ (۳) ملا، شکریہ۔ نہایت ہی سلیقہ سے سجایا یہ شمارہ اپنے مقصد پر پورا اترتا ہے۔
(۲۴/نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ مولانا ہلال احمد قادری۔ پھلواری شریف

ادراک کا تازہ شمارہ ملا۔ ماشا اللہ یہ شمارہ بھی عمدہ اور مفید مضامین سے آراستہ ہے۔ ترتیب و تزئین میں آپ کی حسنِ ادارت جلوہ فگن ہے۔ 'کلام آزاد (بلگرامی)' سے محظوظ ہوا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ مشاہیر ادیبوں کے خطوط کا سلسلہ اہل ذوق کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مرسِل اور مرسَل الیہ، دونوں ہی کے متعلق نئے گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی کا مقالہ اچھا ہے۔ انھوں نے خاصی محنت سے مرتب کیا ہے اگرچہ ان کے بعض افکار سے اختلاف ممکن ہے۔ شاؔد کے رثائی ادب پر آپ کا مقالہ فکر انگیز اور تحقیقی ہے۔ 'گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے' اچھا لگا۔ یہ مستقل کالم ہونا چاہیے۔ مگر لکھنے والوں کو وفات یافتگان کے ذکر میں توازن رکھنا ہوگا۔ اس مضمون میں شاعروں اور ادیبوں کے بیچ ایک مولوی، مفتی شریف الحق مرحوم کا ذکر کچھ عجیب لگا۔

ڈاکٹر ظفر کمالی کی نظم خوب ہے۔ وہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کا مزاح اور طنز دونوں کامیاب ہے۔ مبتذل الفاظ کو بھی نبھا دیا ہے۔

کتابوں پر تبصرے آپ کے قلم سے ہیں اس لیے متوازن ہیں۔ اداریے میں آپ کی ہدایت کہ ادراک کو قارئین ناقدانہ نگاہوں سے دیکھ کر رائے دیں، آپ کی حقیقت پسندی اور وسعت نظری ہے مگر باوجود ناقدانہ نگاہی کے کوئی ایسی قابل ذکر خامی ادراک میں نظر نہیں آئی۔ پرچہ ہر اعتبار سے صاف ستھرا اور معیاری ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ (۱۶/رمضان ۱۴۲۴ھ - ۱۲/نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ پروفیسر رضاء اللہ انصاری۔ علی گڑھ

آپ کا مشہور ادراک (۳) ملا۔ آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ ایک بے مثال اور بے نظیر اردو میگزین کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور سے میں اس کی جامعیت سے بہت متاثر ہوں۔ لیکن پھر بھی یہ درخواست کروں گا کہ علمی اور تحقیقی مضامین پر اور زور دیا جائے۔ غزلیات کے لیے تو سیکڑوں رسالے ہیں۔ لیکن چند منتخب غزلوں پر اکتفا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جس طرح آپ نے حکیم ظل الرحمٰن صاحب کی اکادمی زندگی پر مضمون شائع کیا ہے اسی

طرح کے اور بھی مضمون چھپنے چاہئیں۔ (۲۲/نومبر۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔حاجی پور

ادراک کا تازہ شمارہ (۳) موصول ہوا۔ یہ شمارہ گزشتہ اور سابقہ شماروں سے بہتر اور وقیع تر ہے۔نظیر صدیقی اور گیان چند کے خطوط دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔پروفیسر مختار الدین احمد نے مکاتیب سے قبل جو تمہید لکھی ہے وہ نہایت گراں قدر اور قابل مطالعہ ہے۔ڈاکٹر رضوان اللہ کا مقالہ 'فارسی شاعری- اسلامی انقلاب سے آج تک' بہت مفید معلومات سے پُر ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی کا مضمون جو 'قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ' نام کی کتاب سے متعلق ہے، محنت سے لکھا گیا ہے۔ پروفیسر سید ظل الرحمٰن کا 'خصوصی مطالعہ' پسند آیا۔فارسی کی دس غزلیں، تین شاعروں کی شائع کرکے آپ نے ایک نئی اور جرأت مندانہ روایت کا آغاز کیا ہے۔اردو غزلوں کی بھرمار نہ کیجئے۔آپ کا رسالہ وقیع مقالات اور فکر انگیز تحریرات سے آراستہ ہوتا ہے۔چودہ کتابوں پر تبصرے معلومات افزا اور عمدہ ہیں۔'خطوط' کا حصہ بھی کم دلچسپ نہیں۔بعض خط مثلاً پروفیسر فاروق احمد صدیقی صاحب کے خط کے آخری دو تین جملے تو بہت خوب ہیں۔ طنز کے جملوں سے قاری بھی محظوظ ہوتا ہے۔ (۱۴/نومبر۲۰۰۳ء)

✦ عرش صہبائی۔جموں

'ادراک' کا تیسرا شمارہ نظر نواز ہوا۔جناب نظیر صدیقی اور جناب گیان چند جین صاحب کے خطوط خاص توجہ کے مستحق ہیں۔تمام تخلیقات معیاری ہیں۔اس سے آپ کے صاف ستھرے ادبی مذاق کا احساس ہوتا ہے۔جناب ظفر کمالی صاحب کی نظم 'ادب اور سی بی آئی' کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔اس میں طنز و مزاح ہی نہیں شعریت بھی ہے۔آج کل کی شاعری سے یہ عنقا ہوتی جارہی ہے۔ادراک کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔سرورق الگ سے داد طلب ہے۔ (۱۰/نومبر۲۰۰۳ء)

✦ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی۔علی گڑھ

ادراک ۳ نظر نواز ہوا۔حلقۂ احباب میں رسالے کو متعارف کرانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔بعض نے اپنی دلچسپی کی چیزیں پڑھ کر اور اکثر حضرات نے پورے رسالے کی ورق گردانی کے بعد پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔میری طرف سے اور علی گڑھ کے ادب نوازوں کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ (۱۶/دسمبر۲۰۰۳ء)

✦ عارف ہندی۔بنارس

'ادراک' کے معیار اور مزاج کا میں شروع سے ہی قائل ہوں۔تیسرا شمارہ نظر نواز ہو چکا ہے۔
(۱۲/نومبر۲۰۰۳ء)

✦ فرخ شاہد۔ بنارس

'ادراک' کے دوشمارے بذریعہ عارف ہندی نظرنواز ہوئے۔ پروفیسر نظیر صدیقی اور گیان چند جین کے خطوط خاصے دلچسپ ہیں۔ اگر آپ قاضی عبدالودود کے خطوط بھی کسی سے حاصل کر کے شائع کرسکیں تو بہتر ہوگا۔ حصۂ منظومات کے انتخاب میں مزید سختی کی ضرورت ہے۔ (۱۲/نومبر ۲۰۰۳ء)

✦ صابر علی سیوانی۔ پٹنہ

آپ کا مجلّہ ادراک (۳) پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ سیوان ضلع سے اپنی نوعیت کا واحد رسالہ آپ نکالنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ مشمولات کافی وقیع ہیں۔ فارسی زبان کے تعلق سے متعدد مضامین فارسی داں حضرات کی تشنگی بجھانے میں معاون ہوں گے۔ ہندستان میں شاید یہ پہلا رسالہ ہے جو اُردو زبان میں فارسی زبان وادب سے متعلق اتنی ساری معلومات بہم پہنچانے کی خوبصورت کوشش کر رہا ہے۔ خدا رسالے کی عمر دراز کرے۔ (۷/دسمبر ۲۰۰۳ء)

✦ شارق عدیل مارہرہ۔ ایٹہ

'ادراک' اردو کا ایک ایسا رسالہ ہے جس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس کے ہر شمارے میں نئے لکھنے والوں کی معلومات میں اضافے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ 'ادراک' قدیم وجدید کے درمیان ایک پل ہے۔ اس کا زندہ رہنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے کسی بھی طرح سانسیں مہیا کرتے رہیے۔ ادب کے تئیں یہ آپ کی سچی خدمت ہوگی جو تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گی۔ (ب ت)

✦ عبدالقادر ہاشمی۔ تہران (ایران)

'ادراک ۲' موصول ہوا البتہ بہت تاخیر سے۔ رسالہ بہت پسند آیا۔ آپ کی لگن اور محنت سے یہی توقع تھی اور امید ہے کہ ہر آئندہ شمارہ بہتر ہوگا۔ فہرست مطالب سے ہی اس رسالے کے تنوع کا پتا چل جاتا ہے۔ اس دور میں تنوع اور گونا گونی کی شدید ضرورت بھی ہے۔ میں نے اکثر مطالب پر نظر ڈالی اور بعض کا بہ غور مطالعہ کیا۔ کمپوزنگ کی غلطیاں بہت کم نظر آئیں۔ ڈاکٹر ولی الحق انصاری صاحب کی نظم ''دعوت انبہ'' پڑھ کر آم کا مزہ آ گیا۔ غالب کی یاد بھی آئی۔ تہران میں آم کی اقسام سے تو محروم ہیں لیکن اب کافی مقدار میں مل جاتے ہیں اور کسی حد تک تشنگی کو رفع کر دیتے ہیں۔ اس نظم (ص ۹۵) کے تیرہویں شعر کا آخری لفظ 'دام' چھپ گیا ہے جو یقیناً 'وام' رہا ہوگا۔ جی ہاں! تمام دقتوں اور توجہات کے باوجود ایسا ہو جاتا ہے اور حضرات کاتب یا موجودہ دور کے حروف چیں ایسی غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ کتابوں پر تبصروں کا حصہ 'پیمانے' پسند آیا۔ آپ کے بے لاگ تبصرے قابل ستائش ہیں۔ افسانے بھی اچھے ہیں مگر فاروق راہب صاحب کے افسانے کا عنوان 'شکستیدہ' اپنی فہم ناقص سے بالا ہے؟

خدا آپ کو اس علمی- ادبی کام میں روز افزوں کامیابیاں عطا کرے اور آپ کا رسالہ درک و ادراک بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

✦ نقی احمد ارشاد۔ پٹنہ

'ادراک ۳' میں آپ کا بہترین مقالہ 'شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری' پر شایع ہوا ہے مگر دو باتیں قابل اصلاح ہیں۔ ۱۔شاد کا مرثیہ جو سنگی دالان والوں نے شایع کیا تھا ۱۹۲۳ء، وہ مرثیہ ہے: اے طبع خسروانِ سخن سے خراج لے / دراحوال جناب عباس، دوبارہ جلد اول مراثی شاد اور سہ بارہ مراثی شاد مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی میں موجود ہے۔ اصل مرثیہ مطبوعہ حسنین نقوی سلمہٗ کے پاس ہے جو محمود علی خاں سے ملا تھا۔ ۲۔ رائے بھوانی پرشاد آزاد یادگار خاندان رام نراین موزوں کا سالِ وفات ۱۹۲۸ء ہے۔ ذاتی مکان کالی استھان میں۔ آپ کے مضمون میں ۱۹۳۵ء غلط ہے۔ (۱۹/فروری ۲۰۰۴ء)

✦ ڈاکٹر شفقت اعظمی۔ نئی دہلی۔

ادراک انتہائی وقیع، معیاری اور معلومات آفریں مجلّہ ہے اور سب سے بڑی اور طمانیت کی بات یہ ہے کہ اردو اور فارسی کے چاند تارے آپ کے ہم سفر ہیں۔ خدا آپ کے ساتھ ساتھ اس مجلّہ کو بھی عمر دراز عطا فرمائے۔ آمین!

✦ پروفیسر سید مجاہد حسین حسینی۔ ممبئی

اس شمارہ ۳ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ معاف فرمائیے گا آپ آدمی ہیں یا جن؟ بخدا کیسے کیسے جواہر پاروں سے مزین کر دیا ہے اس خریطۂ علم و حکمت کو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ پہلی فرصت میں اپنی کوئی تخلیق حاضر کروں گا۔ (۲۳/اپریل ۲۰۰۴ء)

✦ طالب زیدی۔ میرٹھ

آپ کا جریدہ 'ادراک ۳' ملا۔ تمام مشمولات سنجیدہ، وقیع اور عصری تقاضوں کے آئینہ دار ہیں۔ فی زمانہ ایسے جریدے کم ہیں جو خالصتاً علم و ادب کی آبیاری کر رہے ہوں۔ 'گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے' اچھا سلسلہ ہے۔ اس طرح یادداشتیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

✦ حکیم سید غلام مہدی۔ نئی دہلی

'ادراک' ایک معیاری رسالہ ہے۔ ایسے رسالے آج کل اردو زبان میں کہاں شایع ہوتے ہیں۔ آپ کی ہمت کو آفریں ہے اور اس کے مسلسل جاری رہنے کی دعا۔

✦

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے

پروفیسر نثار احمد فاروقی
29 / جون 1936 — 28 / نومبر 2004

قطعۂ تاریخ وفات

پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم

نادم بلخی

اتار کر جو زندگی کا آج پیرہن چلا
جہاں سے کوچ کرگیا، پہن کے وہ کفن چلا

نثار احمد آہ اک بڑا محقق ادب
نہیں رہا نہیں رہا وہ دے کے اب محن چلا

تھی علم و فن کی سرپرست اُس کی زندگی بہت
ملول کرکے وہ فزوں سخنوروں کا من چلا

چمن کی دیکھ ریکھ کی جسے بہت ہی فکر تھی
اجل جب آئی پاس تو وہ چھوڑکر چمن چلا

رقم طراز جب ہوا بُری خبر یہ سن کے میں
تو سوگ ہی میں ڈوب کر قلم کا بانکپن چلا

یہ سالِ مرگ نے کہا کہ سن لے نادمِ حزیں
''جہانِ خُلد کی طرف محققِ سخن چلا''

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے

سنہ دو ہزار چار جاتے جاتے کئی اہم شخصیتوں کو ہم سے جدا کر گیا۔ وہاب دانش، پروفیسر محمد مطیع الرحمن، شاداں فاروقی، بی۔ ڈی۔ شیدا انبالوی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، عرفان صدیقی، اشفاق احمد، ملک راج آنند، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور علی جواد زیدی۔ ہم سے جدا ہو گئے۔ ہر ایک اپنے میدان میں نمایاں رہا ہے۔ ادارہ ان سب مرحومین کے لیے دعائے خیر و مغفرت اور پس ماندگان کے ساتھ اظہار غم و ہمدردی کرتا ہے۔

اردو، فارسی اور عربی کے استاد، محقق و مترجم اور میرؔ و غالب شناس پروفیسر نثار احمد فاروقی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔ ۲۷ نومبر ۲۰۰۴ کی شب میں دہلی کے ایک اسپتال میں وفات پائی۔ انھوں نے تینوں زبانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کی وفات سے سب زیادہ نقصان تصوف و عرفان کی پہنچا ہے کیونکہ وہ اس میدان میں تن تنہا کئی اہم کارنامے انجام دے چکے تھے اور کئی زیر تکمیل تھے۔ عصر حاضر میں وہ تصوف سے متعلق تمام تر تحقیقات کے منبع و مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ غالبیات، میریات، اقبالیات و مصحفیات وغیرہ اس کے علاوہ ہیں جن میں انھوں نے اساسی تحقیقی کام کیے۔ حکومت ہند کے عربی مجلے ''الثقافۃ الھند'' کے مدیر رہ چکے تھے۔ کئی اہم علمی اداروں کے رکن بھی تھے۔ رضا لائبریری رام پور کے لائبریری بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے اس لائبریری کو فعال بنانے میں سرگرم حصہ لیا۔ نئے اور پرانے لکھنے والوں سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ہر ایک علمی کام میں مدد کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے فارسی کی کئی اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین اور ترجمے کا کام بھی کیا۔ عربی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اردو اور فارسی زبان و ادبیات میں بھی علمی اور تحقیقی کام کرتے رہے۔ ان کی متعدد کتابیں اور مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ ادارہ ادراک اور راقم سطور سے انھیں گہرا تعلق تھا۔ علمی کاموں میں ہمیشہ رہنمائی کرنے کے ساتھ حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ غالباً ۹۲۔۹۳ء میں پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوٹل استقلال تہران میں ہوئی تھی جب وہ اور جناب مظفر حسین برنی صاحب، حکومت ایران کی دعوت پر ایران تشریف لے گئے تھے۔ مجھے ڈاکٹر عارف نوشاہی نے ان حضرات کی آمد کی اطلاع دی پھر ہم دونوں ان سے ملنے ہوٹل پہنچے۔ بڑے تپاک سے ملے اور یہ جان کر بے حد خوش ہوئے کہ میں مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات پر تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہا ہوں۔ بہت دیر تک آزاد بلگرامی کے بارے میں باتیں

کرتے رہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نیشنل میوزیم دہلی میں آزاد کی عربی تصنیف سبحۃ المرجان کا ایک قلمی نسخہ بخط مصنف موجود ہے۔ یہ بھی بتایا کہ آزاد کی فارسی تصنیف 'روضۃ الاولیا' کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے، جو رسالہ منادی دہلی (جلد ۶۷ شمارہ ۴۔۵، ۱۹۹۲ء) میں شایع ہوا ہے جسے انھوں نے ہندوستان پہنچ کر مجھے بھیجنے کا وعدہ کیا اور بھیج بھی دیا۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ اس کتاب کے پہلے بھی اردو ترجمے ہو چکے ہیں تو کہنے لگے مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ میں ترجمہ نہیں کرتا۔ وہ اُس وقت رضا لائبریری جرنل کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انھوں نے اس کے لیے ہم لوگوں سے مضامین کی فرمائش بھی کی۔ میں نے آزاد بلگرامی کے تذکرے 'خزانۂ عامرہ' پر بہت تفصیلی مضمون دیا جو جرنل کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ فاروقی صاحب نے آزاد بلگرامی کے عربی رسالے 'شفاء العلیل' کو بھی اڈٹ کر کے مجلہ ثقافت الھند دہلی (جلد ۳۵ شمارہ ۳/۴ و جلد ۳۶ شمارہ ۱/۲) میں شائع کیا۔ انھوں نے آزاد بلگرامی کے دو اردو اشعار بھی ایک بیاض سے جو سفر حج کے دوران آزاد بلگرامی کے ہمراہ تھی اور بعد میں مدتوں نواب صدیق حسن خاں کے پاس رہی، مجلہ منادی دہلی میں شائع کیے۔ آزاد بلگرامی سے منسوب اردو اشعار کے بارے میں ابھی تک قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ اشعار انھی کے ہیں یا کسی اور کے۔ لیکن ان کے نام سے ملنے کی وجہ سے محققین نے یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ آزاد بلگرامی بھی کبھی کبھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ لیکن خود آزاد بلگرامی نے اس سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں دیا ہے۔ البتہ ان کے شاگرد تمنا اورنگ آبادی نے تذکرہ گل عجایب میں آزاد کے دو اردو اشعار ضرور درج کیے ہیں۔ صاحب سخن شعرا اور صاحب خمخانۂ جاوید نے بھی آزاد کی ایک اردو غزل اپنے اپنے تذکروں میں درج کی ہے۔ جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد دوم میں نقل کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے مجھے ڈاک ٹکٹ کے برابر آزاد بلگرامی کی ایک تصویر بھی دکھائی تھی جس میں صرف چہرہ ہی تھا۔ یہ تصویر کہیں چھپی تھی جسے انھوں نے کاٹ کر رکھ لیا تھا۔

تہران کی ملاقات کے بعد میرا ان سے برابر رابطہ رہا۔ یہ رابطہ خط و کتابت کے ذریعہ ہی برقرار تھا۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں جب میں ہندوستان آیا اور ابھی دہلی ہی میں تھا کہ انھوں نے پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کے ذریعہ رام پور رضا لائبریری میں فارسی مخطوطات پر اپریل ۱۹۹۵ء میں ہونے والے نیشنل سمینار کا دعوت نامہ بھجوایا اور سمینار میں شرکت کرنے اور مقالہ پڑھنے کی تاکید کی۔ میں اپریل میں جب رام پور سمینار میں پہنچا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ جب تک کہیں مستقل ملازمت کا سلسلہ نہیں ہوتا تب تک رام پور رضا لائبریری کے فارسی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام کر دیجیے۔ میں راضی ہو گیا۔ کیونکہ یہ میرے دل کی بات تھی۔ الغرض میں دسمبر ۱۹۹۵ء کے آخری دنوں میں رام پور آ گیا اور فارسی مخطوطات کی فہرست

سازی کا کام شروع کردیا۔ لیکن ۱۹۹۶ء میں بہار یونیورسٹی سروس کمیشن پٹنہ کی سفارش پر میری تقرری لکچرر کی حیثیت سے ہوجانے کے بعد مجھے رام پور چھوڑنا پڑا۔ رام پور کے زمانۂ قیام کے دوران ان سے برابر ملاقات اور گفتگو کا موقع ملتا رہا۔ کبھی دہلی بھی جاتا تو ان سے بھی ضرور ملتا بلکہ بسا اوقات ان کے گھر پر قیام بھی کیا ہے۔ ہر قسم کے علمی معاملے میں وہ رہنمائی کرتے اور زندگی میں کامیابی کے حصول کے گر بتاتے۔ بے شمار اشعار اور واقعات انھیں یاد تھے۔ حسب حال کوئی واقعہ یا شعر ضرور سناتے۔ کبھی اپنی طرف سے ایسا مظاہرہ نہیں کرتے جس سے آدمی مرعوب ہوجائے بلکہ نہایت صاف دلی اور صاف گوئی سے کام لیتے۔ ان کی وجہ سے مجھے امروہہ بھی جانے کا موقع ملا۔ جب ان کی کتاب ''یقظۃ النائمین'' مع اردو ترجمہ چھپی تو انھوں نے کتاب دی اور جب ''قوام العقاید'' چھپی تب بھی اور جب ''روضۃ الاولیا'' رام پور سے کتابی صورت میں شائع ہوئی تو بھی کتاب دی۔

جب میں ڈالٹن گنج میں تھا تب بھی ان سے خط کے ذریعہ رابطہ رہا اور جب پچھلے سال میری تقرری بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ہوئی تب بھی ان کے خطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بنارس آجانے پر انھوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ اب آپ مین اسٹریم سے جڑ جائیں گے۔ لیکن ہر خط میں علمی کاموں کو سنجیدگی سے کرتے رہنے کی تاکید کرتے رہے اور یہ لکھتے رہے کہ آپ کی پہچان آپ کے علمی کاموں سے ہی ہوگی لہٰذا اس کی طرف سے غفلت نہ ہو۔ بنارس آنے کا بھی ذکر کیا تھا کہ کوئی سمینار وغیرہ کا ڈول ڈالیے تو بنارس آیا جائے۔ اب جبکہ یہاں شیخ علی حزیں لاہجی پر ایک بین الاقوامی سمینار کا ڈول ڈالا جاچکا ہے جس کے مندوبین میں ان کا اسم گرامی بھی شامل تھا اُن ہی دنوں بھائی فراست نے بتایا کہ فاروقی صاحب کا رات انتقال ہوگیا۔ خدا مغفرت فرمائے۔

بڑی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

فاروقی صاحب کے انتقال سے نہ صرف ایک اہم شخصیت سے ہم محروم ہوگئے بلکہ ایک باخبر اور عہد ساز شخصیت سے بھی محروم ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جنھیں ان کی ذات سے روحانی لگاؤ اور علمی ادبی تعلقات رہے ہوں گے۔ ان سب کو مرحوم کی ذات سے جو روشنی اور تقویت ملتی ہوگی، وہ اس سے محروم ہوگئے۔ ایسے تمام حضرات کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ان کے خانوادے کے لیے بھی یہی دعا کرسکتے ہیں کہ خدا انھیں صبر کی توفیق عطا فرمائے علم وادب کی جو خدمت فاروقی صاحب نے کی ہے وہ ہمیشہ اس راہ کے مسافروں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی رہے گی اور آنے والی نسلوں کو زبان وادب، تاریخ وتہذیب اور تصوف وعرفان کے نئے پہلوؤں اور گوشوں کی نقاب کشائی میں مددگار ثابت ہوگی۔

مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، باقر گنج، ضلع سیوان (بہار) سے شائع ہونے والا

علمی، ادبی، تحقیقی، تاریخی، تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی مجلّہ

مدیر اعزازی : ڈاکٹر سید حسن عباس

ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو کے علمی جرائد میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ علمی اور ادبی مراکز اور اداروں نیز باذوق قارئین سے اس کی توسیع میں تعاون کی درخواست ہے۔ اب تک اس کے تین اہم اور منفرد شمارے منظر عام پر آچکے ہیں جو مواد اور محتویات کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں اور طباعت واشاعت کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہیں۔ ادراک کا پہلا شمارہ ختم ہو چکا ہے جب کہ دوسرا اور تیسرا شمارہ جو بالترتیب ۲۰۸ اور ۳۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف ۴۰ اور ۵۰ روپے ہے، اسٹاک میں موجود ہے۔ جن حضرات کو یہ شمارے مطلوب ہوں درج ذیل پتے پر رقم ارسال کر کے منگوا سکتے ہیں۔ (محصول ڈاک علاحدہ)

رابطہ

ڈاکٹر نذر عباس

منیجر 'ادراک'، گوپال پور، باقر گنج

سیوان - ۸۴۱۲۸۶ (بہار)

فون نمبر: 06154-272331

IDRĀK 4
GOPALPUR
An Urdu Journal of Literary & Research Value
GOPALPUR, BAKARGANJ-841286 SIWAN
BIHAR (INDIA)
Hon. Editor : Dr. S. H. Abbas
Rs. 50/-